سید علی حسینی خامنہ ای

صہبا

سید علی حسینی خامنہ ای

رہبر معظم سید علی حسینی خامنہ ای

جدید اسلامی تفکر کے احیا گر

قرآن کریم میں اسلامی طرز تفکر کے بنیادی خدوخال

آیت اللہ سید علی حسینی خامنہ ای

ترتیب و تنظیم: مرکز صہبا

مترجمین: شہید سعید حیدر زیدی، سجاد حسین مہدوی، الفت حسین جویا

پروف ریڈنگ و تصحیح: سجاد حسین مہدوی، سید روح اللہ رضوی، عمار رضا مہدوی

ناشر: مرکز صہبا

طباعت: پہلی بار

جون۔۲۰۲۰

URDU.SAHBABOOKS.com

فہرست

نبوت ۱۵۳

ولایت ۲۶۱

مقدمہ

اسلام دینِ فطرت ہے اور اس میں انسان کے انفرادی اور اجتماعی تمام امور کے لیے صریح پیغام اور جامع دستور العمل موجود ہے۔ ایران میں انقلابِ اسلامی کی کامیابی کے بعد نوجوانوں کے اندر اس دین فطرت کی طلب بڑھی تو علمائے کرام نے دروس بھی دیئے اور دینی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ سب سے پہلے عقائد پر بات ہوئی۔ لیکن اکثر اوقات نوجوانوں کو یہ شکوہ کرتے پایا کہ یہ صرف ذہنی بحثیں ہیں، ان عقائد کا ہماری دنیا اور ہمارے عمل سے کیا تعلق ہے؟ اگر ایک آدمی باایمان ہو اور دوسرا ایمان نہ رکھتا ہو تو دونوں کے عمل میں کیا فرق ہوگا؟ کیا توحید یہی ہے کہ ہم ایک عقیدہ ذہن میں رکھ لیں کہ اللہ ایک ہے اور اسی نے اس دنیا کو خلق کیا ہے اور ہمیں اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرنی چاہیے؟ کیا نبوت یہی ہے کہ ہم مان لیں کہ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاؑ بھیجے، جن میں سے پہلے حضرت آدمؑ اور آخری حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور ان کا کام فقط اللہ کا پیغام پہنچانا تھا اور بس؟ کیا ولایت اسی کا نام ہے کہ ہم اہلبیتؑ سے محبت کا دَم بھرتے رہیں، زبان سے ان کی محبت کے دعوے کریں اور ان کے دشمنوں پر لعنت کریں اور پھر سب کچھ بھول بھال کر اپنی دنیا میں مگن ہو جائیں؟ کیا ان عقائد سے ہمارے اوپر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟

البتہ یہ سوالات صرف آج کا نوجوان نہیں کرتا، بلکہ انقلاب کے لیے جن نوجوانوں نے اپنی جانیں لڑائیں، قربانیاں دیں، مارے گئے، زخمی ہوئے، معذور ہوئے، جیلیں کاٹیں، قیدِ تنہائی میں رہے، شاہِ ایران کی ظالم انٹیلی جینس ایجنسیوں کی خوفناک اذیتیں سہیں، شہربدر ہوئے وغیرہ وغیرہ، یہ سوالات ان کے ذہنوں میں بھی تھے۔ اور جب انہیں ان سوالات کے جواب ملے تو وہ اپنی ذمہ داری سمجھ کر میدانِ عمل میں اتر آئے، جس کے نتیجے میں ۱۹۷۹ میں انقلابِ اسلامی کامیاب ہوا۔

ان سوالات کا جواب دینے کا بیڑا علما نے اٹھایا اور انقلاب سے چار سال پہلے مشہد میں آیت اللہ خامنہ ای نے مسجد امام حسنؑ میں اس موضوع کو ذہنی بحث کے بجائے قرآنی بحث میں ڈھال کر «قرآن کریم میں اسلامی طرزِ تفکر کے بنیادی خدوخال» کے عنوان سے ماہِ مبارک رمضان میں نماز ظہر و عصر کے بعد درس دینا شروع کیا۔ آپ پہلے سے اس درس کی تیاری کرتے، قرآنی آیات کا مطالعہ کرتے، موضوع کی مناسبت سے ان کا انتخاب کرتے، اس کی سائیکلواسٹائل کاپیاں بنوا کر حاضرین کو دیتے، اس میں موجود آیات کا مفہوم بیان کرتے اور آخر میں ایک قاری ان آیات کی تلاوت کرتا۔

ان دروس کی مقبولیت کا یہ عالَم تھا کہ مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہیں رہتی تھی، اور ہر طبقے کے لوگ اس میں شریک ہوتے تھے، حتی کہ میڈیکل یونیورسٹی کے طالب علموں نے بسیں بک کروائی ہوئی تھیں جن میں وہ آتے اور درس سننے کے بعد واپس جاتے تھے۔

ان دروس کی چند خصوصیات یہ تھیں کہ:

اسلامی طرزِ تفکر کے بنیادی خدوخال کو اس طرح جامع طور پر بیان کیا گیا کہ جس سے انسان کو اپنی «ذمہ داری کا احساس» ہو اور اس کے اندر «عمل کا جذبہ» سر اٹھائے۔

یہ دروس تمام مسلمانوں کے لیے پیغام کے حامل تھے اور اس میں کسی قسم کا کوئی تعصب نہیں برتا گیا۔

اسلام کے بنیادی عقائد پر ایک نئے انداز سے نظر ڈالی گئی اور اسے خشک اور ذہنی بحثوں سے نکال کر عملی میدان میں اس کے اثرات پر بات کی گئی۔

ان مباحث میں ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیاسی اور سماجی جدوجہد کو قرآنی مفاہیم پر منطبق کیا گیا۔

مسلمانوں کے اصل درد یعنی ایمان کی کمزوری کو سامنے لایا گیا۔ ان دروس میں آیت اللہ خامنہ ای نے قرآنی آیات کے ذریعے ثابت کیا کہ اگر ایمان کو درست طور پر سمجھا جائے تو مسلمانوں کے عقائد

میں نئی روح پیدا ہو جائے گی اور عقائد عملی زندگی کے میدان میں اتر جائیں گے۔ جس کے نتیجے میں ایمان، انسان ساز اور معاشرہ ساز بن جائے گا۔

ان دروس میں آپ کی کوشش رہی کہ قاری کو قرآنی آیات پر غور کرنے پر مجبور کریں اور بتائیں کہ کس طرح سے ان آیات سے ہماری زندگی میں تبدیلی آسکتی ہے۔

بعد میں ان دروس کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔

* * *

اردو زبان میں سب سے پہلے اس کتاب کے ایک حصے «ولایت» کا ترجمہ شہیدِ سعید «سید سعید حیدر زیدی» نے کر کے اپنے ادارے دارالثقلین کے تحت شائع کیا جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ کئی سال بعد اس کتاب کے بقیہ حصوں کا بھی ترجمہ ہوا جسے دارالثقلین نے ہی الگ الگ کتابوں کی صورت میں ایمان، توحید اور نبوت کے نام سے شائع کیا۔ اب اس پوری کتاب کو صہبا پبلی کیشنز کی جانب سے پیش کیا جارہا ہے، تاکہ پوری دنیا میں اردو پڑھنے والے اس سے مستفید ہو سکیں اور قرآنی معارف کے متلاشی اذہان اس بہتے سرچشمے سے سیراب ہو سکیں۔

امید ہے کہ قارئین کو یہ مباحث نئی راہیں دکھائیں گے اور عقائد کو عملی میدان میں لانے کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔

پہلا باب

ایمان

پہلی نشست

۲ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری

ایمان (۱)

۱۹-۰۹-۱۹۷۴

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

﴿وَأَطِيعُوا اللهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۞ وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ۞ الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (سورہ آل عمران/ ۱۳۲-۱۳۴)

﴿وَأَطِيعُوا اللهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، شاید اللہ کی رحمت تمہارے شاملِ حال ہو۔ ہاں اللہ کی اطاعت ہو یا پیغمبرؐ کی ان میں کوئی فرق نہیں، یہ کس وجہ سے فرمایا کہ اللہ کی اطاعت کریں اور پیغمبرؐ کی اطاعت کریں؟ دونوں کا ایک جگہ اکٹھا ذکر کرنا، اضافی تو نہیں؟ ہرگز نہیں۔ اگر قرآن فقط کہتا: ﴿أَطِيعُوا اللهَ﴾ اللہ کی اطاعت کرو اور پیغمبرؐ کو مصداق اور نمونہ کے طور پر ذکر نہ کرتا اور پیغمبرؐ کی اطاعت کا تذکرہ نہ کرتا تو وہ لوگ جو پیغمبرؐ کے مقابلے میں اپنے آپ کو لے آتے ہیں، ممکن ہے اس بات کا دعویٰ کرتے کہ ہم خدا کی اطاعت کررہے ہیں، اس لیے کہ دعوے کا میدان بہت وسیع ہے، ہر کوئی دین و ایمان اور تقویٰ کا علی الاعلان دعویٰ کرسکتا ہے۔ ہر کوئی خدا کا بندہ اور اس کے مطیع ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

پیغمبر خداؐ کے زمانے میں خود پیغمبرؐ بھی خدا کی بندگی اور اس کی اطاعت کے دعوے دار تھے اور جنگوں میں ان کے مقابلے میں آنے والے، عیسائیوں کے پادری اور یہودیوں کے علما بھی یہی کہتے تھے۔ بلکہ قرآن کریم کے مطابق ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللهِ﴾[۱]، پیغمبرؐ سے بھی بالاتر، پیغمبرؐ تو کہتے

۱. سورہ مبارکہ مائدہ: آیت ۱۸

تھے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، لیکن وہ کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں۔ اللہ کے بعض نافرمان اظہار کرتے ہیں کہ وہ مطیعِ خدا ہیں، جب خلوت میں جاتے ہیں تو اس بات کا احساس کرتے ہیں کہ ان کا کارنامہ کتنا سیاہ ہے؛ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں سراپا جھوٹ ہے، لیکن لوگوں میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خدا کے بہترین مطیع اور عبادت گزار بندے ہیں۔ ان لوگوں کو اللہ کے حقیقی بندوں سے جدا ہونا چاہیے، ضروری ہے کہ ان کو واضح کیا جائے۔ اسی لیے خداوندمتعال یہاں پر مومنین کے لیے اطاعت کے ضروری ہونے کو اس طرح بیان فرما رہا ہے: ﴿وَأَطِيعُوا اللهَ وَالرَّسُولَ﴾ اللہ اور پیغمبرؐ کی اطاعت کرو۔ اگر اللہ؛ پیغمبرؐ کی اطاعت کا نہ کہتا تو پیغمبرؐ کے دشمن بھی کہتے کہ ہم اللہ کے اطاعت گزار ہیں، لہٰذا یہ ضرور واضح ہونا چاہیے کہ اطاعتِ خدا کا کیا مطلب ہے؟ وہ لوگ جو خود کو خدا کا بندہ کہلاتے ہیں لیکن قوانین و فرمانِ خدا کے بندے نہیں ہیں، قانون پر عمل نہیں کرتے ہیں، اس کی بندگی کے تقاضوں کے پابند نہیں ہیں، وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہم خدا کے بندے ہیں؟ ﴿وَأَطِيعُوا اللهَ وَالرَّسُولَ﴾ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، ﴿لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ شاید اللہ کی رحمت تمہارے شاملِ حال ہو۔ اللہ کی رحمت یعنی کیا؟ اللہ کی رحمت کے شاملِ حال ہونے سے کیا مراد؟ یہاں پر ہم قرآن اور اپنی عامیانہ سوچ کا موازنہ کریں؟ ہم اللہ کی رحمت کو کس مقام کے لیے مانتے ہیں؟ اس مقام کے لیے جہاں ہم نے عمل نہیں کیا، اس صورت میں کہ ہم نے نافرمانی کی، اس حالت میں کہ اللہ کی حدود کو پامال کیا، الٰہی ذمہ داریوں اور اس کے عہد و پیمان کا خیال نہیں کیا؛ اسی ایک صورت میں ہم کہتے ہیں کہ ہم تو عمل نہیں کرتے، لیکن خدا ہم پر رحم کرے، اللہ کی رحمت ہو، پروردگار کی رحمت کو عمل کرنے کا رقیب اور عمل کرنے کا متبادل قرار دیتے ہیں، قرآن کی آیت اس کے برعکس ہے، یعنی عمل کرو، اطاعت کرو، شاید اللہ کی رحمت تمہارے شاملِ حال ہو، رحمتِ خدا اس وقت ہے کہ جب ایک ملت اپنی ذمہ داریوں پر عمل کرے۔ اللہ اس وقت لوگوں پر رحم کرتا ہے جب وہ اس کی اطاعت کریں۔ اپنے واجبات کو انجام دیں۔ ستّر کروڑ مسلمان اس انتظار میں بیٹھے رہیں کہ پروردگار کی رحمت ان کے سروں پر برسے اور وہ راستے کھلے چھوڑ دیں کہ عزت و ناموس کے چور اور دین تباہ کرنے والے آئیں اور تمام چیزوں کو لوٹ کے لے جائیں اور وہ اللہ کی رحمت کی امید میں بیٹھے رہیں؟ پس ان کو کہیں کہ ابھی بیٹھے رہیں! خدا فرماتا ہے: ﴿وَأَطِيعُوا اللهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو،

شاید اللہ کی رحمت تمہارے شاملِ حال ہو۔ یعنی کیا کہ اللہ کی اطاعت کریں؟ اطاعت الٰہی کیا ہے؟ یہ کہ تمام احکاماتِ شرعیہ اور الٰہی فرامین کو اپنے کندھوں پر اٹھائیں؛ جن چیزوں کو ادا کرنا ہماری ذمہ داری قرار دیا گیاہے، ان کو انجام دیں۔ قرآن کریم کی آیت کے بقول خدا فرماتا ہے: مومنین وہ ہیں کہ جب ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا ہے تو اے پیغمبرؐ! وہ آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور جب آپ فیصلہ کرتے ہیں، ﴿ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ﴾[1] جو بھی آپ فیصلہ کریں، ان کی روح اور ان کے دل میں تھوڑی سی بھی کدورت کا غبار نہیں بیٹھتا۔ ﴿وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ آپ کے فرمان کے مقابلے میں سرِ تسلیم خم کرتے ہیں حقیقی مومن یہ ہوتا ہے۔ اگر اس طرح ہو کہ ایک ملت، ایک گروہ خود کو خدا کے اس حکم کے ماتحت قرار دے تو خدا کی بے پایاں رحمت بھی اس کے شاملِ حال ہوگی۔ اس وقت ایک امت بلندیوں تک جا پہنچتی ہے، اس وقت ایک ملت انسانی کمال تک پہنچتی ہے، اس وقت قید اور غلامی کی زنجیریں اس کے ہاتھ اور پاؤں سے کھل جاتی ہیں۔ اس وقت اللہ کی رحمت اس کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ ﴿وَأَطِيعُوا اللهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، شاید اللہ کی رحمت تمہارے شاملِ حال ہو۔

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ مقابلے کا میدان ہے، آگے بڑھیں اور ایک دوسرے سے سبقت لے جائیں، ﴿إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ﴾ بخشش اور مغفرت کی طرف، ﴿مِن رَّبِّكُمْ﴾ اپنے پروردگار کی طرف سے۔ ﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ﴾ اور ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے، ﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ جو باتقویٰ لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اے وہ انسان جو زیادہ سے زیادہ مادّی مقاصد کے حصول کے سلسلے میں مقابلے کے لیے تیار اور حاضر رہتا ہے، جلدی کرتا ہے اور دوسروں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے، اگرچہ شرافتوں اور فضیلتوں کو پامال کرنا پڑے (کرتا ہے)، اے انسان! تم سے یہ نہیں کہتے کہ جلدی نہ کرو، تم سے نہیں کہتے کہ گھر میں جا کر سو جاؤ، اپنی توانائیوں کو کسی کام میں استعمال نہ کرو، جو تم سے دین کے نام پر ایسا کہتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے، اوروہ نہیں جانتا، دین یہ نہیں کہتا کہ اپنی توانائیوں کو بروئے کار نہ لاؤ، دین کہتا ہے ترقی کرو، جتنا زیادہ ہوسکتا ہے مقابلہ کرو، جتنا زیادہ ہو سکتا ہے تیز چلو، لیکن کس طرف؟ اس طرف جو تمہارے

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۶۵

شایانِ شان ہے، نہ کہ ایک مشت خاک کی طرف، نہ کہ ناچیز مال و دولت کی طرف، نہ کہ دنیا کی مادی زندگی کی طرف، جو کہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو تمہارے لیے چھوٹی اور حقیر ہے۔ اے عظیم انسان! اس چیز کی طرف جلدی کرو جو تمہاری عظمت اور مقام کے ساتھ ساز گار ہو۔ اس لیے کہ انسان دنیا کے موجودات میں سب سے عظیم ہے (پروردگارِ عالَم کے بعد وجود کی بزرگ‌ترین عظمتیں اسی چھوٹے اور محدود جسم کے اندر پائی جاتی ہیں) اے عظیم انسان! جلدی کرو، مقابلہ کرو، تیز چلو لیکن کس طرف؟ ﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ﴾ تمہاری تیزی اور جلدی پروردگار کی مغفرت کی طرف ہو۔ اللہ کی اس بہشت بریں کی طرف ہو جس کے سامنے تمام آسمان و زمین چھوٹے، کم اور ناچیز ہیں، یعنی کیا؟ قرآنی تعبیرات میں غور کریں تاکہ بہتر انداز میں سمجھ سکیں۔ قرآن فرماتا ہے: اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمت کریں تو آپ کے لیے زمین و آسمان کم اور ناچیز ہیں، ان سے بالاتر چیزوں کی ہمت کریں، اے عظیم انسان! تمہارے لیے پروردگار کی مغفرت بہت اہم ہے، تمام چیزوں سے بالاتر مغفرتِ الٰہی ہے، وہ مغفرت جس کی عظمت زمین و آسمان سے بلند و بالا تر ہے۔

مغفرت سے مراد کیا ہے؟ کسی کو کہتے ہیں جناب معذرت چاہتا ہوں، آپ کو ایک گالی دی ہے، مجھے معاف کر دیں۔ وہ بھی بڑے ناز اور تکبر کے ساتھ یا خوش اخلاقی کے ساتھ مہربانی کرتے ہوئے، جیسے بھی ہو، کہے ٹھیک ہے میں نے معاف کیا۔ اس طرح کی معافی کو ہم نے دیکھا، خیال کیا کہ اللہ کی مغفرت بھی انہی معافیوں کی مانند ہے۔ فلاں شخص نے ظلم کیا، ستم کیا، زمین پر فساد برپا کیا، عذابِ الٰہی کا مستحق ٹھہرا، قیامت کے دن آنسو بہائے اور توسل کیا، خدا بھی کہے گا کہ چلو ٹھیک ہے، میں نے معاف کیا۔ کیا مغفرتِ خدا یہی ہے؟ ﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ﴾ یہی ہے؟ نہیں۔ (ایسا نہیں ہے)

مغفرت یعنی زخم کا ٹھیک ہونا اور خلا کو پُر کرنا۔ آپ کے بدن میں کوئی زخم لگ جاتا ہے، ران میں، بازو میں، ایک گہرا زخم آ جاتا ہے، گوشت پھٹ جاتا ہے؛ یہاں آپ کو ایک مرہم دیتے ہیں، وٹامن استعمال کرواتے ہیں، ٹیکہ لگواتے ہیں، تب جا کے اس کے اوپر گوشت آتا ہے، تب جا کے آخر کار وہ زخم اپنی ہی جنس سے، بدن کے گوشت سے، اسی بدن کے پٹھوں سے، گوشت وجود میں لے کر آتا ہے، آپ کا جسمانی نظام کام کرتا ہے، یہ زخم بھر جاتا ہے اور ٹھیک ہو جاتا ہے، یہ زخم کے بھر جانے اور ٹھیک ہونے کو پیشِ نظر رکھیں، تاکہ اسے تشبیہ دوں مغفرت کے ساتھ اور مغفرت الٰہی کی مثال

پیش کروں؛ دیکھیں کہ مغفرت کیسے ہوتی ہے؟

مقامِ تمثیل میں اگر آپ کی روح جسم کی مانند ہو تو ہر گناہ جو انجام دیتے ہیں، روح پر ضربیں وارد کرتا ہے، اور اسے زخمی کر دیتاہے، کیسے جناب؟ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ گناہ روح پر ضربیں لگاتا ہے؟ اس لیے کہ روح کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر بلندی اور کمال پیدا کرے اور گناہ وہ چیز ہے جو روح کو کمال اور بلندی تک پہنچنے سے روکتی ہے اس کے لیے تشبیہ اور مثال بن سکتی ہے، یہی زخم لگانا،یہی روح میں شگاف پیدا کرنا، یہی گناہ جو انجام پایا، اس کی روح زخمی ہو گئی، ناقص ہوگئی، وہ اس کمال سے جو آرزوؤں کی انتہا ہے دور چلا گیا۔ اس گناہ کی اب مغفرت ہونا ضروری ہے۔

مغفرت سے کیا مراد ہے؟ مغفرت یعنی یہ خلا، یہ روح کی بیماری، یہ بہتا اور رستا زخم، یہ نقص جو اس کی جان میں پیدا ہو گیا ہے، برطرف ہوجائے، اسی کو کہتے ہیں «مغفرت»۔ وہ نقص جو روح میں گناہ کی وجہ سے وجود میں آیا ہے کس طرح برطرف ہو سکتا ہے؟ اس کا ازالہ کرنے سے۔ جس نے گناہ کے ذریعے اپنی جان کو اوجِ انسانیت، کمال اور انسانی پرواز کی بلندی سے پستی کی طرف دھکیل دیا اور دور پھینک دیا، اس وقت اس پسماندگی کا ازالہ کر سکتا ہے جب اسے بلندی کی طرف لے جائے۔

خداوند متعال نہیں کہتا کہ چونکہ تم نے گناہ کیا ہے، اب جو بھی نیک کام انجام دو گے، ہم کسی بھی صورت میں اس گناہ کو ختم نہیں کریں گے۔ خدا ہٹ دھرم نہیں ہے، ﴿وَإِنِّي لَغَفَّارٌ﴾[۱] ہم حاضر ہیں ان کی غلطیوں سے چشم پوشی کریں اور معاف کر دیں، اس صورت میں کہ (ان گناہوں کا) ازالہ ہو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ چونکہ آپ نے ایک دن غلطی کی ہے، لہٰذا اب اگر اس سے سو گنا زیادہ محنت و مشقت بھی کی تب بھی آپ کی اس محنت و مشقت کا اس غلطی کی وجہ سے کوئی فائدہ نہیں، نہیں ایسا نہیں ہے۔ ﴿وَإِنِّي لَغَفَّارٌ﴾ ہم بخشنے والے ہیں، ہم خلا کو پر کرتے ہیں، زخم کو ٹھیک کرتے ہیں، لیکن کس شخص کے؟ ﴿لِمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ﴾[۲] اس کے جو توبہ کرے، یعنی کیا مطلب؟ یعنی واپس پلٹے، کمال کا راستہ یہیں سے تھا، آپ کے لیے ضروری تھا کہ اس طرف جاتے، ہم حاضر ہیں آپ کو بخش دیں اور گناہوں کو معاف کر دیں، کب؟ جب آپ کمال کی طرف جائیں، دوبارہ صحیح راستے کی

---

۱. سورہ مبارکہ طہٰ: آیت ۸۲

۲. اور یقینی بات ہے کہ میں اس شخص کو حتمًا بخش دوں گا جو توبہ کرے، ایمان لے آئے اور نیک اعمال انجام دے اور ہدایت حاصل کرے

طرف پلٹیں۔ ﴿لِمَن تَابَ﴾ جو توبہ کرے، یعنی واپس پلٹے، توبہ یعنی واپس پلٹنا، اپنے ایمان کو مزید مستحکم کرے، نیک عمل کرے، عمل سے غافل نہ ہو اور محض زبانی جمع خرچ کی حد تک نہ رہے۔

بنابرایں مغفرت یعنی ان خلاؤں کو پُر کرنا جو انسان کی روح کے زخم ہیں، ان کے پُر کرنے سے انسان کمال تک پہنچ جاتا ہے، بہتر یہی ہے کہ انسان اس راہ میں کوشش کرے، جلدی کرے، مقابلہ کرے۔ مغفرت بہت ضروری ہے، مغفرت یہ نہیں کہ خداوند متعال اپنی طرف سے کسی کے ساتھ بے جا بے حساب مہربانی کرے، حالانکہ اس نے لطفِ الٰہی کی راہ میں کوئی کوشش بھی نہ کی ہو ﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾۔ جلدی کریں اپنے رب کی مغفرت کی طرف ﴿وَجَنَّةٍ﴾ اور بہشت کی طرف، ﴿عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ﴾ جس کی وسعت آسمانوں اور زمین جتنی ہے۔ ﴿أُعِدَّتْ﴾ آمادہ کی گئی ہے ﴿لِلْمُتَّقِينَ﴾ متقی لوگوں کے لیے۔

باتقویٰ کون ہے؟ متقی کون ہے؟ ﴿الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ﴾ وہ لوگ ہیں جو خوشی اور غم میں (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ متقی ہونے کی ایک شرط ہے: انفاق کرنا، (انفاق اور خرچ کرنے میں فرق ہے، خرچ کرنا یعنی یہ کہ انسان کچھ رقم خرچ کرے) لیکن ہر خرچ کرنے کو انفاق نہیں کہتے بلکہ انفاق اس خرچ کو کہتے ہیں جو ایک خلا کو پُر کرے، ایک حقیقی ضرورت مند کی مشکل کو حل کرے۔ جس ملت کو آج ایک چیز کی ایسے ضرورت ہو جیسے آب و ہوا، اگر اس کے علاوہ دوسری چیزوں کے ذریعے اس ملت کی مدد کی، تو یہ انفاق نہیں، بلکہ رقم کو حرام کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا انفاق سب کا کام نہیں، انفاق عقلمند اور باہوش لوگوں کا کام ہے۔ وہ لوگ جو خلاؤں اور لوگوں کی ضروریات کو جانتے ہیں اور تیار رہتے ہیں کہ ان خلاؤں اور ضرورتوں کو پُر کریں۔ انفاق بہت ضروری ہے۔ باتقویٰ لوگوں کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہی ہے، خوشی اور غمی کی حالت میں انفاق کرتے ہیں۔

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾ اور غصے کو پی جاتے ہیں، غصے کو پی جانا یعنی کیا؟ یعنی جذبات و احساسات کی بنا پر کام نہیں کرتے، ہر جگہ عقل سے کام لیتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات عقل، صحیح غصے کے ساتھ بھی ہوتی ہے، آپ نے نہیں دیکھا قرآن کہتا ہے: ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾[1]

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾ کا معنی یہ نہیں کہ آپ خیال کریں کہ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ ایک ملت کا غیظ و

---

۱. سورہ مبارکہ فتح: آیت ۲۹

غضب، ایک انسان کا غیظ و غضب، ایک معاشرے کا غیظ و غضب، ان لوگوں کے خلاف ختم اور نیست و نابود ہوجائے کہ جن پر غیظ و غضب کیا جانا چاہیے، نہیں قرآن بھی یہ نہیں کہتا کہ اس قسم کے غصے کو پی جاؤ، بلکہ کہتا ہے کہ غصے کی بنا پر یہ کام انجام نہ دو۔﴿وَالْکَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾، غصے کو پی جانے والے، نہ کہ فراموش کرنے والے، غیظ و غضب کو پی جانے والے، جب غصہ کم ہوگا تو انسان عقل و ادراک سے وہ کام انجام دے گا جو اس کے لائق ہے۔ ﴿وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾لوگوں سے درگزر کرنے والے، لوگوں کی خطاؤں سے عفو و درگزر کرنے والے، لوگوں کی غلطیوں سے درگزر کرنے والے، لوگوں کے گناہوں سے درگزر کرنے والے، لوگوں کی لغزشوں سے درگزر کرنا ضروری ہے۔ ضروری ہے کہ درگذر کیا جائے، جو لغزش نہیں ہے اس سے درگذر نہیں کیا جا سکتا۔ خدا بھی اس قسم کے گناہ سے درگذر اور صرفِ نظر نہ کرے گا۔ اس غلط عمل سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے جو جان بوجھ کر اور دشمنی کی بنا پر انجام دیا جائے۔ البتہ وہ لغزشیں اور خطائیں قابلِ معافی ہیں جو عام لوگوں کے کاموں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ﴿وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ اور خدا احسان کرنے والے لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

متقی لوگوں کی دوسری کون سی نشانیاں ہیں؟ ﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ﴾[1] وہ لوگ کہ جب وہ گناہان کبیرہ انجام دیتے ہیں، یا اپنے اوپر ستم کرتے ہیں۔ ﴿ذَكَرُوا اللهَ﴾ تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ غفلت کی وادی میں، غفلت کے سائے میں زیادہ دیر تک نہیں رہتے۔

﴿ذَكَرُوا اللهَ﴾ جب غلط کام کریں یا اپنے اوپر ظلم کریں تو خدا کو یاد کرتے ہیں، پس اپنے گناہوں کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں۔ اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ یہ گناہ، یہ خلا یہ زخم ٹھیک ہوجائے، لیکن یہ بھی پروردگار کی مدد کے بغیر ممکن نہیں، ﴿وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللهُ﴾اور خدا کے علاوہ گناہوں کو کون بخش سکتا ہے؟

کوشش اور حرکت تمہاری طرف سے برکت خدا کی جانب سے، سعی و کوشش ہماری طرف سے، قبولیت ہمارے خدا کی طرف سے، پس ہم حق نہیں رکھتے کہ سعی و کوشش کو اپنے پروگرام سے حذف کردیں۔

---

۱. سورہ مبارکہ آل عمران: آیات ۱۳۵ سے ۱۳۶

﴿وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ جن کاموں کو جانتے ہیں کہ گناہ ہیں ان پر اصرار نہ کریں۔ ﴿أُولَـٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ﴾ یہی لوگ جو کوشش میں لگے رہتے ہیں، گناہوں کے لیے استغفار کرتے ہیں، خطاؤں اور غلط کاموں پر اصرار بھی نہیں کرتے، ان جیسے لوگوں کی جزا اپنے پروردگار کی طرف سے مغفرت ہے۔ ﴿وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (ان کے لیے) باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ ﴿خَالِدِينَ فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ﴾ ان میں ہمیشہ رہیں گے، نیک عمل کرنے والوں کے لیے کیسی اچھی جزا ہے۔ پھر یہاں پر خدا کہتا ہے کہ عمل کرنے والوں کے لیے پاداش ہے۔ ﴿أَجْرُ الْعَامِلِينَ﴾ عمل کا مسئلہ اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے۔

ایمان (۲)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۞ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۞ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ (سورہ انفال/۲-۴)

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنفَالِ﴾[۱] اے پیغمبرؐ! انفال کے بارے میں آپ سے سوال کرتے ہیں کہ انفال کس لیے ہے اور کس کا حق ہے؟ انفال کا مختصر طور پر یہ ترجمہ ہو سکتا ہے: انفال یعنی ایسا مال جو تمام مسلمانوں سے متعلق ہے۔ مثلاً اس کا ایک نمونہ، وہ مالِ غنیمت ہے جو جنگ میں مسلمانوں کو حاصل ہوتا ہے۔ پہلی مرتبہ یہ مسئلہ مسلمانوں کو جنگِ بدر میں پیش آیا۔ مسلمان ایک دوسرے سے بحث کرتے تھے کہ یہ مالِ غنیمت کس کا حق ہے؟ ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوا، پیغمبر اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ سے سوال کیا گیا، قرآن کی آیت جواب کی صورت میں پیغمبر اکرمؐ کو الہام ہوئی: ﴿قُلِ الْأَنفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ﴾ انفال خدا اور پیغمبر سے متعلق ہے؟ خدا سے متعلق کا کیا مقصد ہے؟ یعنی بندگانِ خدا میں سے کچھ خاص لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ جو بھی خدا کا مال ہے، جہاں بھی جس چیز پر بھی مالِ خدا کا نام صادق آتا ہے وہ درحقیقت ایسی چیز ہے کہ جس کا الٰہی اہداف و مقاصد میں خرچ ہونا ضروری ہے۔ ﴿وَالرَّسُولِ﴾، یعنی رسول کا مال ہے، یعنی کیا مقصد؟ کیا رسول اللہؐ خدا کے مقابلے میں ایک الگ مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں؟ نہیں۔ ممکن ہے ہر کوئی اپنے آپ کو حق دے کہ وہ خدا کے مال میں تصرف

۱. سورہ مبارکہ انفال: آیت ۱

کر سکتا ہے۔ ممکن ہے سب کہیں کہ یہ خدا کا مال ہے، ہم بھی تو خدا کے بندے ہیں اور اس پُرکشش عنوان سے کہ یہ خدا کا مال ہے اور ہم بھی خدا کے بندے ہیں، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس عمومی مال کو اپنے ذاتی استعمال میں لے آئیں، اس طرح کی چیز ممکن ہے۔ بنابرایں اگرچہ مالِ خدا کو تمام مسلمانوں اور خدا کے حقیقی بندوں کی بھلائی کے لیے ان تک پہنچنا ضروری ہے، لیکن تمام لوگوں کی بھلائی کے لیے ان تک پہنچانے کا مطلب یہ نہیں کہ جیسے جس کا دل چاہے استعمال کرے، بلکہ ضروری ہے کہ اس کا ایک مرکز ہو، اللہ کی طرف سے ایک طاقتور اور بااختیار نمائندہ ہو جو لوگوں کے تمام معاملات کا والی و سرپرست ہو۔ وہ کون ہے؟ وہ رسولؐ ہیں۔یہاں پر رسول، رسالت اور نبوت کے طور پر بیان نہیں ہوا، بلکہ حکومتِ الٰہی کی صورت میں بیان ہوا ہے۔ یعنی جب رسول اس دنیا سے چلے جائیں، تو امام انفال کا ذمہ دار ہے۔ امام یعنی حاکمِ الٰہی، امامِ معصوم اگر کسی زمانے میں لوگوں پر حکومت نہیں کررہے ہوتے تو جو شخصیت اللہ کی طرف سے لوگوں پر حکومت کرنے کا حق رکھتی ہے، وہ انفال اور عام مال کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

بہر حال، اگرچہ یہ مال عمومی ہے، یعنی معدنی ذخائر ، جنگلات، دشت و صحرا ، چراگاہوں کا تعلق سب سے ہے، مالِ غنیمت جو دشمنوں سے حاصل ہوتا ہے، سب کے لیے ہے، مال غنیمت کے طور پر حاصل ہونے والی بادشاہوں کی خاص اور قیمتی اشیاء سب کے لیے ہیں، اور جو موارد انفال کے لیے مصداق قرار دیئے گئے ہیں، اگرچہ سب کے لیے ہیں، لیکن اللہ کے ایک قدرت مند نمائندے کے اختیار میں ہونے چاہیے ہیں، وہی قدرت مند شخص حاکمِ اسلامی ہے، وہ کون ہے؟پیغمبر گرامی قدر کے زمانے میں خود رسول اللہ ﷺ اور ان کے بعد معصوم امام ہیں، اگر امامِ معصوم نہ ہوں تو الٰہی عادل امام، وہ جس کے ہاتھ میں اسلامی حکومت کی باگ ڈور ہونی چاہیے ، وہ انفال کے امور کا سرپرست ہے، یہ آیت کا پہلا حصہ ہے، البتہ ہماری گفتگو کا تعلق آیت کے پہلے حصے سے نہیں تھا۔

انفال کے مصرف کو متعین کرنے کے بعد خداوند متعال فرماتا ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾. اگر آپ مومن ہیں تو ان تین کاموں کو انجام دیں: پہلا تقوائے الٰہی کو اختیار کریں، ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ یعنی خدا سے ڈریں، ﴿وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾ اپنے درمیان، آپس میں صلح و صفائی سے کام لیں، اختلافات کو اپنے درمیان سے نکال دیں، جو لوگ غیر حقیقی گفتگو کرتے ہیں،

حق کی حمایت میں ان سے ہاتھ اٹھا لیں۔ اپنے درمیان سے اختلافات کو ختم کر دیں۔ ﴿وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾ اپنے درمیان صلح و صفائی سے کام لیں۔
یہ دو بڑے تاکیدی حکم تھے، تیسرا حکم ایک کلی مطلب ہے اور تمام نیک کاموں کی بجا آوری اور برے کاموں سے اجتناب سے متعلق ہے: ﴿وَأَطِيعُوا اللهَ وَرَسُولَهُ﴾ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔ ﴿إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ اگر آپ مومن ہیں۔
ایمان جو کہ قلبی جھکاؤ اور ایک مطلب، ایک شخص یا ایک مرکز کے ساتھ فکری، اعتقادی اور نفسیاتی وابستگی کا نام ہے، اسے فقط اس بات میں خلاصہ نہیں کیا جاسکتا کہ انسان صرف دل میں یہ جھکاؤ اور وابستگی رکھے، ایمان صحیح معنوں میں اس وقت وجود رکھتا ہے جب انسان اس پر عمل کرے، اس وقت ایک شخص اپنے حقیقی مومن ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے جب ایمان کے تقاضوں اور ایمان کے عہد و پیمان کا پابند ہو۔ ایک شخص اس وقت کہہ سکتا ہے میں خدا پر ایمان اور اعتقاد رکھتا ہوں کہ جب اس کی زندگی اور اس کے وجود کی کتاب کا متن، منکرِ خدا کی زندگی سے فرق رکھتا ہو، قرآن کی آیت یہاں پر صراحت کے ساتھ بیان کررہی ہے، یہاں پر عقلی حساب و کتاب نہیں کہ شک و شبہ پیدا ہو اور دلائل دینے پڑیں، بلکہ ضروری ہے کہ ان کاموں کو انجام دیں، اگر مومن ہیں۔ انہی کاموں میں سے ایک، ﴿وَأَطِيعُوا اللهَ وَرَسُولَهُ﴾ ہے ۔ خدا و پیغمبر کی اطاعت کریں، انہی کے حکم کو بجالائیں۔
حکمِ خدا کیا ہے؟ جو بھی ہے، واضح ہے کہ خدا نے لوگوں کے مال میں، لوگوں کی جان میں، لوگوں کی زندگی میں، انسان کے ایک دوسرے سے رابطے میں، انسان کے خدا کے ساتھ روابط میں، انسان کے حیوانات کے ساتھ رابطے میں، حتیٰ کہ نباتات کے ساتھ رابطے میں کچھ عہد و پیمان، ذمہ داریاں، واجبات اور وظائف معین کیے ہیں، اگر ان امور میں خدا کی اطاعت کی تو اپنے آپ کو مومن کہہ سکتے ہیں، ورنہ اگر انسان کا دل ایک مرکز سے وابستہ تو ہو لیکن اس وابستگی کی شعاعیں عمل میں، ہاتھ میں، پاؤں میں، دیگر اعضاء و جوارح میں منعکس نہ ہوں تو ایسے ایمان کا کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ بنیادی طور پر اسلام کی نظر میں ایمان کا نام اس پر صادق ہی نہیں آتا۔ یہ قرآن کی منطق ہے، ﴿فَاتَّقُوا اللهَ﴾ پس خدا (کی نافرمانی) سے ڈرو۔ ﴿وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾ اپنے درمیان میں صلح و صفائی سے کام لو۔ ﴿وَأَطِيعُوا اللهَ وَرَسُولَهُ﴾ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، ﴿إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾ اگر

تم مومن ہو۔

اس آیت کے آخر میں مومنین کا نام آنے کی مناسبت سے خداوند متعال اس کے بعد والی آیت میں مومنین کی صفات اور ان کی شرائط کو بیان فرما رہا ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۞ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۞أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾[۱]؛ یہاں پر حقیقی مومن کے لیے پانچ صفات معین کی گئی ہیں۔ ممکن ہے یہ پانچ صفات بولنے اور سننے والے کے اندر نہ پائی جائیں، لیکن اگر کوئی شخص ان پانچ صفات کو پانے کے لیے سعی و کوشش اور محنت کرے، پھر جا کے ایمان کی راہ میں، ایمان کے اہداف کی راہ میں جدوجہد کرے تو وہ اپنے آپ کو مومن کہنے کا حقدار ہے۔ حقیقی مومن وہ ہے جس کے اندر یہ پانچ صفات موجود ہوں۔ پہلی ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنونَ﴾ مومنین فقط، ﴿الَّذِينَ﴾ وہی ہیں، ﴿إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ﴾ کہ جب اللہ کا ذکر ہو ﴿وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ تو ان کے دل خوف سے لرز جائیں۔ یعنی کیا مطلب؟ اللہ سے خوف کا کیا معنی ہے؟

انسان کے وجود کی خاصیت یہی ہے، انسان کی روح اور جسم کی ترکیب اس کا سبب بنتی ہے کہ ہر باعظمت چیز کے مقابلے میں، ہر انسان خوف کا احساس کرتا ہے، یہ خوف کی حالت، اس لحاظ سے نہیں ہے کہ اس سے ڈرتا ہے، ممکن ہے وہ اپنے اندر کوئی ڈر نہ رکھتا ہو۔ یہاں ڈر کا تعلق گناہ سے نہیں ہے، بلکہ یہ ڈر اس کی عظمت کے مقابلے میں اپنے اندر حقارت کے احساس سے جنم لیتا ہے۔ اس طرح کا خوفِ خدا بجا اور صحیح ہے، ضروری، لازمی اور مفید ہے۔ جو خدا کے مقابلے میں خود کو چھوٹا، ناقص اور حقیر سمجھے اور خدا کو اپنے تمام امور پر مسلط، محافظ اور نگہبان کی صورت میں دیکھے تو اس طرح کا انسان کوشش کرتا ہے کہ خدا کے معین کردہ اس مستقیم اور سیدھے راستے سے دوسرے راستے کی طرف نہ جائے، ایک مسلمان انسان میں اور ایک مسلمان معاشرے میں سعی و کوشش اور عمل کے نفاذ و اجراء کا سب سے بڑا ضامن یہی ہے۔

یہی چیز ہے کہ آپ دیکھتے ہیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، جب ماہ رمضان کا تیسرا عشرہ آتا تو فرماتے تھے: میرا بستر لپیٹ دو، اپنے لیے بستر نہیں بچھاتے تھے، یعنی اب راتیں سونے کے لیے نہیں

---

۱. سورہ مبارکہ انفال: آیات ۲ سے ۴

بلکہ عبادت کے لیے ہیں، پروردِگار کے سامنے تضرع و زاری کے لیے ہیں، خضوع و خشوع کے لیے ہیں۔ گمان نہ کریں کہ یہ مصنوعی اور دکھاوے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ کس قدر ناقص و ناآگاہ ہے وہ شخص جو یہ کہے کہ امام دعائے ابوحمزہ ثمالی میں لوگوں کو تعلیم دے رہے ہیں اور اپنے آپ سے نہیں کہہ رہے۔ کس قدر وہ خدا کے صالح بندوں کی روحِ دعا اور مناجات کی کیفیت سے ناواقف ہیں؟ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ امام علیہ السلام کا گریہ و زاری اور آنسو بہانا دوسروں کو سکھانے کے لیے ہے، یعنی انہوں نے مصنوعی گریہ کیا ہے تاکہ آپ اور میں ان سے سیکھیں؟ غلط ہے یہ، واقعاً انہوں نے آنسو بہائے ہیں۔ انہوں نے گریہ کیوں کیا؟ اس لیے کہ ان میں معرفتِ خدا زیادہ ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام خدا کے وجود میں اس عظمت کو دیکھتے ہیں کہ ہماری ظاہربین آنکھیں اس عظمت کا ادراک نہیں کرسکتیں۔

تو اس قدر بلند عظمت کا مالک ہے کہ چھوٹے سے آئینے میں دکھائی نہیں دے سکتا۔[1]

ہماری روح کا یہ چھوٹا سا آئینہ، اس عجیب و غریب عظمت کو اپنے اندر منعکس نہیں کر سکتا، لیکن امیرالمومنینؑ کی روح کا آئینہ کس طرح؟ وہ اس عظمت کو سمجھ سکتا ہے، حاصل کرتا ہے، درک کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپؑ مار گزیدہ کی طرح تڑپتے اور آنسو بہاتے ہیں۔

جب یادِ خدا کی بات ہوتی ہے تو وہ ہیبت کی حالت، وہ خشیت الٰہی کی کیفیت، وہ خوف اور ڈر کا احساس، وہ حالت جو خدائے متعال کی عظمت کے مقابلے میں اپنے حقیر اور ناچیز ہونے کے احساس سے پیدا ہوتی ہے، مومن کے دل پر مسلط ہوجاتی ہے۔ ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ مومن وہ ہیں جب خدا کی یاد ہو تو ان کے وجود میں عظمتِ پروردِگار کی وجہ سے اپنی حقارت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اسی احساس سے ان کا دل پُر ہوجاتا ہے۔ یہ ایک صفت۔

﴿وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾. مومن کی دوسری نشانی یہ ہے کہ جب ان پر اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں، یا وہ خود پڑھتے ہیں یا کوئی دوسرا ان کے لئے تلاوت کرتا ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ ﴿زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾. یہ ایمان بیج کی طرح ان کے دل میں، ان کی روح میں پروان چڑھتا ہے، بڑا ہوتا ہے، جس طرح ایک پودا بڑا ہوتا ہے، درخت کی طرح اس کی جڑیں اور شاخیں مضبوط

---

۱. تو بزرگی و در آیینہ کوچک ننمایی (شہریار کے شعر کا ایک مصرعہ)

ہوتی ہیں، یہاں تک کہ اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ حقیقی مومن وہ ہے کہ اگر دینی اور الٰہی حقائق اور معارف کا ایک کلمہ بھی اس کے دل میں ہو تو، اسی ایک کلمہ میں تدبر کے ذریعے، بصیرت کے ذریعے، غور و فکر کے ذریعے، وہ اپنے ایمان میں اضافہ کرتا ہے اور اس ایمان کو ضائع ہونے سے بچاتا ہے، یہی حقیقی مومن ہے۔

اس آیت اور اس جملہ سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ تلاوت قرآن کے ذریعے سے ضروری ہے کہ مومن کے ایمان میں اضافہ ہو۔ قرآن ایسی کتاب ہے کہ جسے سمجھنے کی نیت سے پڑھنا ضروری ہے، اور سمجھنااس نیت سے ہو کہ ایمان کی طاقت میں اضافہ ہو، ﴿وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾ یہ تھی مومن کی دوسری شرط اور دوسری صفت۔

آیت کا تسلسل ہے کہ: ﴿وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾ مومنوں کی ایک اور نشانی یہ ہے کہ اپنے پروردگار پر توکل اور بھروسہ کرتے ہیں۔ توکل کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہی کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے کہتے رہیں کہ خدا خود ٹھیک کردے گا؟ نہیں، توکل کا معنی یہ نہیں ہے۔ اگر خدا کے بندوں سے کچھ نہ ہو پاتا، اگر فساد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے انسان کی قوت ارادی اور طاقت کار آمد نہ ہوتی تو خدا انبیا کو نہ بھیجتا، لوگوں کو انبیا کی پیروی کا حکم نہ دیتا، انبیائے الٰہی کو رسالت کی بھاری ذمہ داری کے ساتھ دنیا کے اس میدانِ کارزار میں نہ بھیجتا۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ خدا نے جن کو بھیجا ہے اور ان کا مقصد فساد کو جڑ سے اکھاڑنا ہے، وہ انسان اور بشر ہی ہیں تو پس جان لیں کہ انسانی فساد کو انسان ہی جڑ سے اکھاڑ سکتا ہے۔

پس توکل کا مقصد کیا ہے؟ توکل یعنی ہر حال میں بھروسہ اور امید صرف خدا سے ہو۔

آپ نے دیکھا ہے کہ بعض افراد اپنی زندگی کی مشکلات میں، بحرانوں میں، وہاں پر جہاں زندگی کے تمام ظاہری وسائل سے خالی ہاتھ ہوجاتے ہیں، کیا کرتے ہیں؟ آپ نے دیکھا ہے؟ سنا ہے؟ مندرجہ ذیل کاموں میں سے کوئی ایک کام انجام دیتے ہیں: یا دشمن کے مقابلے میں سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب ہم سے کام نہیں ہو سکتا تو ہم کیا کرسکتے ہیں؟ پس ایک یہ کہ دشمن کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں، یا معمول کی زندگی کے اسیر ہو جاتے ہیں دشمن کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکتے، لیکن عملی طور پر یہی راستہ اختیار کرتے ہیں، سعی و کوشش کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ وہ درحقیقت عام

زندگی کے اسیر ہو چکے ہیں۔ اس طرح کا انسان اگرچہ ظاہری طور پر دشمن کا اسیر نہیں ہوا، لیکن باطنی طور پر دشمن کے سامنے اپنا سر جھکا چکا ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک کام اور ایک حالت ہے کہ جسے بحرانوں کا شکار لوگ اپناتے ہیں۔ ایک اور راستہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ مثلاً ایک صاحب کو جب حکومت ملتی ہے اور بین الاقوامی طاقتوں کی امداد اور حمایت کے کھوکھلے وعدوں سے تنگ آتا ہے، جب بھی، جس وقت بھی ملک کے کسی گوشے سے اس کے خلاف شورش برپا ہوتی ہے، اور وہ اسے کنٹرول کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے، جب ذلیل و خوار اور تھک ہار کر بے چارہ ہو جاتا ہے تو خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے۔

یہ سب ایسے راستے ہیں کہ جنہیں مشکلات میں گھرا وہ انسان اپنانے کی کوشش کرتا ہے جو خدا سے دور ہوتا ہے۔ بھلا جنگ اُحد سے بڑی بھی کوئی اور مشکل ہو سکتی ہے؟ چھوٹا سا محدود لشکرِ اسلام مالِ غنیمت کو سمیٹنے میں مصروف ہے کہ اچانک دونوں طرف سے اس پر حملہ ہو جاتا ہے، چند سپاہیوں کی غفلت کی وجہ سے۔ ایک حملہ سامنے سے اور ایک پشت سے۔ انہوں نے تلواریں نیاموں میں ڈالی ہوئی ہیں، گھوڑوں سے اتر چکے ہیں، اسلحہ کو زمین پر رکھا ہوا ہے۔ اچانک دیکھتے ہیں کہ مسلح، وحشتناک اور غصے سے بھرے ہوئے دو گروہ ان پر دو طرف سے حملے کر رہے ہیں، ظاہر ہے اب ایک لشکر جو اسلحہ کے بغیر، بے سروسامانی کی حالت میں ہے وہ ایسی حالت میں کیا ردعمل دکھاتا ہے؟ فرار کر کے بھاگ جاتا ہے، شیطان نے چند شیطان صفت انسانوں سے یہ اعلان کروایا کہ پیغمبرؐ بھی ہمارے درمیان میں نہیں رہے، واضح ہے، شیطان ہمیشہ اس طرح کے کام کرتا ہے۔ شیطان کے واضح منصوبوں اور ہتھکنڈوں میں سے ایک یہ ہے کہ وقت سے پہلے الٰہی اور رحمانی محاذ کی شکست کا اعلان کرے کہ ہاں تم لوگ شکست کھا گئے ہو، پیغمبر اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں، اس طرح کے بحران اور اس طرح کی بند گلی میں اللہ پر توکل کرنے والا ایک مومن کیا کرتا ہے؟ نجات کے سارے راستے بند ہو چکے ہیں، اسلحے زمین پر رکھ دیئے گئے ہیں، دشمن اسلحے سے لیس ہے، مسلط ہو چکا ہے، طاقتور ہے، یہاں پر جو چیز انسان کی مدد کو پہنچتی ہے، وہ ایسا دریچہ ہے جو صرف خدا پرست لوگوں کے پاس ہے۔ خدا پر بھروسہ کرنے والوں کے لیے یہ بند گلی کیا حیثیت رکھتی ہے؟ پیغمبر خدا اس دنیا سے جا چکے ہوں، لیکن پیغمبر کا خدا تو زندہ ہے، ذمہ داری تو ختم نہیں ہوئی ایسی صورت

حال میں خدا پر توکل رکھنے والا انسان کس شخص کی طرح کا عمل انجام دیتا ہے؟ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی طرح عمل انجام دیتا ہے، ابودجّانہ[1] کی طرح، دو تین دوسرے مجاہدین کی مانند، یہ اللہ پر بھروسہ اور توکل کرنے والے انسان تھے۔ توکل نہ کرنے والے کون تھے؟ وہ لوگ تھے جنہوں نے احد سے مدینہ تک پیٹھ دکھائی اور شہر کے دروازے کی طرف بھاگنے میں اپنی عافیت جانی۔ اب دیکھا آپ نے کہ توکل کسے کہتے ہیں؟

وہ شخص جو توکل کو ہاتھ پر ہاتھ رکھنے، انجانے مستقبل کی امید میں بغیر کوشش کے بیٹھنے اور اپنے ایمان کو اپنی قوت و طاقت سے سلب کرنے کے معنی میں لیتا ہے؛ وہ شخص جو توکل کو انسان کے ارادے اور اس کی قوت و طاقت پر خطِّ بطلان کھینچنے کے معنی میں لیتا ہے؛ اس طرح کا انسان یا توکل کو نہیں سمجھتا، اسلام کا مفہوم نہیں سمجھتا، توکل کا ادراک نہیں رکھتا، یا نہیں، سمجھتا ہے، لیکن شرف حاصل نہیں کرتا، چاہتا ہے کہ توکل کے معنی کو تبدیل کرے تاکہ اس طرح توکل نہ کرنے والے لوگوں میں اضافہ ہو کہ جنہیں اسلام سمجھنا نصیب نہیں ہوتا۔ توکل کا معنی یہی ہے۔ ﴿وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾ میری نظر میں انسان کے لیے زندگی کی سعی و کوشش میں دوطاقتور پَر ہیں:ایک صبر ہے اور دوسرا توکل۔ جس امت کے پاس یہ دو پر ہوں وہ دشمن کے نشانہ سے دور رہے گی؛ صبر کا پر اور توکل کا پر۔ ﴿وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾ یہ تھیں مومن کی تین علامتیں۔

چوتھی علامت، ﴿الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ وہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں۔ جناب والا! توجہ کریں، «الَّذِينَ يُصَلُّونَ» اور ﴿الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ کے درمیان ایک فرق ہے، «يُصَلُّونَ» یعنی نماز پڑھتے ہیں۔ اگر فقط نماز پڑھنے کا بیان ہوتا اور صرف خم و راست ہونا مقصود ہوتا تو یہاں ﴿يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ کہنا ضروری نہیں تھا، صرف «الَّذِينَ يُصَلُّونَ» کہہ سکتے تھے یعنی وہ لوگ ہیں جو نماز پڑھتے ہیں۔ واضح ہے کہ ﴿يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ یعنی نماز کو قائم کرتے ہیں،نماز پڑھنے کے علاوہ ہے، ایک دوسری چیز ہے، ایک بلند و بالا حقیقت ہے، آپ کی نظر میں یہ حقیقت کیا ہے؟ نماز کو قائم کرنا، اس کا کیا مقصد ہے؟

۱۔ ابودجّانہ صحابہ کبار میں سے ہیں، پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد، گیارہویں ہجری میں جنگ یمامہ میں شہید ہوئے، جنگ احد میں ان کی شجاعت اور فداکاری اس حد تک تھی کہ سورہ صف کی چوتھی آیت ان کی اور دوسری عظیم شخصیات جیسے امیرالمومنین علیہ السلام اور حضرت حمزہ کی شان و منزلت کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک روایت میں امام جعفرصادق علیہ السلام نے ان کو حضرت امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کے کمانڈروں میں ذکر کیا ہے کہ حضرتؑ کے ظہور کے بعد رجعت کریں گے۔

اس بارے میں مختلف نظریات ہو سکتے ہیں: ممکن ہے یہ سب نظریات ٹھیک ہوں۔ ایک یہ کہ کہیں نماز کا قائم کرنا، یعنی نماز کو مکمل طور پر ادا کرنا، بطورِ کامل بجا لانا۔ ﴿يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ اتفاق سے عربی زبان میں، عربی اصطلاحاتِ میں اقامہ کا معنی یہی ہے۔ یعنی کام کو بطور کامل انجام دینا۔ ﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا﴾[1] تمام چہرے کو، تمام وجود کو دین کی طرف پلٹاؤ۔ مکمل طور پر۔

ایک یہ نظریہ اور احتمال ہے۔ اور واقعاً ہے بھی یہی کہ اگر نماز کو اسی معنی کے مطابق قائم کرے یعنی بصورت کامل انجام دے۔ صحیح ارکان کے ساتھ، نماز کی تمام تعلیمات کے ساتھ۔ اگر کوئی اس طرح نماز پڑھے تو حقیقت میں کامیابی اس کے انتظار میں ہے۔

دوسرا نظریہ، یہ ہے کہ ﴿الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ نماز قائم کرتے ہیں۔ یعنی معاشرے میں قائم کرتے ہیں، معاشرے کو نمازی معاشرہ بناتے ہیں۔ بعض لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ خود تو نماز پڑھتے ہیں، شب و روز میں سترہ رکعت کی بجائے اکاون رکعت نماز پڑھتے ہیں، دوسری مستحب نمازیں اس کے علاوہ ہیں۔ اگر ان سے کہیں کہ بابا، لوگ تو جوق در جوق دین سے دور ہو رہے ہیں، تو انہیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔ بقول شاعر:

گفت آن گلیم خویش بہ در میبرد ز موج[2]

تو جواب ملتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو ساحل نجات تک پہنچا لیں بڑی بات ہے، دوسروں تک نہیں پہنچ سکتے۔ بعض لوگ اس طرح کے ہیں۔ وہ عمل جو ایمان کی نشانی ہے، یہ عمل نہیں۔ جو بھی بہترین نماز پڑھتا ہے، لیکن خود پڑھتا ہے اور دوسروں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تو یہ ٹھیک نہیں ہے، اس کا مقصد ہے کہ کامل نہیں ہے۔

کامل ایمان کی نشانی کیا ہے؟ نماز قائم کرنا یعنی نماز کو معاشرے میں قائم کرنا۔ سب کو نمازی بنانا، اس معنی میں نہیں کہ ایک عبادت سب انجام دیں۔ (میرا دل چاہتا ہے کہ آپ اپنے ذہن کو الفاظ کے قالب سے نکال کر فکر کو وسعت دیں، میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ الفاظ، چھوٹے، نارسا اور قاصر ہیں) اس طرح نہیں کہ فلاں شخص نماز نہیں پڑھتا اسے نمازی بنائیں بلکہ نمازی معاشرہ، یعنی ایسا معاشرہ جو

---

۱. سورہ مبارکہ روم: آیت ۳۰

۲. سعدی

ہر وقت یادِ خدا اور راہِ خدا میں ہو۔ ایسا معاشرہ جو کہتا ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾[1] خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرتا۔ خدا کے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتا، اور اس کے علاوہ کسی سے مدد طلب نہیں کرتا۔ نمازی معاشرہ یعنی وہ معاشرہ جو ہر روز فتنہ و فساد کے سرداروں جو کہ﴿الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ﴾[2] ہیں اور ان کے پیروکاروں یعنی جو ﴿الضَّالِّينَ﴾ ہیں، سے برائت کا اظہار کرے۔ اور یہی اصل نماز ہے۔ اگر کوئی سعی و کوشش کرے کہ اسی معنی میں دوسرے لوگوں کو نمازی بنائے، تو درحقیقت یہ بندگیٔ خدا کی راہ میں کوشش ہے۔ فساد کو جڑ سے اکھاڑنے کی راہ میں، میں اور ہم کو ختم کرنے کی راہ میں، ہر ایک مسلمان اور ہر ایک انسان کو اتحاد کی لڑی میں پرونے اور وحدت کو ایجاد کرنے کی راہ میں، ان راستوں میں کوشش انجام دینا درحقیقت نماز کو قائم کرنا ہے یعنی آپ ایسا کام کریں کہ تمام لوگ، ہرروز، پانچ وقت اور ہر موقع پر چند بار کہیں: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ خدایا! تیرے سامنے بندگی کی گردن اور بندگی کی پشت کو جھکاتے ہیں، نہ کہ تیرے غیر کے سامنے۔ ہر روز، پانچ بار اور ہر بار چند مرتبہ ﴿الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ﴾ اور ﴿الضَّالِّينَ﴾ سے یعنی فتنہ و فساد کے سرداروں اور ان کے پیروکاروں سے بیزاری کا اظہار کریں۔ ایسا معاشرہ قائم کریں۔ ممکن ہے کہ نماز کو قائم کرنے کا ایک معنی یہ بھی ہو۔
﴿وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ مومنوں کی اس کے علاوہ کون سی نشانی ہے؟ ایک یہ ہے کہ جو روزی ہم نے ان کو دی ہے، اس میں سے انفاق کرتے ہیں۔ انفاق کا کیا مطلب ہے؟ انفاق یعنی ضرورتوں کے خلا کو پُر کرنا۔ ایسا خرچ کرنا جس سے خلا پُر ہو جائے، ایک ضرورت پوری ہو جائے اس کو کہتے ہیں انفاق۔
﴿وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ کہنے کا کیا مقصد؟ یعنی اللہ فرماتا ہے: مومنین وہ ہیں جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے؛ مال کا نام نہیں لیا، کہ جو پیسے ان کو دیئے؟ نہیں؛ اس میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ ان پیسوں سے جو اُن کو دیئے، اس عمر سے جو اُن کودی، اولاد سے جو اُن کو دی،اس آبرو سے جو اُن کو دی، اس جسمانی طاقت سے جو اُن کو دی، اس زبان سے جو اُن کو دی، اس فکر اور مغز سے جو اُن کو دیا، ہر اس چیز سے جو اُن کو دی ﴿ما رَزَقْنَاهُمْ﴾ ہر وہ چیز جو ان کو رزق کی صورت میں عطا کی، کیا کرتے ہیں؟ ﴿يُنفِقُونَ﴾ انفاق کرتے ہیں۔ یعنی صحیح طور پر خرچ کرتے ہیں نہ کہ ہر جگہ خرچ کرتے ہیں۔

---

۱. سورہ مبارکہ حمد: آیت ۵

۲. سورہ مبارکہ حمد: آیت ۷

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ حقیقت میں یہی مومن ہیں۔ ﴿لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ﴾ ان کے لیے درجات ہیں۔ درجات، یعنی رتبے اور مرتبے ہیں۔ ﴿عِندَ رَبِّهِم﴾ ان کے پروردگار کے نزدیک۔ ﴿وَمَغْفِرَةٌ﴾ مغفرت بھی ان کے شاملِ حال ہوگی۔ وہی مغفرت جس کا کل میں نے معنی کیا تھا۔ امید ہے وہی مفہوم آپ کے ذہن میں بطورِ کامل ہوگا۔

خدا کا کسی کو مغفرت دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی روح پر گناہ سے جو زخم وجود میں آیا ہے خدا اسے بھر دے، اس طرح کے افراد کے گناہ کے زخم کو خدا مندمل کر دے گا۔ ﴿وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ شریفانہ روزی، کریمانہ رزق، بغیر ذلت کے، بغیر تنگی کے، بغیر شرمساری کے۔ اللہ اس طرح کی روزی ان کو دے گا۔

ایک معاشرہ اس وقت پاکیزہ اور شرافتمندانہ رزق، عزت و سربلندی اور کرامت حاصل کر سکتا ہے اور اس وقت شریفانہ روزی کما سکتا ہے جب وہ مومن ہو اور ان صفات کا حامل ہو۔ اگر اس طرح ہو تو وہ تمام نعرے جو آج کل دنیا کی سیاسی پارٹیاں ہر طرف سے میڈیا وغیرہ کے ذریعے چاہے سچے ہوں یا جھوٹے، دنیا کی قوموں کے سامنے لگاتی ہیں، وہ تمام نعرے اس ایماندار معاشرے میں عملی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ صلح، آزادی، رفاہِ عامہ، امن و سکون، جنگ کے بغیر، خونریزی کے بغیر، اخوت و برادری کے ساتھ، خلوص و محبت کے ساتھ، اعلیٰ ثقافت، اعلیٰ تعلیم، بہترین روزگار، اور وہ تمام الفاظ اور نعرے کہ جن میں سے بعض با معنی اور بعض بے معنی ہیں، وہ تمام نعرے ایمانی معاشرے میں عملی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ ﴿وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ اور عزت و شرافت، کرامت و سربلندی کی روزی۔

تیسری نشست

ایمان؛ بصیرت و آگہی کے ساتھ

۴ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری ۱۹۷۴-۰۹-۲۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۞ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (سورہ آل عمران/۱۹۰-۱۹۱)

یہ چند آیات جو آج ہم تلاوت کریں گے، ان کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے، ایمان کے حوالے سے مزید دو تین حقیقتیں اور بھی سامنے آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایمان انبیائے الٰہی، صاحبانِ ایمان اور ان کے پیروکاروں کی عظیم نمایاں صفت ہے، ایمان کا حامل ہونا اور اپنی رسالت اور ذمہ داری پر یقین رکھنا الٰہی رہبروں اور دنیا کے سیاسی رہنماؤں کے درمیان فرق ہے۔ الٰہی رہبر اس راہ پر چلنے والے کی طرح ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے یا جو قدم وہ اٹھاتا ہے یا جس راستے کو وہ طے کرتا ہے، اس پر دل و جان سے اور دل کی گہرائیوں سے ایمان رکھتا ہے۔ جب کہ دنیا کے سیاستدان جو بیانات دیتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ خوبصورت، دلکش اور دلچسپ بھی ہوں، لیکن جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس پر یقین یا جتنا یقین ہونا چاہیے، اتنا نہیں رکھتے۔

انبیاءؑ میں موجود جملہ خصوصیات میں سے ایک، ایمان ہے اور یہاں پر ایمان سے مراد اعتقاد و یقین رکھنا، قبول کرنا اور پورے وجود سے مان لینا، جو کچھ کہہ رہے ہوں، اس پر پورا یقین رکھنا ہے۔ یقین رکھنے کی نشانی یہ ہے کہ یہ خود بھی دوسروں سے آگے اسی راستے پر چلتے اور قدم اٹھاتے ہیں۔

اسی لیے قرآن کریم فرماتا ہے:﴿آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ﴾[1] رسولؐ ان تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر اتاری گئی ہیں، ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ﴾ مومنین اور ان کی طرف مائل ہونے والے، وہ برگزیدہ افراد جو ان کے اردگرد ہیں اور ان کی دعوت کے داعی بن گئے ہیں، وہ بھی ایسے ہی ہیں ﴿كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ﴾ سب لوگ یا ہر ایک خدا پر ایمان لے آیا، خدا کو قبول کرلیا، ﴿وَمَلَائِكَتِهِ﴾ اور اللہ کے فرشتوں پر ﴿وَكُتُبِهِ﴾ اور شروع سے آخر تک تمام آسمانی کتابوں پر ﴿وَرُسُلِهِ﴾ اور اس کے تمام انبیاءؑ پر۔ پیغمبر اکرمؐ اور آپ کے ساتھیوں کا ایمان ان سب پر ہے، کیونکہ یہ راستہ ایک ہی راستہ ہے:

در این رہ انبیا چون ساربانند
دلیل و رہنمای کاروانند[2]

سب ایک ہی قافلے کے ساربان ہیں، ایک ہی راستے کے قافلہ سالار ہیں، ایک ہی ہدف کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں، ہر جگہ پر لوگوں کو ساتھ، لے کر ایک ہی مقصد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ﴾ (یہ مومنین کی زبان سے ہے) ہم خدا کے رسولوں میں تفریق نہیں کرتے۔ ہمارے لیے حضرت عیسیٰؑ ایسے ہی محترم ہیں، جس طرح سے حضرت موسیٰؑ، جس طرح سے حضرت ابراہیمؑ، جس طرح سے حضرت ادریسؑ[3] جس طرح سے حضرت یعقوبؑ، جس طرح سے حضرت جرجیسؑ، جس طرح سے حضرت نوحؑ، جس طرح سے ابتدا سے آخر تک تمام انبیاؑ، سب کے سب خدا کی طرف سے مامور تھے، ایک ہدف کے لیے مامور، ایک سعادت اور ایک جنت کی بشارت دینے والے، سب ایک ہی راستے پر گامزن تھے۔ ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ﴾ ہم اس کے پیغمبروں کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھتے۔ (ان شاء اللہ اسی سلسلۂ بحث کے دوران آنے والے دنوں میں، نبوت پر اعتقاد کے حوالے سے جو گفتگو کروں گا، ممکن ہے اس میں اس مسئلے کی جانب بھی کچھ اشارہ کروں۔)

---

۱. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۲۸۵
۲. اس راہ میں انبیاؑ کی حیثیت ساربان کی سی ہے جو کاروان کے لیے رہنما ہیں۔ (شیخ محمود شبستری)
۳. حضرت ادریسؑ، حضرت آدمؑ اور حضرت شیثؑ کے بعد مقام پیغمبری پر مبعوث ہوئے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ کی ایک روایت کے مطابق، آپؑ بہت زیادہ تدریس کی وجہ سے ادریس کے نام سے مشہور ہوئے۔ خدا نے اسی نبیؑ کے ذریعے انسان کو لکھنا سکھایا۔

ان دو، تین جملوں پر غور کیجیے جو اس بات کے لیے ثبوت اور شاہد ہیں جو بعد میں بیان کروں گا۔ پس تمام انبیاؑ ایمان رکھتے ہیں، ہمارے نبیؐ بھی ایمان رکھتے ہیں، صاحبانِ ایمان، ان کی طرف مائل ہونے اور ان سے ملحق ہونے والے، سب ہی ایمان رکھتے ہیں۔ ﴿وَقَالُوا﴾ اور کہتے ہیں ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ ہم نے سنا، سمجھا، درک کیا، ﴿سَمِعْنَا﴾ ایسا نہیں کہ ہمارے کانوں میں پڑ گیا۔ سَمِعَ یعنی سننا، سننے کی حالت، کان سے مختلف ہے، کان ایک خاص عضو بدن ہے، اسے عربی میں اُذُن سے تعبیر کرتے ہیں۔ سمع یعنی سننا۔ آپ فارسی میں بھی دیکھتے ہیں کہ فلاں شخص کو کہا جاتا ہے کہ وہ بات کو غور سے سنتا ہے، فلاں شخص بات کو سنتا ہے۔ آپ اپنے مخاطب سے کہتے ہیں، سنا میں نے کیا کہا؟ ظاہر ہے کہ آپ کے درمیان آدھے میٹر سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا، آپ کی آواز دس میٹر تک بھی جا سکتی ہے، ظاہر ہے کہ اس نے سنا ہے۔ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سمجھے میں نے کیا کہا؟ میری بات دماغ میں بیٹھی؟ ذہن میں اتری یا نہیں؟ اسے کہتے ہیں ﴿سَمِعْنَا﴾ ہم نے پورے وجود سے سمجھ لیا ہے جو خدا نے ہمارے لیے معین کیا اور بھیجا تھا۔ ﴿وَأَطَعْنَا﴾ اور اطاعت کی۔ یعنی کیا مطلب؟ یعنی ہماری اطاعت اندھی اطاعت نہیں تھی، ہماری اطاعت روشنی، آگہی اور سمع و بصیرت کے ساتھ تھی۔ ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا﴾ اے ہمارے پروردگار تیری درگزر، تیری مغفرت۔ خدایا ہم جو اجر تجھ سے چاہتے ہیں، تیری مغفرت ہے نہ کہ کچھ اور، ﴿وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ ہمارا پلٹنا تیری طرف ہے۔

یہاں تک ہم نے ان آیات سے کیا سمجھا؟ یہ نکتہ کہ ایمان اور یقین، دعوتِ اسلام سے وابستہ افراد کی خاصیت ہے۔ جو لوگ ایمان نہیں رکھتے، یقین نہیں رکھتے، چونکہ دوسرے (اس راہ پر) چل رہے ہیں تو صرف اسی لیے یہ بھی احتیاطاً چلے جا رہے ہیں، ایسے لوگ فکر اسلامی کی حدود میں داخل نہیں ہوئے ہیں، تکلف کی کوئی بات نہیں ہے، ایمان ضروری ہے۔ ایمان یعنی اعتقاد، واضح طور پر بات کو قبول کرنا۔ ایک کشش کے پیچھے چلنا۔ اگر دین و قرآن کے مکتب میں یہ جاذبیت نہ ہو اور اس نے آپ کا دل تسخیر نہ کیا ہو؛ یعنی اس دل میں ایمان نہ ہو تو یہ دل مردہ ہے، نورِ اسلام سے زندہ نہیں ہے، اسے مسلم نہیں کہا جا سکتا۔ پس ایمان ضروری ہے۔ یہ ہوئی ایک بات۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں: ایک تقلیدی اور تعصب پر مبنی ایمان؛ کیونکہ آباء و اجداد اور بزرگ اعتقاد رکھتے تھے، تو ہم نے بھی یقین کر لیا۔ کیونکہ ہماری کتاب میں، ہمارے دینی

مکتب میں، اس طرح کہا جاتا ہے، تو ہم بھی ایسا ہی کہتے ہیں، اگرچہ تم دلیل بھی لے آؤ تو فضول میں لائے ہو، ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے۔ یہ بھی ایک قسم کا ایمان ہے، لیکن تقلید یا تعصب کی بنیاد پر۔ جس ایمان کی اسلام میں اہمیت ہے، وہ تقلیدی اور تعصبی ایمان نہیں ہے، یعنی تقلیدی اور تعصبی ایمان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ آپ کو دلیل چاہیے ہوگی؟ دسیوں دلائل میں سے ایک دلیل بیان کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب ایمان تقلید اور تعصب کی بنا پر ہو، تو اس کا زائل ہونا بھی اس ایمان کے حاصل ہونے کی طرح آسان ہوتا ہے۔ جس طرح سے ایک بچے نے، کسی زحمت کے بغیر اور ایک شاگرد نے کسی محنت کے بغیر والدین یا سکول کے اساتذہ کے ذریعے سے ایمان مفت میں لے لیا ہو تو ایمان کے چور، مفت میں یہ ایمان اس سے لے بھی اڑیں گے۔

اسلام میں یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ عزیزو! اہمیت والا ایمان، آگہی کے ساتھ آنے والا ایمان ہے، درک و شعور کے ہمراہ آنے والا ایمان ہے، وہ ایمان ہے جو بصیرت کے ساتھ، کھلی آنکھوں سے، اشکالات سے بے خوف ہو کر وجود میں آیا ہو۔ وہ ایمان ضروری ہے جو اس طرح آگہی کے ساتھ اختیار کیا گیا ہو کہ سخت ترین حالات میں بھی چھینا نہ جا سکے۔ ﴿إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾[1] عمار یاسرؓ کے بارے میں، قرآن کی آیت کہتی ہے: اگر اذیتوں کے دوران، دشمن کو کچھ دیر کے لیے دور کرنے کے لیے اگر ایک جملہ کہنا پڑے، تو کہہ دو، تمہارا ایمان ایسا ایمان نہیں ہے جو اذیتوں سے تمہارے دل سے زائل ہو جائے۔ جو ایمان خبّاب بن ارتؓ کا ہے، لوہا گرم کر کے ان کی گردن سے لگا دیا جاتا ہے، مذاق نہیں ہے، تپتے ہوئے لوہے کو ان کے بدن سے چپکا دیتے تھے، وہ آگہی کے ساتھ ملنے والے اپنے گہرے ایمان کے باعث، اس سے دستبردار نہیں ہوتے تھے۔ یہ ہے ایمان۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کا ایمان مستحکم ہو، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ان کا ایمان زائل نہ ہو، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ان کا ایمان، آگہی کے ساتھ ہو، تو ہمیں چاہیے کہ ہم ان لوگوں کو ہمیشہ آگاہ کرتے رہیں جن کو ہم چاہتے ہیں کہ وہ صاحبِ ایمان ہو جائیں۔ ان کی آگہی سے تشویش میں مبتلا نہ ہوں، ان کی آنکھوں اور کانوں کے بند ہونے سے لطف اندوز نہ ہوں۔ ایمان مستحکم کرنے کا راستہ آگاہی دینا ہے تاکہ

۱۔ سورہ مبارکہ نحل: آیت ۱۰۶۔ سوائے اس صورت میں کہ اسے مجبور کیا جائے جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (تو اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔)

ذہنوں میں، دلوں میں، فکروں میں علم اچھی طرح بیٹھ جائے اور اس آگہی کے ساتھ ایک صحیح، مستحکم اور ایک ٹھوس ایمان ان کے دل میں پیدا ہو جائے، اس وقت، وہ ایمان قدیم جوانوں کے بقول، کسی شرپنل توپ[1] سے بھی زائل نہیں ہوگا۔ اسلام کہتا ہے کہ ایمان کو آگہی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ آیتیں جو سورۂ آل عمران کے آخر میں ہیں، ہمارے لیے شعوری ایمان کا تعارف کراتی ہیں:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾[2] بے شک زمین و آسمان کی خلقت میں، ﴿وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ رات اور دن کی آمد و رفت میں، ﴿لَآيَاتٍ﴾ نشانیاں ہیں، حیرت میں پڑے لوگوں کے لیے؟ ہوش سے بیگانوں کے لیے؟ ان لوگوں کے لیے جو کچھ سوچتے نہیں؟ ہرگز نہیں! ﴿لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ صاحبانِ عقل کے لیے۔ عقل مند وہ ہے جو سمجھنے کی طاقت کا مالک ہو، اور وہ تمام لوگ ہیں جو اپنی فکری طاقت اور ذہانت کو کام میں لائیں۔ ﴿لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ یعنی وہ لوگ جو غور و فکر و عقل کی طاقت کو کام میں لاتے ہیں تاکہ عقلمند ہو جائیں۔ ﴿لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ کون ہیں؟ دیکھیے، یہاں قرآن کے لطیف نکات میں سے ایک نکتہ ہے۔

چونکہ قرآن انسان کے لیے حقیقی اہمیت، خدا سے اتصال و ارتباط کو سمجھتا ہے، عقلمند کا تعارف اس طرح سے کراتا ہے کہ عقلمند قرآن کی نظر میں وہ ہیں جو ان اعلیٰ ترین اقدار کو ہر چیز سے اور ہر ایک سے بڑھ کر مدِّ نظر رکھتے ہو۔ ﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ﴾ عقلمند وہ لوگ ہیں جو خدا کو یاد کرتے ہیں، ﴿قِيَامًا﴾ قیام کی حالت میں، ﴿وَقُعُودًا﴾ اور بیٹھے ہوئے، ﴿وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ﴾ اور ایک پہلو پر لیٹے ہوئے۔ یعنی ہر حال میں وہ یادِ خدا میں ہوں۔ لیکن یہ یادِ خدا میں ہونا، ایک صوفیانہ اور درویشانہ انداز کے معنی میں نہیں ہے کہ بعض اسی میں مگن رہیں کہ جی ہم تو ہمیشہ یادِ خدا میں ہوتے ہیں، ہمیشہ اللہ ہو کا ورد کرتے ہیں۔ نہیں، فعال طور پر یادِ خدا میں رہنا، ایسا یادِ خدا میں رہنا کہ عملی طور پر سمجھا جائے مگر کس طرح سے؟

---

۱. ہنری شرپنل (۱۷۶۱ء سے ۱۸۴۲ء) انگلستان میں توپ خانہ کا ایک افسر تھا جس نے ایک توپ کا گولہ (sharpenel shell) ایجاد کیا جو اس کے نام سے منسوب ہے، جس کے اصلی گولے کے اندر دھماکے کرنے والے مختلف چھوٹے گولے رکھے جاتے تھے۔ اصلی گولہ اپنے راستے میں ہدف کے نزدیک پھٹ جاتا اور اپنے اندر موجود گولوں کو چھوڑ دیتا جو ایک بڑے وسیع علاقے میں پھیل جانے کے بعد پھٹتے اور بڑی تباہی پھیلاتے۔

۲. سورہ مبارکہ آل عمران: آیت ۱۹۰ سے ۱۹۳

﴿وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ اور غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی خلقت میں، حالتِ تفکر میں ہیں۔ دیکھیے اولوالالباب، صاحبانِ عقل وہ ہیں جو حالتِ تفکر میں ہوں، ﴿وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ جب غور و فکر کر لیا تو دل کی زبان اور ظاہری زبان سے یہ کہتے ہیں: ﴿رَبَّنَا﴾ اے ہمارے پروردگار! ﴿مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ﴾ تو نے اسے فضول میں خلق نہیں کیا، تو اس سے منزہ ہے کہ فضول میں خلق کرے، یعنی ایک آئیڈیالوجی[1] کا اہم ترین اور بنیادی ترین نقطہ۔

ہر زندگی ساز آئیڈیالوجی کا بنیادی نقطہ یہی ہوتا ہے کہ میں یہاں پر کسی کام کے لیے آیا ہوں۔ اگر خدا پر اعتقاد رکھتا ہے تو کہتا ہے کہ مجھے کسی کام کے لیے یہاں لایا گیا ہے، اگر خدا کا معتقد نہیں ہے، تو کہتا ہے کہ بہ ہر صورت یہاں مجھے کوئی نہ کوئی کام تو ہے۔ دیکھیے، ایک ایسا فکری فلسفہ ہے جو ایک انفرادی اور اجتماعی زندگی کا راستہ دکھاتا ہے، اس کا ایک بنیادی ترین نقطہ یہی ہے: ﴿رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا﴾ خدا پر اعتقاد رکھتا ہے، اسی لیے کہتا ہے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے اس آسمان اور زمین کو، ان سب حیرت انگیز چیزوں کو، فضول اور بے کار میں خلق نہیں کیا، ﴿سُبْحَانَكَ﴾ تو فضول کام کرنے سے منزہ ہے، پس میری کوئی ذمہ داری ہے، پس مجھے کوئی راہ طے کرنی ہے، پس میں اس عالَم کے عجیب اور حیرت انگیز نظم میں ایک معمولی سا نقطہ ہوں اور وہ بھی کسی کام کے لیے۔ اس حیرت انگیز نظم میں، میری بھی ایک جگہ ہے کہ اگر میں درست اور صحیح طور پر اس جگہ کو، اس عمل کو اسی صورت میں کہ جس طرح تو نے چاہا ہے، انجام نہ دوں، تو میں نے اس نظم کو خراب کر دیا۔ ﴿سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ پس ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ، قیامت کی آگ، جو ایک حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ، تکوینِ عالَم اور خدا کے انتقام اور قہر و غضب کی علامت بھی ہے۔

غور کیجیے گا، یہ سب تمہید ہے، تمہید ہے اس کی کہ ہم ان آیات سے شعوری ایمان کو درست طور پر محسوس کریں، اب تک خود آپ دوستوں نے توجہ کرلی ہو گی کہ کس طرح سے ان آیات سے آگہی بڑھتی ہے، بلند ہوتی ہے اور اب غور کیجیے گا: ﴿رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ﴾ اے ہمارے پروردگار! جس کو تو نے جہنم کی آگ میں ڈال دیا، اسے تو نے ذلیل و رسوا کر دیا، ﴿وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ﴾ اور جن ظالموں کو تو نے جہنم کی آگ میں ڈالا ہے، ان کا کوئی ناصر و مددگار نہیں ہے،

۱. اعتقادات اور کائناتی تصور کا مجموعہ

نہ تکوینِ عالَم میں اور نہ غیبی طور پر، کوئی بھی نہیں۔ یعنی جو لوگ ظلم و ستم کی راہ میں، کفر و نفاق کی راہ میں، باطل کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں، ان کا انجام زوال و نابودی ہے، اس دنیا کی کوئی چیز ان کی حمایت نہیں کرتی۔

یہ ہوشیار عقلمند، یہ لِأُولِي الْأَلْبَابِ، یہ آسمان و زمین میں غور و فکر کرنے والے، وہ لوگ جو سمجھ گئے ہیں کہ اس دنیا میں بے مقصد نہیں آئے ہیں اور یہ کائنات بے ہودہ خلق نہیں کی گئی ہے، مزید کہتے ہیں (یہاں ہم ایمان تک پہنچتے ہیں) کہتے ہیں: ﴿رَبَّنَا﴾ اے ہمارے پروردگار، ﴿إِنَّنَا سَمِعْنَا﴾ ہم نے سنا ہے اور سمجھا ہے، دل و جان سے سنا ہے، ﴿مُنَادِيًا﴾ منادی اور بلند آواز سے پکارنے والے کو جو ﴿يُنَادِي لِلْإِيمَانِ﴾ ایمان کے لیے پکار رہا تھا، ایمان کی آواز لگا رہا تھا، ﴿أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ﴾ کہہ رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ، ﴿فَآمَنَّا﴾ تو ہم ایمان لے آئے۔ یہ کس قسم کا ایمان لائے تھے؟ کسی نے کہا ایمان لے آؤ، ایمان لے آئے؟ نہیں، یہ وہی صاحبانِ عقل ہیں، وہی مفکر ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ منادی بظاہر کوئی پیغمبر ہو، لیکن باطن میں، ان کی عقل، فکر اور بصیرت پیغمبر ہے جو ان کو خدا پر ایمان کی طرف دعوت دیتا ہے اور بلاتا ہے۔ پس منادی نے ان سے کہا ایمان لے آؤ، وہ بصیرت سے، درک سے، شعور اور پوری آگہی سے ایمان لے آئے۔ اس قسم کا ایمان اسلام میں پسندیدہ ہے: آگہی کے ساتھ ایمان۔ تو یہ ہوئی دوسری بات۔

یہاں پر ایک تیسری بات بھی ہے، جسے میں مختصر طور پر عرض کروں گا۔ تیسری بات یہ ہے کہ چونکہ شعوری ایمان اسلام کی نظر میں پسندیدہ ہے، چونکہ خدائے متعال لاعلمی کے ایمان کو پسند نہیں کرتا اور اس کے لیے کسی اہمیت کا قائل نہیں ہے، لہٰذا قرآن کئی مقامات پر، اندھے، تقلیدی، تعصبی ایمان کو، کہ غالباً اس قسم کے اعتقادات انسان کو سر کے بل زمین پر دے مارتے ہیں، ایسے ایمان کی سختی سے مذمت کرتا ہے۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ﴾[1] (کفار اور رجعت پسندوں کے بارے میں بات ہو رہی ہے) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آجاؤ اس چیز کی طرف جو خدا نے نازل کی ہے اور آجاؤ پیغمبرؐ کی طرف۔ ٹھیک ہے نزدیک آؤ اور سمجھو، آؤ اور سنو، دیکھو پیغمبرؐ کیا کہہ رہے ہیں، پیغمبرؐ کے پاس

---

۱. سورہ مبارکہ مائدہ: آیت ۱۰۴

کوئی بات ہے۔ ان کا جواب کیا ہے؟ بجائے اس کے کہ آئیں، بجائے اس کے کہ غور و فکر کریں، بجائے اس کے کہ سمجھنے کی کوشش کریں اور اپنے راستے کا انتخاب کریں، ﴿قَالُوا﴾ کہتے ہیں: ﴿حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا﴾ جس راہ و رسم پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے، وہی ہمارے لیے کافی ہے۔ ہم ان نئی باتوں کی طرف نہیں جائیں گے۔ ایک محقق کے بقول، قرآن میں لفظ کفار، تمام صدیوں کے رجعت پسندوں کے لیے ایک تعبیر اور ایک نام ہے۔ ہر جگہ پیغمبر، زمانے کا روشن خیال شخص ہے، نئی بات کرتا ہے، نیا راستہ ہے اس کے پاس، نئی باتوں کی طرف دعوت دیتا ہے، لیکن کفّار اور مخالفین، متعصب، مقلّد، قدامت پسند اور رجعت پسند لوگ ہیں جو اس کے نئے راستے کو پسند نہیں کرتے اور قبول نہیں کرتے۔ ان کی بات یہ ہے کہ: رہ چنان رو کہ رهروان رفتند[۱] ہم نے اپنے والدین کو اس طرح نہیں دیکھا ہے، ہم نے اپنے ماں باپ کو کسی اور انداز سے دیکھا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اسی طرح سے سمجھیں، اسی طرح سے عمل کریں۔ چنانچہ قرآن جواب میں کہتا ہے: ﴿أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾ انہوں نے آباء و اجداد کی تقلید کے مسئلے کو یہاں تک پہنچا دیا کہ قرآن ان سے کہتا ہے: اگرچہ تمہارے آباء و اجداد کچھ نہیں سمجھتے تھے، ہدایت یافتہ بھی نہیں تھے، خیر و شر کو درست طور پر سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، پھر بھی تم ان کی تقلید کرو گے؟ دیکھیے کس طرح سے تقلید کی مذمت اور ملامت کرتا ہے۔

---

۱. این نصیحت قبول کن از ما تا در آیی به جنت المأوی
رہ چنان رو کہ رهروان رفتند رہ رفتند و راه را رفتند
یعنی ہماری جانب سے یہ نصیحت قبول کرو تاکہ جنت الماویٰ میں داخل ہو جاؤ، کہ راستہ اسی طرح چلو جس طرح چلنے والوں نے چلا، چلے اور راستہ خوب طے کیا۔ شاہ نعمت اللہ ولی

چوتھی نشست

عملی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ ایمان کی افزائش

۵ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری

۲۲-۰۹-۱۹۷۴

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ﴾ (سورہ حج/۷۸)

قرآن مجید کی ناقابلِ تردید ثقافت اور تعلیمات کے مطابق، ایمان صرف ایک قلبی رابطہ اور تعلق نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایمان یعنی اعتقاد، اور اعتقاد کا تعلق دل سے ہوتا ہے، لیکن قرآن مجید ہر اعتقاد کو، ہر ایمان اور ہر قبولیت کو نہیں مانتا۔ خشک اور خالی قلبی ایمان، وہ ایمان جس کی کرن مومن کے اعضا و جوارح میں دکھائی نہ دے؛ یہ ایمان اسلام کی نظر میں اہمیت نہیں رکھتا۔

جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ صرف مومن ہوجانے سے، یعنی صرف اعتقاد رکھ لینے سے، بغیر عمل کے، بغیر کوشش کے، بغیر فداکاری کے، مومنین کے بارے میں خدا کی نویدیں انسان کو مل جائیں گی، جو لوگ یہ گمان کرتے تھے کہ جنت ایک قلبی معاملے پر دے دی جائے گی اور بغیر عمل کے، زمین کی حکومت کو ایک امر قلبی پر دے دیں گے نہ کہ عمل پر، خلاصہ یہ کہ جو لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ اگر عمل کو حذف کر دیں تو کچھ نہ کچھ ایمان باقی رہ جاتا ہے؛ وہ لوگ ان آیات کو اور دوسری آیات کو جو بعد میں تلاوت کی جائیں گی اور قرآن کے دسیوں دوسرے موارد اور پورے قرآن میں اچھی طرح غور کریں تاکہ دیکھ لیں کہ صرف وہ ایمان اسلام کی نظر میں اہمیت کا حامل ہے جو عمل کے ساتھ ہو، ذمہ داری کے ساتھ ہو، عہد و پیمان کے ساتھ ہو۔

اگر آپ کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے تو اپنے مومن ہونے پر شک کریں۔ جو معاشرہ اپنی ایمانی ذمہ داریوں پر عمل نہیں کرتا، وہ اپنا نام با ایمان معاشرہ نہ رکھے۔ جن لوگوں نے قرآن سے یہ سنا ہے کہ: ﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾[1] سست نہ پڑو، غمگین نہ ہو، اگر مومن ہو گے تو سب سے برتر ہو گے۔ جن لوگوں نے قرآن کی یہ عجیب بات سنی، جب وہ حقیقت کی طرف نگاہ کرتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ قرآن پر ایمان رکھنے والے سب سے برتر نہیں ہیں، بلکہ ہر غیر کے مرہونِ منت ہیں تو تعجب کرتے ہیں کہ قرآن کا یہ وعدہ کیا ہوا؟ اور اگر کسی زمانے میں اس وعدے کو پورا ہوتے نہیں دیکھتے تو ولی عصرؑ کے ظہور کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کو بھی یہ سمجھانا ہو گا کہ ہاں، وعدۂ الٰہی بر حق ہے، مہدی موعودؑ کے دور ظہور میں بھی اور ہر اس جگہ پر بھی جہاں ایمان پیدا ہو جائے۔ لیکن وہ ایمان جسے قرآن عمل کے ہمراہ جانتا ہے، وہ ایمان جسے عہد و پیمان سے جدا نہیں سمجھتا، کہ صرف ایک امرِ قلبی ہو۔

بنابریں جو ایمان اسلام میں معتبر ہے (یہ بات اسلام اور تشیع کے اعتقادی اصولوں میں سے ہے) وہ عمل کی طرف دعوت دینے اور ذمہ داری پیدا کرنے والا ایمان ہے، وہ ایمان ہے جو عملی عہد و پیمان کے ساتھ ہو، اگر عمل ساتھ نہ ہو، تو اس کے نتائج کی توقع بھی نہ رکھیں، دنیا میں نصرت کے منتظر بھی نہ رہیں، دنیا میں امن و امان کی بھی توقع نہ رکھیں۔ ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ﴾[2]

﴿الَّذِينَ آمَنُوا﴾ جو لوگ ایمان لائے، ﴿وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ﴾ ستم اور ستمگری سے اپنے ایمان کو آلودہ نہیں کیا، ﴿أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ﴾ امن و امان ان لوگوں کے لیے ہے۔ وہ ایمان جو ظلم و ستم کے ساتھ ہو، تحفظ نہیں دیتا۔ وہ ایمان جس کے ساتھ عہد و پیمان نہ ہو، مومن کو نصرت نہیں دیتا، اس کی کامیابی کی ضمانت نہیں دیتا، اس کے لیے یہ ایمان خدا کی نصرت اور فطرت (nature) اور تکوین کے ذرات کی مدد لے کر نہیں آتا، دنیا کی خوشبختی اور کامیابی اور غرض دنیا اور آخرت کی جنت اس کے حوالے نہیں کرتا۔

---

۱. سورہ مبارکہ آل عمران: آیت ۱۳۹۔ اے مسلمانو! کمزوری نہ دکھاؤ اور غمگین نہ ہو، اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب و برتر ہو گے۔

۲. سورہ مبارکہ انعام: آیت ۸۲۔ جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا انہی کے لیے امن و امان ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

آرام طلبی سے پیدا ہونے والے اوہام، ہمارے اندر اس کے برعکس تلقین کرتے ہیں۔ یہ ایک صفت ہے انسان کے اندر کہ وہ ہمیشہ آسان کام انجام دینے کی طرف جاتا ہے۔ انسان کے اندر سہولت طلبی اور سہل پسندی کی صفت پائی جاتی ہے۔ دو کاموں کے اندر اگر اسے اختیار دیا جائے تو جو زیادہ آسان ہو گا، جس میں کم محنت کرنی پڑے گی، کم سرمایہ لگانا ہو گا، اسی کا انتخاب کرے گا۔ یہ انسان کی خاصیت ہے، عام طور پر انسان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ صفت، یہ انسانی خصلت، یہ خصوصیت ہم سے کہتی ہے کہ اس کام کو قبول کرو جو زیادہ آسان ہو، جس میں خرچ کم ہو، جس میں محنت زیادہ نہ ہو۔ دوسری طرف سے مذہبی ایمان ہم سے کہتا ہے کہ جنت ہاتھ سے گئی۔ اس لیے کہ سہل پسندی بھی باقی رہے اور جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے، اس کے لیے ہمیں بیٹھ کر کوئی فارمولا بنانا ہو گا، ایسے فارمولے جو بے کار اور سست آدمی کو جنت تک پہنچا سکیں۔

ہم سستی کے ساتھ، ہاتھ پر ہاتھ دھر کر، ماضی اور مستقبل کے لیے بے غیرتی کے ساتھ غم خواری کر کے (غم خواری اچھی چیز ہے، لیکن ایسی غم خواری جو بے غیرتی کے ساتھ نہ ہو) ہم اس منفی، پست اور فضول حالت کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں شفاعت کی امید میں، حالانکہ خود امامؑ فرماتے ہیں کہ ہماری شفاعت ان لوگوں کو پہنچے گی جو جدوجہد اور کوشش کریں۔ بالکل اس کے برعکس ہے جو ہمارے ذہنوں میں ہے۔

میں اس مسئلے پر اتنی تاکید کیوں کر رہا ہوں؟ اس لیے کہ مسلمانوں کے ذہنوں پر کئی برسوں تک کام ہوا ہے، کئی صدیوں تک کام ہوا ہے تاکہ ان کو مطمئن کردیں کہ مسلمانوں کے لیے عمل کرنا ضروری نہیں ہے، تاکہ انہیں سمجھا دیں کہ مومن ہونے کے لیے، ایک پاک دل کی ضرورت ہے، نہ کہ پاک عمل کی۔ ان خیانت کاروں اور ایجنٹوں کی مدد ہماری سہل پسندی نے، ہماری بلند پرواز سوچوں نے کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اللہ کی جنت ہمیں ایک چھوٹے سے کام پر دے دی جائے۔ اور اس غلط خیال کی مدد ان جاہلوں کی جہالت نے کی ہے، جن کا کوئی مفاد اور مقصد بھی نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ جاہل تھے۔

بہر حال کئی سالوں سے، طویل عرصے سے ذہنوں پر کام کر رہے ہیں یہ کہنے کے لیے کہ اسلام عمل کے بغیر، ایمان عمل کے بغیر، صرف دل میں محبت، ایمان اور یقین رکھنے سے ہے نہ کہ عمل، حرکت،

کوشش اور اثر سے۔ اس کے لیے برسوں سے کوشش کر رہے ہیں کہ یہ بات ہمیں سمجھا دیں۔ اور قرآن کی آواز ابھی تک بلند، زندہ و شاداب ہے کہ ﴿وَمَا أُولَـٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ﴾[1] وہ لوگ جو یہ کام نہیں کرتے، مومن نہیں ہیں، ایمان نہیں رکھتے۔ وہ لوگ مومن ہیں، وہ لوگ تمہارے ساتھ ہیں، وہ لوگ لطف خدا، برادری اور دینداری میں شامل ہیں جو راہ خدا میں، ایمان کے مطابق، عہد و پیمان کے ساتھ حرکت کریں، محنت کریں، کام کریں۔ یہ قرآن کی منطق ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان کی جانب مائل ہوئے ہو، ﴿ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا﴾ رکوع کرو، سجود کرو، خدا کے سامنے خضوع کرو، ﴿وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ﴾ بندگی کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو، ﴿وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ نیک کام انجام دو، ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾[2] شاید کامیاب ہو جاؤ، رستگار ہو جاؤ۔ اگر اس کام کو انجام دو گے تو فلاح اور کامیابی اور فتح و کامرانی ہے۔ لیکن اگر ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ ہو، ﴿ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ نہ ہو، تو کیا فلاح و کامیابی ہے؟ اس کا جواب آپ کے ذمے ہے۔

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهِ﴾ خدا کی راہ میں جہاد کرو، ﴿حَقَّ جِهَادِهِ﴾ جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں کمانے کے لیے تم لوگ کتنا کام کرتے ہو؟ کتنی جدوجہد کرتے ہو؟ اب آپ اس نسبت سے دیکھیں کہ خدا کے لیے کتنی جدوجہد کرتے ہو۔

اگر صحیح طور پر دیکھیں تو وہ کوشش جو خدا کی راہ میں انجام دینی چاہیے، اس کا حجم، اس کی کیفیت، اس کی گہرائی اور اس کی پائیداری، خود خدا کی عظمت و بڑائی کی نسبت تمام کوششوں سے بڑھ کر، سب سے زیادہ پائیدار اور انتھک ہونی چاہیے۔

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ﴾ وہ ہے جس نے تمہیں منتخب اور برگزیدہ کیا ہے اے ملت اسلام! برگزیدہ کرنے کا مطلب کیا ہے؟ یعنی آپ لوگوں کو ناز و نعم کے ساتھ دوسروں سے ممتاز کیا ہے، کہا ہے کہ یہ غیر معمولی لوگ ہیں، گناہ کریں، غلطیاں کریں، ہماری نافرمانی کریں تو بھی جنت انہی کے لیے ہے؟ یہ وہ بات ہے جس کا یہودی بھی اپنے لیے دعویٰ کرتے تھے۔ وہ غلطی پر تھے، جو مسلمان اس طرح سوچے، وہ بھی غلطی پر ہے۔ قرآن یہودیوں (جو سمجھتے تھے کہ وہ خدا کے احبّا، اولیاء

---

۱. سورہ مبارکہ نور: آیت ۴۷۔ اور ایسے لوگ (ہرگز) مومن نہیں ہیں۔

۲. سورہ مبارکہ حج: آیات ۷۷ اور ۷۸

اور دوست بلکہ اس کی اولاد ہیں) کے مقابلے میں بہت ملامت اور توہین آمیز لہجے میں اعلان کرتا ہے کہ یہ دوستی، یہ ولایت، یہ سب کچھ اس بات کا مرہون منت ہے کہ حکم خدا پر عمل کرو۔ درست ہے کہ ہم نے تمہیں ممتاز قرار دیا ہے، تم سے پہلے بنی اسرائیل کو بھی ممتاز کیا تھا۔ خدا نے امت اسلام کا انتخاب کیا ہے، لیکن اسلام سے پہلے بنی اسرائیل کا بھی انتخاب کیا تھا، دونوں منتخب کرنا ایک ہی قسم کے ہیں۔ اس کے معنی سب سے بڑے کام کے لیے سب سے زیادہ آمادہ فرد کے انتخاب کے ہیں۔

آپ دس افراد پر نظر ڈالتے ہیں، دیکھتے ہیں کہ اس میں سے ایک شخص کا چہرہ پر عزم، بدن مضبوط، رخساروں کا رنگ کھلا ہوا، ہاتھ مضبوط، بازو اور سینہ کشادہ اور نمایاں ہے، آپ کہتے ہیں کہ یہ بھاری بوجھ آپ کو اٹھانا ہے، میں نے آپ کو اس کام کے لیے منتخب کیا ہے؛ یہ بھی آگے بڑھ جاتا ہے اور اگر اٹھا لیتا ہے، اگر وہ یہ کام کر لیتا ہے، یعنی ارادہ کر لیتا ہے (کر تو سکتا ہی تھا جبھی تو منتخب ہوا)، عزمِ مصمم کر کے اس بوجھ کو اٹھا لیتا ہے تو اس وقت وہ اپنے ساتھیوں سے بلند ہو جائے گا، ایک نمایاں شخص بن جائے گا۔ اگر نہ اٹھایا تو؟ اگر نہ اٹھایا تو، دوسروں سے بڑھ کر شکست خوردہ اور بد نصیب ہو جائے گا۔ اس سے کہا جائے گا اے بد بخت انسان! دوسرے تو کر نہیں سکتے تھے، اسی لیے ان سے کہا بھی نہیں، لیکن تم نے قبول کیا اسی لیے تم سے کہا اور تم نے نہیں کیا۔ امت مسلمہ کا انتخاب امت بنی اسرائیل کی طرح، اسی انداز کا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے زمانے میں اور امت مسلمہ اپنے زمانے میں، اسلام کی امانت اور انسان کی ہدایت و رہبری کا بوجھ اٹھانے کے لیے، لائق ترین امت و افراد تھے۔ اسی لیے انہیں یہ بار امانت دیا گیا۔ کیا انہوں نے اٹھایا یا نہیں؟ اگر اٹھا لیا، اس بار امانت کو منزل تک پہنچادیا، تو یقینا مسلمان ممتاز ترین اور لائق ترین افراد ہیں، لیکن اگر نہیں کیا تو؟ اگر نہیں اٹھایا تو وہی کیفیت ہے جو یہودیوں نے بار امانت نہ اٹھا کر اپنا لی تھی: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللهِ﴾[1] یہ ان کی دنیا کے لیے اور «مَأْوَاهُ جَهَنَّمُ» یہ ان کی آخرت کے لیے۔

﴿هُوَ اجْتَبَاكُمْ﴾ اس نے تمہیں ممتاز کیا ہے، انتخاب کیا ہے اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے، ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ دین میں تم پر سختی، دباؤ اور صعوبت بھی نہیں رکھی ہے، دباؤ نہیں ہے۔ یہ بوجھ اتنا بھی وزنی نہیں ہے، اس کو اٹھانا اتنا بھی مشقت اور تکلیف کا باعث نہیں ہے، قابل برداشت

۱۔ سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۶۱۔ ذلت و ناداری کی مہر ان پر لگا دی گئی اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہوئے۔

ہے۔ ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ دین کے کام میں تم پر کوئی حرج، کوئی صعوبت، کوئی دباؤ نہیں رکھا ہے، ﴿مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ﴾ یہ وہی تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے، ﴿هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا﴾ س نے تمہیں پہلے بھی اور اس مرتبہ بھی مسلمان اور خدا کے سامنے تسلیم ہونے والا کہا ہے۔ ﴿وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾[1] یہ سورۂ بقرہ میں جناب ابراہیمؑ کی دعا ہے، اسی مقام کی جانب اشارہ ہے۔ ﴿هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا﴾ اس بوجھ کو تمہارے حوالے کیا، اس انتخاب کو تمہارے لیے عمل میں لائے، کیوں؟ کیا کرنے کے لیے؟ تاکہ تم کیا کرو اور کہاں پہنچو؟

﴿لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ تمہارے براہ راست ذمہ دار پیغمبر ہیں اور پوری انسانیت کے ذمہ دار تم ہو، تاکہ پیغمبر تمہارے اوپر گواہ، نگرانی کرنے اور نگاہ رکھنے والے ہوں۔ تم لوگ انسانوں کے حکمران ہو، تم بشریت کی تدبیر کرنے والے ہو، تم اس قافلے کی نگرانی کرنے والے ہو۔ اے قافلہ سالارو! سوتے نہ رہ جانا۔

اب جب کہ تمہاری ذمہ داری زیادہ ہے، اب جب کہ تم پر پروردگار کی جانب سے دشوار ذمہ داری لگا دی گئی ہے، تم نمائندہ بنا دیئے گئے ہو ﴿فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾ پس نماز قائم کرو، پھر ذمہ داری، پھر عہد و پیمان یا خشک و خالی ایمان؟! ﴿وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ اور زکاۃ دو، ﴿وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ﴾ اور توسل اختیار کرو خدا سے اور آئین الٰہی سے، خدا کی پناہ لو، خدا پر بھروسہ کرو، کسی اور سے، کسی طاقت سے نہ گھبراؤ۔ جب تم پر سارے دروازے بند ہوجائیں، تو خدا کے لطف، مدد اور نصرت سے مایوس نہ ہونا۔ ﴿هُوَ مَوْلَاكُمْ﴾ خدا سرپرست، نگہبان اور تمہارے ساتھ ہے۔ ﴿فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ﴾ کتنا اچھا مولا ہے، کتنا اچھا مددگار ہے پروردگار۔ سورۂ انفال کے آخر کی چند اور آیتیں بھی ہیں۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾[2] بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے، ﴿وَهَاجَرُوا﴾ اور ہجرت کی۔ ہجرت کرنے کا کیا مطلب ہے؟ یعنی مثلاً مشہد سے تہران چلے گئے اور ٹھہر گئے؟ ایک شہر سے دوسرے شہر ہجرت کر لی اور بس؟ نہیں، پہلی بات تو یہ کہ ہجرت کرنے کا مطلب ہدف کی خاطر، اسلامی معاشرے سے ملحق ہونے کی خاطر، اسلامی معاشرے کے اجتماع میں ذمہ داری کو قبول کرنے کی خاطر، دفعتاً (ایک ہی دفعہ

---

۱. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۱۲۸

۲. سورہ مبارکہ انفال: آیت ۷۲

میں) ہر چیز سے ہاتھ دھو لینا شمار ہوتا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ ہجرت یعنی اسلامی معاشرے کا عظیم محل تعمیر کرنے کے لیے ایک اینٹ لے جانا۔

جو اسلامی معاشرہ مدینہ میں وجود میں آیا تھا، اسے با ایمان، فعال، زحمت کش، مضبوط اور طاقتور، شاندار ماضی کے حامل، اسلام کو سمجھنے والے، اس راہ سے محبت اور عقیدت رکھنے والے، ایمان سے سرشار دل رکھنے والے افراد کی ضرورت تھی۔ جو شخص مکہ سے ہجرت کرتا تھا، وہ انس، محبت، خوبصورت یادوں، آرام، عیش و نوش کو چھوڑ کر مدینہ آجاتا تھا۔ مکہ سے مدینہ تک، در حقیقت یہ شخص اس عظیم معاشرہ کی تعمیر کی راہ میں، اپنی حد تک، اپنے اعتبار سے ایک بڑا قدم اٹھاتا تھا۔ لہٰذا اس کی ایک اہمیت ہوتی تھی، وہ فیصلہ کن ہوتا تھا۔ آئیے دیکھیے یہ آیات کیا کہتی ہیں؟

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے ﴿وَهَاجَرُوا﴾ اور ہجرت بھی کی، ﴿وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللهِ﴾ اور اپنے مال سے، اپنی جانوں سے، خدا کی راہ میں جہاد کیا، ﴿وَالَّذِينَ آوَوْا﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے ان بے وطن غریبوں اور گھر سے بے گھر ہوجانے والوں کو پناہ دی، ﴿وَنَصَرُوا﴾ اور ان کی مدد کی، یہ سب ﴿أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک محاذ کے سپاہی ہیں۔ ان سب کا خمیر ایک ہے، یہ لوگ ایک ہی دیوار اور ایک ہی چھت کی کچی پکی اینٹیں ہیں۔ «مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِيمَا بَيْنَهُمْ كَمَثَلِ الْبُنْيَانِ يُمْسِكُ بَعْضُهُ بَعْضاً»[۱] ان اینٹوں کو دیکھا ہے کہ کس طرح سے ایک دوسرے کے اندر اتری ہوئی سی ہوتی ہیں، چھتوں کی ان ضربیوں[۲] میں، ہر اینٹ ایک مومن ہے، ہر مومن ایک اینٹ کی مانند ہے ایک دوسرے کے اندر پیوست جس نے دوسری دسیوں اینٹوں کو بھی محفوظ رکھا ہوا ہے۔ ایک ضربی چھت کی کسی ایک اینٹ کو کوشش کر کے کھینچ لو، تو اس کے اطراف کی دسیوں اینٹیں بھی گر جائیں گی، یہ ایک ان دسیوں کو سنبھالے ہوئی تھی، جیسا کہ وہ باقی سب بھی اپنے اپنے طور پر اس اینٹ کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ ﴿بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ بعض دوسرے بعض کے ساتھ باہم پیوست ہیں۔

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ یہاں پر غور کیجیے، تو وہ لوگ جو ایمان لائے، قلبی یقین بھی ہے، لیکن ﴿وَلَمْ يُهَاجِرُوا﴾

---

۱. عوالی اللئالی، باب الاول فی احادیث المتعلق بابواب الفقہ، المسلک الثانی، حدیث ۱۰۷

۲. ایک قسم کا محدب طاق جس میں اینٹیں چوڑائی کی حالت میں جوڑی جاتی ہیں۔

سایہ دار درختوں کے جھرمٹ میں آرام دہ گھر سے وابستگی ختم نہ کی اور ہجرت نہ کی (البتہ وہاں کے گھر سایہ دار درخت والے بھی نہ تھے) ﴿وَلَمْ يُهَاجِرُوا﴾ ایمان تو لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی، اپنی ایمانی ذمہ داری پر عمل نہیں کیا، یہ کس طرح کے لوگ ہیں؟ ان کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ: ﴿مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا﴾ یہ تم سے جڑے ہوئے نہیں ہیں، تمہارا حصہ نہیں ہیں، تمہارے اور ان کے درمیان ولایت اور وابستگی نہیں ہے، کب تک؟ ﴿حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا﴾ جب تک ایمانی ذمہ داری پر عمل نہ کریں۔ بھائی! خشک اور خالی ایمان تو دنیا میں بھی اثر نہیں دکھاتا، اسلامی معاشرے میں بھی کسی اثر کی بنیاد نہیں بنتا، آخرت کی تو بات ہی اور ہے۔ ﴿مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا﴾۔ ایک دو آیات کے بعد فرماتا ہے کہ ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾[1] جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا، ﴿وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا﴾ اور وہ لوگ کہ جنھوں نے پناہ دی اور نصرت کی، ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ وہی حقیقی مومن ہیں، ان کے علاوہ دوسرے کیا ہیں؟ جھوٹے مومن۔

---

۱. سورہ مبارکہ انفال: آیت ۷۴

پانچویں نشست

ایمان اور عہد و پیمان پر عمل

٦ رمضان المبارک ١٣٩٤ ہجری

١٩٧٤-٠٩-٢٣

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۞ وَمَن يُطِعِ اللهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ (سورہ نور/٥١-٥٢)

ایمان کے بارے میں بحث کے دوران (جو کہ اسلام کی فکری شناخت کے سلسلے کی ابتدائی‌ترین بحثوں میں سے ایک بحث ہے کہ جسے بیان کرنا چاہیے اور بیان کیا گیا) ہم اس نتیجے تک پہنچے تھے کہ ایمان اس وقت ایمان ہے جب اس کے ساتھ احساس ذمہ داری ہو، اگر ایمان کے ساتھ احساس ذمہ داری نہ ہو، فرض شناسی نہ ہو، خدا کے ساتھ کیے ہوئے عہد و پیمان پر عمل نہ ہو اور قرآن کریم کے الفاظ میں ایمان کے ساتھ عمل صالح نہ ہو تو ایسا ایمان، ایمان نہیں ہے اس لئے کہ ایمان کے آثار خشک، خالی اور صرف ذہنی ایمان پر مرتّب نہیں ہوتے؛ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی مدّ ِنظر رہے کہ یہ احساس ذمہ داری اور فرض شناسی دائمی، ہمیشگی اور سب کے لیے ہے۔

جو شخص مومن ہے اور مومن رہنا چاہتا ہے، ایمان کے ثمرات سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ تمام الٰہی احکام کے مقابلے میں احساس ذمہ داری کرے اور ہر وقت اور ہر جگہ فرض شناسی کا مظاہرہ کرے۔ جس شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا اور نبوت و رسالت پر ایمان، ذمہ داری لاتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ سب خدا کے بندے بن جائیں اور جہاں تک ہو سکے میں سب کو خدا کا بندہ بناؤں۔ پیغمبر خداؐ پر ایمان اور آپؐ کی رسالت کا اقرار و اعتراف میری گردن

پر یہ ذمہ داری ڈالتا ہے کہ آپؐ کے نقش قدم پر چلوں اور آپ کے دکھائے ہوئے راستے پر حرکت کروں۔ اگر میں اس معنی میں آپؐ کی رسالت کا اقرار و اعتراف کرتا ہوں، اس اقرار کے نتیجے میں اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں تو پھر ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ جہاں ایک معمولی مسئلے میں پیغمبر اسلامؐ کی سنت اور روش کی مخالفت ہو رہی ہو تو وہاں تو میری رگِ حمیت پھڑک اٹھے اور میں اپنے غم و غصے کا اظہار کروں اور اپنے سچے مسلمان ہونے کا مظاہرہ کروں، لیکن جب ایک بڑے اور حساس مسئلے میں حضورؐ کی عملی سیرت کی مخالفت ہو رہی ہو تو وہاں میں اپنی ذمہ داری کو یکسر بھلا دوں۔ بقول شاعر:

أسد علی وفی الحروب نعامة[1]

کہ تو کمزور اور نچلی سطح کے لوگوں کے سامنے تو شیر کی طرح گرجتا ہے لیکن بڑی سطح کے بروں یا دوسروں کو برا بنانے والے بروں کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا ہے۔ أسد علی وفی الحروب نعامة؛ یہ ایک عربی شعر ہے جو کہ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

جب ہمارے سامنے آتے ہیں تو شیر کی طرح ہوتے ہیں لیکن جب جنگوں میں سر تا پا مسلّح دشمنوں کے سامنے جاتے ہیں تو شتر مرغ بن جاتے ہیں۔ بھلا شتر مرغ کسی کے ساتھ جنگ کرتا ہے؟ کیا شتر مرغ کے تیز پنجے اور نوکیلے دانت ہوتے ہیں کہ وہ لڑائی کرے؟

ذمہ داری فصلی نہیں ہے، موسمی نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ ایک وقت ہو اور دوسرے وقت نہ ہو، ایک شخص کی نسبت ہو اور دوسرے شخص کی نسبت نہ ہو بلکہ ذمہ داری عمومی، زمان و مکان سے ماورا اور دائمی ہے۔ قرآن کریم کچھ یہودیوں کا تذکرہ کرتا ہے جو ایک وقت یہ کہتے تھے کہ ہمارے بھائی (یعنی دوسرے یہودی) ہمارے اپنے عزیزوں کی طرح محفوظ رہیں؛ لیکن جب ان کے ذاتی مفادات سامنے آتے تھے تو یہی یہودی ان بھائیوں کو جنگوں میں قتل کرتے تھے، انہیں قیدی بناتے تھے اور انہیں فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم سے عیاشی کرتے تھے۔ قرآن کریم بنی اسرائیل کی سرزنش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ﴾[2]

---

۱. أسد علی وفی الحروب نعامة. ربداء تجفل من صفیر الصافر. کہ میرے مقابلے میں تو تم شیر کی طرح ہو جبکہ جنگوں میں اس خاکستری شتر مرغ کی طرح ہو جو سیٹی بجانے والے کی آواز سن کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

۲. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۸۵

کیا تم دین کے کچھ حصوں پر ایمان رکھتے ہو، جہاں کوئی پریشانی نہ ہو وہاں ایماندار اور ذمہ دار بن جاتے ہو اور بقیہ دین پر ایمان نہیں رکھتے؟ اعتقاد نہیں رکھتے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا ایک ہی ذات سے صادر ہونے والے دو اقوال اور احکام و فرامین کے درمیان تفریق کی جا سکتی ہے؟

ہمارے عظیم الشان امام، حضرت امام محمد باقرؑ اس مشہور و معروف حدیث میں جو کہ جہاں تک مجھے یاد آرہا ہے، کتاب شریف «وافی» میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب کی پہلی حدیث ہے چونکہ میں نے کئی سال پہلے دیکھی تھی (البتہ یہ حدیث «کافی» میں بھی ہے[1]، دوسری شیعہ معتبر کتابوں میں بھی ہے لیکن میں «وافی» سے نقل کر رہا ہوں جو کہ ہماری کتب اربعہ کی جامع کتاب ہے اور جسے مرحوم فیض کاشانی[2] نے تالیف فرمایا ہے) اس حدیث میں امامؑ اسی قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو نماز اور روزے جیسی عبادات پر تو بہت توجہ دیتے ہیں جو کہ کم خرچ بھی ہیں (جن پر زیادہ وقت بھی نہیں لگتا)، جن میں کوئی خاص مشکل بھی پیش نہیں آتی لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کہ بظاہر جن کا دردِ سر بھی زیادہ ہے اور جن میں نقصان کا اندیشہ بھی ہے، توجہ نہیں دیتے۔ یہاں پر امامؑ یہ نہیں فرماتے کہ یہ لوگ مومن ہیں یا مومن نہیں ہیں، فاسق ہیں یا منافق، لیکن قرآن کریم کی آیت صراحت کے ساتھ فرما رہی ہے کہ وہ لوگ مومن نہیں ہیں جو وہاں پر دین کو نہیں چاہتے جہاں دین ان کے مفادات کے آڑے آرہا ہو۔

معاویہ بن ابوسفیان جہاں ضروری سمجھتا ہے قرآن کو بھی نیزوں پر بلند کرتا ہے جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں اور یہ داستان آپ کی سنی ہوئی ہے۔ جہاں مفادات ہوں وہاں قرآن، نماز اور دین کی باتیں بھی کرتا ہے، جہاں ایک محبِ علیؑ کے دل کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہے وہاں امیر المومنین کے فضائل بھی بیان کرتا ہے، جب امام علیؑ کے فضائل پڑھے جائیں تو مگرمچھ کے آنسو بھی بہاتا ہے۔ آپ نے کئی بار یہ واقعہ سنا ہوگا کہ ایک دن معاویہ بیٹھا ہوا تھا عبداللہ بن عباس بھی تھے دوسرے لوگ بھی

---

۱. کافی، کتاب الجہاد، باب الامر بالمعروف و النھی عن المنکر، حدیث ۱

۲. محمد کاشانی (۱۰۹۱-۱۰۰۷ ھ ق) المعروف ملا محسن فیض کاشانی، فقیہ، محدث، متکلم اور مشہور فلسفی تھے۔ آپ نے ملا محمد تقی مجلسی، شیخ بہائی، میر داماد، میر فندرسکی اور معروف فلسفی ملا صدرا جیسے اساتید سے کسب فیض کیا۔ حج سے واپسی پر اور ملا صدرا کے «کہک» چلے جانے کے بعد آپ بھی وہاں چلے گئے اور اپنے استاد کی خدمت میں رہے۔ ملاصدرا کی وفات کے بعد ملا محسن کاشان واپس آگئے اور تعلیم و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ آپ کے علمی آثار میں تفسیر صافی، کتاب وافی، علم الیقین فی اصول الدین اور محجۃ البیضاء کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

بیٹھے ہوئے تھے۔ معاویہ نے ایک شخص سے کہا کہ اے فلاں بن فلاں! علیؑ کے فضائل کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ اس نے کہا: جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ معاویہ نے کہا: تو امان میں ہے۔ اس کے بعد اس شخص نے امام علیؑ کے فضائل پڑھنا شروع کیے اور معاویہ نے بھی بلند آواز سے گریہ کرنا شروع کر دیا۔[1] جہاں ضروری ہو معاویہ علیؑ کی محبت کا دم بھی بھرتا ہے، جہاں ضروری ہو اپنے آپ کو خدا کا خاص بندہ بھی ظاہر کرتا ہے، جہاں مجبور ہو کہ مٹھی بھر مسلمانوں پر حکومت کرنے کے لیے ان کے جذبات کا خیال رکھے، ان کے احساسات کو مجروح نہ کرے تو ان کے محبوب و معشوق یعنی قرآن و اسلام کا بھی دم بھرتا ہے۔

یہ وہ مقامات ہیں کہ جہاں پر دین اس کے فائدے میں ہے، اس کے ذاتی مفادات اور نفسانی خواہشات کے مطابق ہے۔ لیکن جہاں پر دین اور احکام دین کی پابندی اس کے نقصان میں ہو وہاں دین کو بھول جاتا ہے۔ جہاں عدالت کا مسئلہ پیش آتا ہے، اجتماعی عدالت کی رعایت، مظلوم و محروم طبقے کے حقوق کی مراعات، اپنے پرائے کے درمیان مساوات (یہ باتیں دین کی باتیں ہیں، اسلام کی باتیں ہیں)، لوگوں کی فکری سطح کو بلند کرنا جو کہ بعثت اور نبوت و رسالت کا اصلی ہدف و مقصد ہے، جب ان چیزوں کی بات ہوتی ہے تو معاویہ دین کے بارے میں لاعلم ہو جاتا ہے اور دین کے مقابلے میں ذمہ داری کا احساس نہیں کرتا۔

یہ دین جو کہتا ہے کہ اس کا رسولؐ لوگوں کی تعلیم و تربیت کیلیے مبعوث کیا گیا ہے ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾[2] رسول اکرمؐ کو خدا نے بشریت کے لیے بھیجا ہے تاکہ انسانوں کو تعلیم دے، انہیں شاہراہِ ترقی پہ گامزن کرے، ان کی عقل و فکر کو تیز اور قوی کرے۔ دین ہر اس چیز کے خلاف جنگ کرتا ہے جو لوگوں کی عقل کے خلاف جنگ کرتی ہے۔ جو چیز بھی انسانوں کی چشمِ بصیرت اور عقل و فہم و ادراک کے سامنے سدّ راہ بنتی ہے، دین اس کے خلاف جنگ کرتا ہے اور اس کا راستہ روکتا ہے۔ ہر وہ عامل جو کسی بھی صورت میں انسانوں کو سوچنے، سمجھنے اور ادراک کرنے سے روکتا ہے، دین اس عامل کو زندہ نہیں

---

۱. بحار الانوار، کتاب الفتن و المحن، ابواب ماجری بعد قتل عثمان، باب نوادر الاحتجاج علی المعاویہ

۲. سورہ مبارکہ آل عمران: آیت ۱۶۴

چھوڑتا اور راستے سے ہٹا دیتا ہے۔

دین یہ ہے، وہ دین جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ افیون ہے، نشہ ہے، وہ کوئی اور چیز ہے۔ ہمارے قرآن میں اس دین کی کوئی علامتیں اور نشانیاں نہیں ہیں۔ ہمارے پیغمبرؐ کے عمل اور ہمارے معصوم پیشواؤں کی سیرت میں ایسے دین کی کوئی نشانی نہیں پائی جاتی۔ اسلام جہاں کفر کے خلاف جنگ کرتا ہے ایسے دین کے خلاف بھی جنگ کرتا ہے۔ اسلام کے عظیم پیشوا امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

خدا نے انبیا کو بھیجا تاکہ انسانوں کے اندر چھپے عقل و خرد کے خزینوں کو ابھارے اور آشکار کرے «وَ یُثِیرُوا لَهُمْ دَفَائِنَ الْعُقُولِ»[1]؛ پس ہر وہ چیز جو ان خزینوں اور دفینوں کو مخفی کرے، چھپادے، دفن کر دے، انسانوں کی عقل و فکر کو منوں مٹی یا بے جا تعصبات، باطل افکار اور گھٹن وغیرہ کے بوجھ تلے دفن کردے اور چھپادے، ہر وہ عامل جو اس طرح کا ہو، وہ انبیا کی بعثت کے فلسفے کے خلاف ہے؛ اس میں کوئی فرق نہیں وہ جو بھی ہو اور جس زمانے میں بھی ہو۔

نبوت و رسالت لوگوں کی عقل اور فکر کے ساتھ سروکار رکھتی ہیں، یہ عقل اور فکر جتنی دقیق تر ہو گی، نبوت و رسالت اسی قدر قابل قبول تر ہوں گی۔ انبیا کوشش کرتے ہیں کہ ان افکار کو اوپر لے کر آئیں۔ جو کوئی بھی، جو عامل بھی، جو طاقت بھی، چاہے وہ انسان کے وجود کے اندر ہو یا اس کے وجود کے باہر، اگر وہ انسان کی فکر اور عقل و خرد کی رشد و ترقی و نشو ونما کے سامنے سدّ راہ بنے اور انسانوں کو اپنی عقل و فکر کی روشنی میں صحیح راستے کی تشخیص نہ کرنے دے اور آزادی سے اس راستے پر نہ چلنے دے تو وہ دین کے خلاف ہے اور معاویہ اسی طرح تھا۔ جہاں لوگوں کے افکار کو روشن کرنے کا مسئلہ پیش آتا ہے تو وہاں معاویہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ اسلام کیا ہے۔ جہاں اسلام اسے حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو غربت و افلاس اور بھوک سے نجات دلائے، معاشرے میں پائے جانے والے طبقاتی فرق کو ختم کرے، تفریق رَوا نہ رکھے، بے ضمیر اور ظالموں کو لوگوں پر مسلط نہ کرے، اپنے مشیروں، دوستوں اور قریبیوں کو ظالم‌ترین افراد میں سے انتخاب نہ کرے، لوگوں کو جہنم کی طرف نہ لے جائے اور انہیں دنیا و آخرت کے عذاب میں مبتلا نہ کرے، لوگوں کو آزادی کے ساتھ حقائق کو سمجھنے کا موقع دے اور ان پر دباؤ نہ ڈالے، جب اس طرح کی باتیں درمیان میں آتی تھیں تو پھر معاویہ اسلام سے

---

۱. نہج البلاغہ، خطبہ ۱

کوسوں دور ہوجاتا تھا۔

ابن عباس سے کہتا ہے کہ اے ابن عباس! قرآن نہ پڑھو۔ اس نے کہا کہ کیسے قرآن نہ پڑھوں؟ کہا کہ ٹھیک ہے قرآن پڑھو لیکن اس کی تفسیر نہ کرو۔ اس نے کہا کہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن پڑھوں لیکن اس کی تفسیر نہ کروں؟ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ معاویہ نے محسوس کیا کہ غلط بات کہی ہے (اس زمانے میں لوگوں کی نظروں میں یہ بات صحیح نہ تھی کہ قرآن پڑھیں لیکن اس کی تفسیر نہ کریں) اس نے کہا کہ ٹھیک ہے تفسیر کرو لیکن جو تفسیر تمہارے اپنے خاندان اور امیر المومنینؑ کے ذریعے پہنچی ہے وہ تفسیر لوگوں کے سامنے بیان نہ کرو۔[1] معاویہ نہیں چاہتا کہ لوگ قرآن کو سمجھیں بلکہ بنیادی طور پر نہیں چاہتا کہ لوگ کسی چیز کو بھی سمجھیں، اس لیے کہ لوگ جتنا کم سمجھتے یہ چیز معاویہ کے فائدے میں تھی۔

یہاں ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ آپ نے غور کیا؟ ہم معاویہ جیسے آدمی، قاضی شریح جیسے آدمی، مغیرہ جیسے شخص یا معاویہ کے زمانے میں زید بن عمرو جیسے شخص کے بارے میں جب فیصلہ کرنا چاہیں تو کیسے فیصلہ کریں؟ ایک ایسا شخص جس نے بعض مسائل میں تو دین کو، ایمان کو دل و جان سے قبول کیا ہے لیکن بعض دوسرے مسائل میں اس کی زندگی میں دین و ایمان کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا تو ہم ایسے شخص کو کیا کہیں؟ کیا اسے مومن سمجھیں؟ قرآن واضح طور پر سمجھا رہا ہے کہ ایسا شخص مومن نہیں ہے۔ پس اسلامی طرز تفکر میں جو ایمان معتبر ہے وہ اس طرح کے لوگوں کا ایمان نہیں ہے (اور ہمارے زمانے میں اس قسم کے لوگ بہت زیادہ پائے جاتے ہیں) بلکہ ان افراد کا مضبوط ایمان ہے جو ہر جگہ، ہر ایک کے ساتھ، ہر زمانے میں اور ہر صورت میں محفوظ رہتا ہے، اپنی ذمہ داری کے ساتھ، اپنے عمل کے ساتھ، ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ آیت کے آخر تک۔

مومنین کو ایمان پر جو وعدے بھی دیے گئے ہیں وہ اِس ایمان پر ہیں نہ کہ اُس ایمان پر۔ اگر کہا گیا ہے کہ مومنین کامیاب ہیں تو اِس قسم کے مومنین کو کہا گیا ہے اور وہ یقیناً کامیاب و کامران ہیں۔ اگر کہا گیا ہے کہ خدا کی نصرت مومنوں کے ساتھ ہے تو اِس قسم کے مومنوں کے ساتھ ہے۔ اگر کہا گیا ہے کہ عالَم طبیعت مومن کا ساتھ دیتا ہے اور اس کی مدد کرتا ہے تو اس قسم کے مومن کے بارے میں کہا

۱. کتاب سلیم بن قیس ہلالی، حدیث ۲۶

گیا ہے نہ میرے اور آپ جیسے مومنوں کے بارے میں۔ تو اس بحث سے کمترین فائدہ جو ہمیں حاصل ہو گا وہ یہ ہے کہ اگر ہم نے دیکھا کہ ہمارے ایمان میں وہ آثار و خواص اور بشارتیں نہیں پائی جاتیں، وہ بشارتیں جو قرآن اور خدا نے مومنین کو دی ہیں تو ہم تعجب نہیں کریں گے؛ چونکہ جانتے ہوں گے کہ جس ایمان کیلیے نویدیں اور بشارتیں دی گئی ہیں ہم اس سے تہی داماں ہیں۔

اب ان آیات کا ترجمہ کروں، غور فرمائیں: ﴿لَقَدْ أَنزَلْنَا آيَاتٍ مُّبَيِّنَاتٍ﴾[1] بہ تحقیق ہم نے واضح اور روشن کرنے والی آیات نازل کیں۔ قرآن کی آیات روشن اور نمایاں کرنے والی ہیں۔ جو اپنے آپ کو قرآن سمجھنے کی زحمت نہیں دیتے وہ بیچارے اس نور اور روشنائی سے محروم ہیں۔ ﴿وَاللهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ خدا جسے چاہتا ہے راہ مستقیم اور راہ ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جسے خدا چاہتا ہے۔

خدا کے چاہنے سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ مراد ہے کہ خدا کسی شخص کی ہدایت چاہتا ہے اور کسی کی نہیں چاہتا؟ بعض افراد پر خصوصی نظر کرم فرماتا ہے اور انہیں خود ہدایت کی طرف لے جاتا ہے اور بعض کو پیچھے دھکیل دیتا ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ خدا کی مشیت اور خدا کا ارادہ (عام اور معمولی موارد میں) طبیعی و معمولی علل و اسباب کی صورت میں ہی جلوہ گر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ نے چاہا اور ارادہ کیا کہ ایک ہدایت کرنے والی اور روشن کرنے والی گفتگو کو سنیں اور پھر اگر آپ نے ہدایت پا لی تو در حقیقت یہ خدا نے ہی چاہا تھا کہ آپ ہدایت پائیں۔ اور اگر آپ نے سستی کی، کاہلی سے کام لیا، اگر آپ نے فہم و ادراک کے دریچے اپنے اوپر بند کر لیے تو یہاں بھی خدا کا ارادہ تھا کہ آپ نہ سمجھیں۔ خدا کا ارادہ اس معنی میں ہے کہ عادی اور معمولی وسائل اور علل و اسباب فراہم ہوئے یا نہیں؛ اگر آپ کے اپنے ارادے سے معمولی علل و اسباب اس معمول کے انجام پانے کیلیے فراہم ہو گئے تو یہاں پر خدا نے چاہا ہے، اور اگر آپ نے نہ چاہا اور ارادہ نہ کیا تو ظاہر ہے کہ خدا نے نہیں چاہا، نہ یہ کہ خدا کا نہ چاہنا آپ کے ارادہ نہ کرنے کا باعث بنے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ آپ ارادہ کرنے میں آزاد ہیں۔ خدا نے نہیں چاہا یعنی لازمی علّت مترتب نہیں ہوئی، یہ ہے خدا کے نہ چاہنے کا مطلب۔

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم یہ کیوں نہیں کہتے کہ لازمی علت مترتب نہیں ہوئی؟ ایسا کیوں کہتے

---

[1] سورہ مبارکہ نور: آیات ۴۶ سے ۵۲

ہیں کہ خدا نے نہیں چاہا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ علتوں کو وجود میں لانے اور انہیں تاثیر عطا کرنے والا خدا ہے۔ فرض کریں یہاں آگ جل رہی ہو اور میں ہاتھ آگ میں ڈالوں تو میرا ہاتھ جل جائے گا۔ کیوں؟ کیونکہ خدا نے یہی چاہا ہے۔ اور اگر میں آگ میں ہاتھ نہ ڈالوں تو نہیں جلے گا۔ کیوں؟ کیونکہ خدا نے نہیں چاہا۔ کیا مطلب؟ خدا نے چاہا کہ جل جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جلنے کی طبیعی علت فراہم ہے۔ طبیعی علت کیا ہے؟ آگ کا ہونا، کسی رکاوٹ کا نہ ہونا، میرا چاہنا اور ارادہ کرنا، ہاتھ آگ میں لے جانا۔ اور دوسری صورت میں جو کہتے ہیں کہ خدا نے نہیں چاہا کہ جل جائے یعنی جلنے کی طبیعی علت فراہم نہیں ہوئی، ہاتھ کو آگ کے نزدیک نہیں لے گیا یا ہاتھ گیلا تھا یا جسم گیلا تھا یا آگ کم تھی وغیرہ وغیرہ۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو چیز علتوں سے مربوط ہے اس کی نسبت ہم خدا کی طرف کیوں دیتے ہیں؟ اس لیے کہ خدا ان علتوں کا خالق ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں بھی ﴿مَن يَشَاء﴾ ہے وہ اسی قسم سے ہے اور مختلف مناسبتوں سے دوسرے مقامات پر میں نے اس کی تفصیلی وضاحت کی ہے، یہاں پر بھی ایک اشارہ کر دیا ہے۔

﴿وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللهِ وَبِالرَّسُولِ﴾ وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا اور پیغمبر خداؐ پر ایمان لائے ہیں، ﴿وَأَطَعْنَا﴾ اور ہم نے اطاعت کی ہے۔ یہ دعوے کرتے ہیں البتہ دعویٰ کرنا آسان ہوتا ہے لیکن ﴿ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ اس دعوے کے بعد ان میں سے ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے، جب انہوں نے منہ پھیرا (بات کفار کی نہیں ہے، بات مرتدوں کی نہیں ہے جو اچانک غضبناک اور ناراض ہو کر عالَمِ اسلام اور دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں؛ بلکہ انھی اسلامی معاشروں میں پائے جانے والے عام مومنین کی بات ہو رہی ہے) تو پھر ان کے بارے میں خدا فرماتا ہے: ﴿وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ﴾ یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔ اور اب اس سے بھی واضح تر یہ کہ ﴿وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ﴾ اور جب انہیں خدا اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ پیغمبر خداؐ ان کے درمیان قضاوت اور فیصلہ کریں تو ﴿إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ﴾ اچانک آپ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کچھ لوگ روگردانی کرتے ہیں اور پیغمبر خداؐ کا حکم سننے کے لیے حاضر نہیں ہوتے ہیں۔ ظاہراً یہ آیت قضاوت کے بارے میں ہے۔ قرآن حکیم میں حکومت اور حکم کی تعبیر غالباً (نہ کہ ہمیشہ) قضاوت اور فیصلہ کرنے کے معنی میں آئی ہے، وہی چیز جسے ہم فیصلہ کرنا اور قضاوت کرنا کہتے ہیں لیکن آیت کریمہ کا مضمون اور معنی عام ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ آیت صرف ان کے بارے میں ہے جو پیغمبر اکرمؐ کی قضاوت اور فیصلے کو قبول نہیں کرتے بلکہ آیت ان لوگوں کو بھی شامل ہے جو قضاوت کے علاوہ دوسرے موارد میں رسول خداؐ کے حکم اور فرمان کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ اور یہ بات واضح ہے۔ ﴿وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ﴾ ان میں سے کچھ لوگ تو روگردانی کرتے ہیں، منہ موڑتے ہیں۔ ﴿وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ﴾ اور اگر حق ان کی طرف ہو تو اطاعت کرتے ہوئے رسول خداؐ کی طرف چلے آتے ہیں، اطاعت کے ساتھ۔ جہاں حکم ان کے فائدے میں ہو وہاں تو دین کے سامنے سرِ تسلیم خم ہیں لیکن جہاں احتمالاً حکم ان کے فائدے میں نہ ہو تو وہاں دین کو قبول نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر قرآن ان لوگوں سے وضاحت مانگ رہا ہے کہ ایسا کیوں کرتے ہیں اور ہر حال میں دین کے سامنے سر تسلیم خم کیوں نہیں کرتے؟

کیا وجہ ہے کہ جہاں پر دین آپ کے ذاتی مفاد میں نہیں ہے وہاں پر آپ دین کو قبول نہیں کرتے؟ تین میں سے ایک وجہ ہو سکتی ہے: ﴿أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ﴾ کیا ان کے دل میں بیماری ہے؟ منافقت کی بیماری؟ ہوا و ہوس اور نفسانی خواہشات کی بیماری؟ جہالت اور نادانی اور کبر و غرور کی بیماری؟ کیا یہ بیماریاں ان کے دلوں میں ہیں جن کی وجہ سے حکم کو قبول نہیں کرتے؟ یا ان سے بھی بدتر کوئی وجہ ہے؟ ﴿أَمِ ارْتَابُوا﴾ یا یہ لوگ دین کے بارے میں مشکوک ہیں؟اگر آپ کو دین کے بارے میں شک نہیں ہے، اگر تردید کا شکار نہیں ہیں، اگر آپ کو دین کے بارے میں شبہہ نہیں ہے تو پھر جہاں دین آپ کے مفاد میں نہیں ہوتا، جہاں دین آپ کے لیے سخت ہوتا ہے وہاں آپ دین سے فرار کیوں کرتے ہیں اور دین کے منکر کیوں ہو جاتے ہیں یعنی اس حکم کا انکار کیوں کر دیتے ہیں؟ یا اس سے بھی بدتر کوئی اور وجہ ہے؟ ﴿أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَحِيفَ اللهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ﴾ شاید وہ اس چیز سے ڈرتے ہیں کہ کہیں خدا اور رسول خداؐ ان پر ظلم نہ کریں؛ یہ چیز اس شک کرنے سے بھی بدتر ہے، یہ عین کفر ہے۔ انسان اس حد تک بھی نہ جانتا ہو اور یہ عقیدہ بھی نہ رکھتا ہو کہ خدا اور رسول خداؐ اپنے حکم اور فیصلے میں انسانوں پر ظلم نہیں کرتے؛ جو شخص یہ خوف رکھتا ہو اور اسے یہ ڈر ہو کہ کہیں خدا اور پیغمبر خداؐ اس پر ظلم نہ کریں، واضح ہے کہ ایسا شخص نہ خدا کو پہچانتا ہے نہ ہی رسول خداؐ کو اور نہ ہی انہیں مانتا ہے۔ ﴿بَلْ أُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ یہ لوگ خود ظالم ہیں۔ خدا تو کسی پر ظلم نہیں کرتا، یہ لوگ خود ہی ہیں

جو اپنے آپ پر بھی ظلم کرتے ہیں اور حق و حقیقت پر بھی۔ اور اگر یہ لوگ کسی بڑے عہدے پر ہیں تو اپنے آپ پر اور حق و حقیقت پر ظلم کرنے کے علاوہ پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ اور اگر مزید کسی بڑے عہدے پر ہیں تو پوری طرح بشریت پر ظلم و ستم کرتے ہیں۔

﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ لیکن مومنین کس طرح ہیں؟ مومنین اس طرح نہیں ہیں۔ دیکھیں قرآنی لغت اور اصطلاح یہ ہے۔ قرآن معانی کی اپنی مخصوص لغت اور فرہنگ رکھتا ہے۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں مومن اس معنی میں ہے جو یہاں بیان کیا جا رہا ہے: ﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ بے شک مومنین کا کہنا یہ تھا ﴿إِذَا دُعُوا إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ﴾ جب انہیں خدا اور رسول خداؐ کی طرف دعوت دی گئی ﴿لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ﴾ تاکہ خدا اور رسول خداؐ ان کے درمیان فیصلہ اور قضاوت کریں، تو مومنین کا کہنا یہ تھا ﴿أَنْ يَقُولُوا﴾ کہ انہوں نے کہا ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ ہم نے سنا اور اطاعت و فرمانبرداری کی ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ہدف اور مقصد کو پا لیا۔ ﴿وَمَنْ يُطِعِ اللهَ وَرَسُولَهُ﴾ اور جو بھی خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے ﴿وَيَخْشَ اللهَ﴾ اور خدا سے ڈرے ﴿وَيَتَّقْهِ﴾ اور اس کی پرواہ کرے (اس کا تقویٰ اختیار کرے) ﴿فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ ایسے لوگ ہی وہ ہیں جنہوں نے گوہرِ مقصود پا لیا۔ «فوز» بھی اسی معنی میں ہے۔ اگلی دو آیات ہماری بحث سے مربوط نہیں ہیں لہٰذا میں بعد والی آیت تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ ﴿وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾[1] یہ بھی خدا کا وعدہ ہے، ایک بار پھر مومن اور ذمہ دار مومن کے لیے۔ غور کریں الٰہی وعدے پر۔ اس آیت میں خداوند متعال واضح طور پر فرمارہا ہے: ہم نے مومنین سے وعدہ کیا ہے کہ زمین پر حکومت آپ کی ہو گی اور آپ کی فکر و منطق، دین اور مکتب دنیا پر حکومت کرے گا، آپ کا خوف و ہراس، امن میں تبدیل ہو جائے گا، اگر آپ نے تاریخ کے نشیب و فراز میں ظلم و ستم سہے ہیں، اذیّتیں برداشت کی ہیں تو اس کے بعد آپ بغیر کسی خوف و ہراس کے امن و سکون سے رہیں گے اور خدا کی عبادت کریں گے اور اپنے دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے۔ یہ خدا کا وعدہ ہے اس آیت میں۔ اگر خدا نے ایسا وعدہ مسلمانوں کو دیا ہے تو یہ وعدہ مومنین سے مربوط ہے ذمہ دار اور با عمل مومنین سے۔

بعض لوگ بہت تنگ نظر اور فکری جمود کا شکار ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ چیز حضرت ولی عصرؑ کے

---

۱. سورہ مبارکہ نور: آیت ۵۵

زمانے کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس میں ہمیں کوئی شک نہیں کہ امام زمانہ (ع) کے ظہور کا دور اس آیت کا کامل و اکمل مصداق ہے، اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے؛ لیکن اس آیت میں کہاں پر یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ اس زمانے سے مخصوص ہے؟ بتائیں ذرا ہم بھی دیکھیں کون سی روایت ہے کہ یہ اس زمانے کے ساتھ مختص ہے؟ کیا خداوندِ متعال نے صدرِ اسلام کے مومنین کے ساتھ اس وعدے پر عمل نہیں کیا؟ اسی آیت پر عمل کیا گیا۔ مومنین مدینہ آئے اور وہ عظیم حکومت قائم کی۔ بلال جیسے لوگ جو قریش کے خوف سے زبان پر لا الہ الّا اللہ تک لانے کی جرأت نہیں کرتے تھے وہی بلند و بالا گلدستۂ اذان پر گئے اور بلند آواز سے تکبیریں کہیں اور لا الہ الّا اللہ کے نعرے لگائے۔ وہی لوگ جو مجبور تھے کہ شب و روز تین سو غیر انسانی اور کئی انسانی بتوں اور نفسِ امارہ اور نفسانی و شہوانی خواہشات کے بتوں کے سامنے سجدہ کریں اور ان کی بے چون و چرا عبادت کریں، وہی لوگ جو خدا کے اتنے زیادہ شریک بنا چکے تھے، وہ اس عظیم اور پُرامن سرزمین پر آئے اور پُرسکون زندگی گزارنے لگے، ہر قسم کی فکر اور پریشانی سے آسودہ خاطر۔ انہوں نے خدا کا شریک قرار نہ دیا، نہ چھوٹے کو نہ بڑے کو، نہ جاندار کو نہ بے جان کو، نہ اپنے درمیان میں سے کسی کو، نہ دوسروں میں سے کسی کو۔ اس آیت پر ایک بار وہاں عمل ہوا اور ہزار مرتبہ مزید بھی اس پر عمل ہو سکتا ہے، لیکن اس کی شرط کیا ہے؟ اس کی شرط یہ ہے کہ آیت کے ابتدائی جملات وقوع پذیر ہوں جن میں خدا فرما رہا ہے: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ﴾ خدا نے وعدہ فرمایا ہے، کن سے؟ ﴿اَلَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائیں اور نیک،شائستہ اور صالح عمل انجام دیں؛ یعنی اس ایمان کے تقاضوں کے مطابق عمل کریں، ان کو وعدہ دیا گیا ہے کہ ﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْأَرْضِ﴾ انہیں زمین پر اپنا جانشین بنائے گا ﴿كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ جس طرح کہ ان سے پہلے والے مومنین کو جانشین بنایا تھا ﴿وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ﴾ اور ان کے مکتب و مسلک اور دین کو طاقت و قدرت اور غلبہ عطا فرمائے گا وہ دین کہ ﴿اَلَّذِى ارْتَضَى لَهُمْ﴾ جسے اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے، وہ دین جو ان کے لائق اور سزاوار تھا؛ یعنی یہی دین اسلام جو دنیا و آخرت، حال و مستقبل اور جسم و روح سب کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے اور ایک جامع دین ہے، تمام ضرورتوں کے لیے کافی ہے۔ ﴿وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا﴾ اور خدا ان کے خوف و ہراس کے بعد انہیں امن و امان کی فضا میں قرار دے گا، کس لیے؟ اس امن کے سائے میں وہ

کیا کریں؟ امن کے سائے میں بیٹھیں، گرمیوں کے موسم میں لان میں چینی کی چینک اور ورشو کے سماور[1] کی چائے نوش جان کریں؟ امن ان چیزوں کے لیے ہے؟ امن و امان میں ہوں تاکہ سکون سے لیٹے رہیں اور سستی اور کاہلی کا شکار ہو جائیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ وہ امن اس لیے ہے تاکہ اس کے سائے میں چند قدم اپنی آخری منزل یعنی کمال کے نزدیک ہو سکیں، بندۂ خدا بن سکیں، اپنے جیسے انسانوں کی بندگی اور غلامی سے نجات پا سکیں، خدا کے مطیع و فرمانبردار اور اس کے سامنے خاضع و خاشع ہو سکیں اور اس طریقے سے رفعت و کمال کے اعلیٰ درجات پر فائز ہو سکیں۔ ان میں سے ہر لفظ پر بحث کی جا سکتی ہے۔ ﴿يَعۡبُدُونَنِي لَا يُشۡرِكُونَ بِي شَيۡـٔٗا﴾ میری عبادت کریں اور کسی کو میرا شریک نہ ٹھہرائیں۔ البتہ آیت کے آخر میں اس چیز کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ «اگر ایمان لانے کے بعد انہوں نے شرک کیا تو وہ فاسق ہو جائیں گے»[2] فاسق یعنی جو دین سے خارج ہو چکا ہو۔

---

۱. یہ سماور کاپر (copper)، نکل (nickel) اور زنک (zink) سے بنا ہوا ہے۔ اس میں چاندی کی سی چمک پائی جاتی ہے اور اسے زنگ نہیں لگتا۔ چونکہ یہ سماور پہلی بار پولینڈ (poland) سے ایران میں آیا تھا لہٰذا ایران میں پولینڈ کے دارالحکومت «ورشو» کے نام سے مشہور ہو گیا۔

۲. سورہ مبارکہ نور: آیت ۵۵ ﴿وَمَن كَفَرَ بَعۡدَ ذَٰلِكَ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡفَٰسِقُونَ﴾

چھٹی نشست

خوشخبریاں (۱)

۷ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری — ۱۹۷۴-۰۹-۲۴

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿يا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ۞ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطاً مُّسْتَقِيمًا﴾

(سورہ نساء/۱۷۴-۱۷۵)

ایمان کے بارے میں بحث درحقیقت ایک مقدماتی اور تمہیدی بحث ہے۔ اس مقصد کے لیے کہ دین کا فہم اور دین کے بنیادی اعتقادی اصول کی شناخت ہمارے اندر یہ جذبہ اور اشتیاق پیدا کرے کہ ہم پوری سنجیدگی کے ساتھ دین کے فہم و ادراک اور معرفت و شناخت کے پیچھے جائیں، ہمیں اس چیز کی ضرورت ہے کہ ایمان کی قدر و قیمت و کیفیت کو جانیں۔ ایمان کے بارے میں ہماری بحث اسی چیز کے تناظر میں تھی۔

ایمان کے بارے میں جو دو تین مسئلے بیان کیے گئے وہ بنیادی اور انتہائی ضروری تھے۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ ایمان، علم و معرفت کے ساتھ ہونا چاہیے نہ کہ محض تقلیدی۔ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ ایمان، احساسِ ذمہ داری اور عمل کے ساتھ ہونا چاہیے، ایمان انسان کے اندر احساسِ ذمہ داری پیدا کرے اور اسے عمل پر ابھارے نہ یہ کہ دل و دماغ میں صرف ایک خشک اور خالی عقیدہ ہو۔ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ ایک ذمہ دار اور با عمل مومن اس وقت مومن ہے جب اس کا ایمان دائمی ہو فصلی اور موسمی نہ ہو، صرف منفعت کے وقت نہ ہو بلکہ ہمیشگی ہو، ہر جگہ ہو اور ہر لحاظ سے ہو۔ یہ وہ مسائل ہیں کہ ایمان کے سلسلے میں جن کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اور جن کا جاننا ضروری تھا۔

اب ایمان کی قدر و قیمت اور ایمان کا نتیجہ جاننے کیلیے ضروری ہے کہ ہم ان بشارتوں،خوشخبریوں اور نویدوں سے آگاہ ہوں جو خداوندِ متعال نے مومنین کو دی ہیں، دیکھیں کہ خداوندِ متعال مومن سے اس کے ایمان کے مقابلے میں، اس کے صالح عمل اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کے مقابلے میں کس چیز کا وعدہ کرتا ہے۔ وہ انسان جو لین دین کا عادی ہے، جس نے اس نہج پہ زندگی گزاری ہے، یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ خدا کے ساتھ اس کا لین دین کس صورت میں ہے۔ وہ ایمان لاتا ہے اور پھر ایمان کے نتیجے میں کچھ ذمہ داریاں قبول کرتا ہے، اب یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کے بدلے میں خدا اس کے ساتھ کیا وعدہ کرتا ہے اور اسے کیا بشارت، خوشخبری اور نوید سناتا ہے۔ یہ مسئلہ ایک مومن کے نقطۂ نظر سے اور ایک ایسے شخص کے نقطۂ نظر سے جو چاہتا ہے کہ ایمان کی وادی میں ثابت قدم اور استوار رہے، انتہائی جاذب و جالب، شیرین اور دلچسپ موضوع ہے اور مومن کو امید دلاتا ہے۔
میری نظر میں شاید تقریباً تیس چالیس مطالب ہیں جو خداوندِ متعال نے قرآن کریم میں ایمان پر مترتب کیے ہیں۔ مومن کو یہ تیس چالیس عظیم امتیازات اور اعزازات نصیب ہوتے ہیں جو سب کے سب عظیم ہیں، سب اہم ہیں، سب ایک انسان کے خوشبخت اور سعادتمند ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ ان تیس چالیس موضوعات میں سے ایک موضوع بہشت ہے، ان میں سے ایک نوید ﴿جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ﴾[1] ہے اور اس طرح کی تیس چالیس نویدیں ہیں۔ ہر لحاظ سے مکمل طور پر سعادت و خوشبختی سے بہرہ مند ہونے کے لیے انسان کن چیزوں کا محتاج ہے؟ انسان کو سعادتمند ہونے کیلئے کن چیزوں کی ضرورت ہے؟ وہ چیزیں کہ انسان ہر لحاظ سے سعادتمند ہونے کیلئے جن کا محتاج ہے ان سب کی مومن کو بشارت دی گئی ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایمان یعنی عقیدہ اور عمل (جیسا کہ قرآن کریم فرمارہا ہے) مساوی اور برابر ہے سعادت و خوشبختی کی تمام شرائط کے ساتھ کہ جن کی ضرورت ایک انسان اپنے لیے تصور کر سکتا ہے۔ انسان کن چیزوں کا محتاج اور ضرورتمند ہے؟ ایک اس چیز کا محتاج ہے کہ اپنے ہدف اور سعادت و خوشبختی کی منزل کو پہچانے۔ یہ جان لے کہ کہاں پہنچنا چاہتا ہے، جان لے کہ کس مقصد کے لیے کوشش کرنا چاہتا ہے۔ ابتدا ہی سے اپنی منزلِ مقصود کو دیکھ لے اور اسے جان لے۔ ہدف اور مقصد کو جاننے، پہچاننے اور سمجھنے کے علاوہ یہ بھی جان لے

---

۱. سورہ مبارکہ کہف: آیت ۳۱

کہ اس ہدف تک کس راستے سے جانا چاہیے تاکہ یقینی طور پر اور جلدی اس ہدف تک پہنچ جائے۔ کیا ہدف کی شناخت، انجام کی شناخت، منزل کی پہچان اور اس راستے کی پہچان جو منزل تک لے جانے والا ہے انسان کی سعادت و خوشبختی کا پہلا اور اصلی عنصر اور زینہ نہیں ہے؟ یہاں پر ایک الٰہی و خدائی اور مادی انسان میں فرق نہیں ہے، مادہ پرست بھی اس چیز کو تسلیم کرتا ہے، قبول کرتا ہے اور اس کا احساس کرتا ہے۔ بنابر ایں ہدایت سب سے پہلی شرط ہے۔

دوسری چیز یہ کہ جہالت و نادانی، غرور و تکبر، باطل افکار و نظریات اور ہر اس چیز کو اپنے آپ سے دور کرے جو اس کی عقل و خرد پر پردہ ڈال دیتی ہے اور اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج اور زنگ آلود کر دیتی ہے۔ بہت سی چیزیں انسان کو سمجھنے نہیں دیتیں۔ انسان کا غرور اسے نہیں سمجھنے دیتا، جہالتیں انسان کو دیکھنے اور سمجھنے نہیں دیتیں، باطل افکار و نظریات اور اوہام و خرافات ایک انسان یا ایک ملت کے حقیقت کو سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں، ظالم اور طاغوتی حکومتیں انسانوں کو دیکھنے اور سوچنے سمجھنے نہیں دیتیں، متعدد اندرونی اور بیرونی رکاوٹیں انسان کو عقل و خرد جیسی خداداد نعمت کے استعمال سے دور کر دیتی ہیں، جس کے نتیجے میں انسان حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے، تاریکیوں میں پڑا رہ جاتا ہے اور صحیح فہم و ادراک سے دور رہ جاتا ہے۔ انسانوں کی خوشبختی کے عوامل اور سعادت کے عناصر میں سے ایک عامل اور عنصر یہ ہے کہ انسان ان ظلمتوں سے اور ہر اس چیز سے نجات پیدا کرے جو اس کے لیے ظلمت پیدا کرنے والی ہے اور حق و حقیقت کے نور کی طرف جائے تاکہ حقیقت کی نورانی شعاعیں اس کے دل پر پڑیں۔ پس سب سے پہلے ہدایت ضروری ہے اس معنی میں کہ جس کی وضاحت کی گئی، اس کے بعد نور ضروری ہے اسی معنی میں کہ جس کی وضاحت کی گئی؛ یہ ہوئی دو چیزیں۔

اور تیسری چیز یہ کہ سعادت کی طرف اپنے اس طویل سفر میں، اس راستے میں جسے وہ منزل کی طرف جانے کے لیے طے کر رہا ہے، اندرونی اور نفسانی وسوسوں اور سوچوں سے اپنے آپ کو بچا کے رکھے اس لیے کہ بیرونی عوامل کی نسبت یہ اندرونی عامل زیادہ طاقتور ہے اور انسان کو منزل کی طرف بڑھنے سے روک سکتا ہے۔ ایک دفعہ آپ کا راستہ روک لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جناب! آپ کو یہاں سے نہیں گزرنے دیں گے۔ یہ بات تجربے سے ثابت ہو چکی ہے اور تاریخ بھی صراحت کے ساتھ

ہمیں بتاتی ہے کہ جب کسی کا راستہ روکا جاتا ہے تو وہ اس راستے کو طے کرنے کا زیادہ مشتاق ہو جاتا ہے، اس کا شوق بڑھ جاتا ہے، اس کے شوق کی آگ زیادہ شعلہ ور ہو جاتی ہے۔ اگر وہ کہیں کہ ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے تو انسان زیادہ زور لگاتا ہے کہ جائے، عبور کرے۔ یہ عامل بیرونی رکاوٹ ہے، یہ عامل انسان کے وجود سے باہر خارجی رکاوٹ ہے۔ ایک دفعہ انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتے ہیں، اس میں شک و تردید پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کا راستہ نہیں روکتے، راستہ کھلا رہتا ہے لیکن انسان سے جانے کی طاقت، چلنے کی طاقت، بڑھنے کا اشتیاق اور سعی و کوشش کی سکت چھین لیتے ہیں۔ یہ انتہائی خطرناک ہے۔ کیوں جا رہے ہو؟ کیا فائدہ ہے؟ شاید منزل تک نہیں پہنچ پاؤ گے، شاید راستے میں کوئی چور ڈاکو آجائے، ہو سکتا ہے کوئی بھیڑیا آجائے، کس لیے جا رہے ہو؟ جانا ضروری نہیں ہے۔ انتہائی سکون کے ساتھ، ہمدردانہ لہجے میں، بزرگانہ اور استادانہ انداز میں یہ کہتے ہیں، راستہ بھی کھلا ہے، راستہ بند نہیں کرتے۔ یہ رکاوٹ، یہ وسوسہ، یہ سوچ اس سے کہیں زیادہ انسان کے ارادوں کو متزلزل کرنے والی ہے کہ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ ڈال کر اس کا راستہ بند کر دیں اور کہیں کہ ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے۔

ماضی کی طویل تاریخ میں راہ سعادت و خوشبختی کے راہیوں کے لیے غالباً یہ رکاوٹ موجود رہی ہے۔ کس قدر حضرت موسیٰؑ سے التماس کرتے تھے کہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں آپ نے ایسے ہی نہ کہہ دیا ہو، آپ سے وعدہ کچھ اور کیا گیا ہو، قول اور کچھ دیا گیا ہو اور ہمیں کچھ اور کہہ دیا ہو۔ قرآن کریم فرماتا ہے کہ فقر و فاقہ، غربت و افلاس اور دباؤ اس قدر زیادہ تھا کہ عوام تو بجائے خود خواص تک ڈگمگا جاتے تھے اور کہتے تھے ﴿مَتَىٰ نَصْرُ اللّٰهِ﴾[1] پس کب؟ پس کہاں؟ کیا ہوا؟ دیکھیں، یہاں تک کہ یہ تردیدیں اور اندرونی وسوسے اور شکوک و شبہات خواص کو بھی بھلا دیتے ہیں۔ انسان اگر سعادتمند بننا چاہے اور منزلِ مقصود اور راہِ سعادت کے آخر تک پہنچنا چاہے تو اس کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس تردد، شک و شبہ، اضطراب، روحانی و نفسیاتی پریشانی اور ذہنی بے سکونی و بے آرامی سے نجات پائے اور اس اندرونی وسوسے، اضطراب اور بےچینی پر غلبہ پائے۔ یہ بھی ان چیزوں میں سے ایک ہے جو انسان کو سعادت تک پہنچاتی ہیں، یعنی انسان سعادت کے طویل سفر میں ان اندرونی وسوسوں اور شکوک و شبہات سے

---

۱. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۲۱۴

چھٹکارا پائے کہ جو بیرونی عوامل سے زیادہ خطرناک اور انسان کے ارادوں کو کمزور کرنے والے ہیں۔ بنابر ایں تیسری چیز ذہنی، روحانی اور قلبی سکون و اطمینان ہے۔

اور چوتھی چیز یہ کہ اپنی سعی و کوشش کو مفید اور ثمر بخش سمجھے، یہ امید رکھے کہ یہ کوشش رائیگاں نہیں جائے گی۔ وہ لوگ جو یہ امید نہیں رکھتے کہ ان کی حرکت اور کوشش نتیجہ خیز ثابت ہو گی، یقیناً وہ سعادت و خوشبختی اور کامیابی و کامرانی کی منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ مطمئن ہو کہ اس کی کوششیں ثمر بخش ثابت ہوں گی، یہ جان لے کہ وہ جو کام بھی کرتا ہے وہ ایک مثبت اثر چھوڑتا ہے، یہ جان لے کہ وہ ہر قدم جو اٹھاتا ہے ایک گام منزل سے نزدیک تر ہو جاتا ہے۔ ایک بیابان میں اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ منزل اس طرف ہے، آپ جانتے ہوں کہ کس طرف جا رہے ہیں تو اگر دیر ہو چکی ہو، اگرچہ آپ اکیلے رہ گئے ہوں، قافلے سے بچھڑ چکے ہوں پھر بھی آپ شوق و جذبہ اور مضبوط ارادے کے ساتھ حرکت کرتے ہیں، قدم بڑھاتے ہیں اور آگے کی طرف بڑھتے ہیں۔ لیکن اگر آپ راستہ بھٹک چکے ہوں اور نہ جانتے ہوں کہ اس طرف سے جانا چاہیے یا اس طرف سے، تو آپ جس طرف بھی جاتے ہیں اور قدم بڑھاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ سست ہیں، آپ کے قدموں میں جان نہیں ہے، کیوں؟ اس لیے کہ آپ نہیں جانتے کہ آپ کی کوشش ثمر آور ہو گی یا نہیں۔ آپ یہ احتمال دیتے ہیں کہ یہی ایک قدم آپ کو منزل سے ایک گام دور کردے گا۔ لہٰذا آپ اس طرف سے واپس آجاتے ہیں اور دوسری طرف چلے جاتے ہیں اور پھر کچھ دیر بعد کسی دوسری سمت میں چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ پس اس کوشش کرنے والے، جدوجہد کرنے والے اور منزل کی طرف قدم بڑھانے والے راہِ سعادت کے راہی کے لیے ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ اپنی کوشش اور جدوجہد کو ثمر آور سمجھے۔

اور پانچویں چیز یہ کہ اس کی لغزشیں اور خطائیں قابلِ تلافی اور لائقِ معافی ہوں۔ یہ بھی بہت اہم ہے۔ انسان سے زندگی کے دوران اشتباہات ہوتے ہیں، خطائیں ہوتی ہیں، اگر خطا اور غلطی ایک نہ بھر سکنے والے زخم کی طرح رہ جائے، ایک ناقابلِ تلافی عمل کی طرح باقی رہ جائے تو انسان ہمیشہ اس پریشانی کا شکار رہے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سے ایک اور غلطی سرزد ہو جائے اور وہ غلطی اسے ہدف اور منزل سے اور دور کردے، راستے سے ہٹا دے۔ ایسی صورت میں انسان ہمیشہ ماضی کی نسبت مایوس اور

مستقبل کی نسبت بدبینی و گمانی کا شکار رہے گا۔ لیکن اگر اسے معلوم ہو کہ اگر وہ خود چاہے تو اس کی خطاؤں اور لغزشوں کی تلافی ممکن ہے، ندامت و پشیمانی کی صورت میں اس کے اشتباہات قابلِ درگزر ہیں؛ اگر اسے یہ معلوم ہو تو اس کا شوق، جذبہ اور امید کئی گنا بڑھ جائے گا۔

اور چھٹی چیز یہ کہ اسے معلوم ہو کہ ایک ایسی ہستی ہے جس پر وہ ہر حال میں اعتماد کر سکتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہو کہ ہر جگہ اور ہر حال میں ایک ایسا ناصر و مددگار ہے جس سے وہ نصرت طلب کر سکتا ہے، بالکل اس شخص کی طرح کہ جس نے راستے کا جامع نقشہ (روڈ میپ) اپنی جیب میں رکھا ہوا ہے اور چل رہا ہے۔ نہ تو وہ اشتباہ کرتا ہے اور نہ اسے کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے، وہ جانتا ہے کہ اگر کسی وقت کسی جگہ پر راستہ بھٹک بھی جائے تو نقشہ اس کے پاس ہے، اسے نکال کر دیکھ لے گا اور پھر صحیح راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ ہر جگہ اس کے پاس ایک ایسی قابلِ اطمینان رہنما چیز ہے کہ جس سے وہ مشکل کی گھڑی میں استفادہ کر سکتا ہے۔

اور ساتویں چیز کہ اسے دشمنوں اور عداوتوں کے مقابلے میں خداوند متعال کی نصرت اور امداد حاصل ہو؛ یہ بھی سعادت و خوشبختی اور کامیابی و کامرانی کی ایک اور شرط ہے۔ البتہ مادہ پرست خدا کا قائل نہیں ہے لیکن ہم اس کے سامنے خدا کا نام نہیں لائیں گے بلکہ اس سے کہیں گے کہ تمہاری اس مادی سعی و کوشش میں، اپنی اس اجتماعی جدوجہد میں اگر تمہیں معلوم ہو کہ اس مادی دنیا اور عالمِ طبیعت سے ماورا ایک طاقت ہے جو تمہارا ساتھ دے رہی ہے اور ہر گام پہ تمہاری مدد کرنے والی ہے تو کیسا رہے گا؟ ایک ایسی چیز ہو تمہارے پاس۔ فرض کرو کہ ایک ایسا یاور اور ناصر و مددگار تمہارے ساتھ ہے تو کیسا لگے گا؟ آپ دیکھیں گے کہ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں گی اور کہے گا، بہت اچھا ہے۔ کتنا اچھا ہے کہ مادی طاقتوں سے ماورا ایک غیر مادی طاقت انسان کی پشت پناہ ہو کہ جب وہ دشمنوں اور ان کی دشمنیوں، عداوتوں، سازشوں اور ظلم و ستم کا سامنا کر رہا ہو تو اسے یقین ہو کہ وہ ماورائے طبیعت طاقت اس کی حامی و ناصر اور مددگار ہے۔ البتہ ایک مادی شخص خدا کے نام سے نابلد ہے، خدا پر عقیدہ نہیں رکھتا ہے اگرچہ خدا کا نہ ہونے کا بھی اسے یقین نہیں ہے۔ لیکن ایک الٰہی شخص تو اس قادر اور ہر حال میں غالب ذات پر یقین رکھتا ہے جو ان تمام مادی اشیاء اور مسائل و مظاہر سے ماورا ہے اور اسی پر اس کا اعتماد ہے تو دیکھیں کہ وہ سعادت و کمال کے راستے پر کتنی تیزی اور کتنے اعتماد و اطمینان کے

ساتھ قدم بڑھاتا اور حرکت کرتا ہے۔
اور آٹھویں چیز یہ کہ اسے مخالفین اور دشمنوں کی صفوں اور محاذوں پر برتری و فوقیت حاصل ہو، یہ جانتا ہو کہ آخرکار برتری اور آخری فتح و نصرت اسے ہی حاصل ہوگی۔ یہ چیز بھی انسان کے راہِ کمال و سعادت کو آسانی کے ساتھ طے کرنے میں انتہائی موثر ہے۔
اور نویں چیز یہ کہ اپنے راستے اور ہدف و مقصد کے ان دشمنوں پر کامیاب ہو جائے جو اس کے راستے میں روڑے اٹکانے والے تھے۔ انسان اتنی زیادہ کوشش کرے اور پھر ناکام ہو جائے؟ یہ تو پھر سعادت کی منزل تک نہیں پہنچے گا۔ پس ایک انسان کی سعادت و خوشبختی کے اہم‌ترین عناصر میں سے ایک عنصر یہ ہے کہ آخرکار کامیاب ہو جائے، کیا ایسا نہیں ہے؟ کیا دنیا کے مکتب کامیابی کے لیے نہیں لڑتے ہیں؟ پس انسان کی انفرادی و اجتماعی سعادت و خوشبختی کے عناصر و عوامل میں سے ایک عنصر اور عامل یہ ہے کہ دشمنوں کے مقابلے میں آخرکار ان پر غالب آجائے۔
اور دسویں چیز یہ کہ آخرکار وہ تمام سختیوں سے، دباؤ سے، پابندیوں سے، حصاروں سے آزاد ہو کر اپنے مقصود و ہدف تک جا پہنچے گا؛ پہنچ جائے گا اس منزل تک۔ قرآنی تعبیر یعنی فوز و فلاح۔
اور گیارہویں چیز یہ کہ ہر حال میں، راستے میں بھی اور منزل میں بھی، ہدف کے راستے میں بھی اور منزل مقصود میں بھی ان ذخائر سے بہرہ مند اور برخوردار ہو جائے جو انسان کے لیے اس دنیا میں فراہم کیے گئے ہیں۔ زمین و آسمان کی برکات اس پر نازل ہوں، زمین کی گندم اور آسمان کی بارش کے قطرے، سمندروں اور جنگلوں کے ذخائر اور پہاڑوں کی معدنیات اور انسان کے لیے ضروری ہر قسم کے حیاتی اور غیر حیاتی مواد اور ان سب سے بالاتر ہوش و حواس، صلاحیت و استعداد اور فہم و ادراک کے دریچے اس پر کھل جائیں اور وہ ان سے کما حقہ استفادہ کرے۔ یہ بھی ان چیزوں میں سے ایک ہے جو انسان کی سعادت و خوشبختی میں کارفرما ہیں اور اس طرح کی اور چیزیں کہ جنہیں ممکن ہے انسان اپنے سعادتمند ہونے میں کارفرما سمجھے۔
اب تک جو کچھ بیان ہوا اس کا تعلق اسی دنیوی زندگی اور بیداری کے عالَم میں سعی و کوشش اور جدو جہد کے ساتھ ہے لیکن آخری چیز کہ جس کا تعلق مرنے کے بعد، چراغِ زندگانی کے خاموش ہو جانے کے بعد کہ جب انسان ظاہری طور پر جمادات کے ساتھ برابر ہو چکا ہو، یعنی مرنے کے بعد بھی

انسان کے استفادہ کرنے اور فیضیاب ہونے کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے بلکہ موت کے بعد کی گھڑی اس کی استراحت کی پہلی گھڑی ہو، اجر و ثواب لینے کا پہلا لمحہ ہو، راحت و سکون اور عیش و عشرت کا پہلا قدم شمار ہو۔ ایک مادی شخص کہ جو اپنی تمام تر کوششوں کے لیے صرف دنیاوی نتیجے کا قائل ہے، اپنے مرنے کے بعد اسے کسی چیز کی امید نہیں ہے، اس سے اگر کہا جائے کہ محال کا فرض کرنا تو محال نہیں ہے، لہٰذا اگر تمہارے مرنے اور اس دنیا سے جانے کے بعد تمہارے آرام و سکون کا دور شروع ہو جائے تو کیسا رہے گا؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ سعادت کا عظیم ترین رکن ہے کہ زندگی کا دورانیہ ختم ہونے اور تمام کوششوں کے خاتمے کے بعد انسان اجر و پاداش حاصل کرے اور بہشت بریں میں چین اور سکون سے رہے۔

یہ سعادت و خوشبختی کی شرائط ہیں۔ ایک انسان کے سعادتمند ہونے کے لیے، ایک انسان یا ایک معاشرے کے خوشبخت ہونے کے لیے یہ شرائط ضروری ہیں۔ اب کلام الٰہی کو غور سے سنیں جو ان تمام چیزوں کی ایک ذمہ دار، فرض شناس اور با عمل مومن کو نوید سنا رہا ہے۔

آج کی آیات متفرقہ ہیں، ایک جگہ سے نہیں ہیں مختلف جگہوں سے ہیں۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ﴾[1] وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دیے؛ عمل صالح یعنی ایمان کے مطابق ذمہ داری اور فرض شناسی، انسان کا ایمان اس کے کندھوں پر ذمہ داری ڈالتا ہے، اس ذمہ داری کو قبول کرنا اور اسے انجام دینا ہی عمل صالح ہے۔ جو لوگ ایمان لائیں؛ وہ عقیدہ رکھیں اور پھر ایمان کے تقاضوں کے مطابق عمل بھی کریں ﴿يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ﴾ تو ان کا پروردگار ان کے ایمان کی وجہ سے ان کی ہدایت کرے گا۔ خود ایمان اس چیز کا باعث بنتا ہے کہ وہ راستہ تلاش کر لیں، کس چیز کا راستہ؟ منزل کا راستہ بھی اور منزل تک پہنچنے کے لیے ذرائع اور وسائل کا راستہ بھی۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم کس طرح منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں؟ جب آپ اس بات کا تجزیہ و تحلیل کریں تو دیکھیں گے کہ یہ بات کرنے والے کے دل میں پہلے قدم اور پہلے مرحلے پر ایمان نہیں ہے؛ اگر ایمان ہو بھی تو اس کے ساتھ عمل نہیں ہے۔ اگر عمل کرے تو نور اور ہدایت اسے نصیب ہو گی اور دوسرے قدم اور مرحلے کو بھی تلاش کر لے گا۔

---

۱. سورہ مبارکہ یونس: آیت ۹

میں بعض اوقات ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ فرض کریں کہ ایک بیابان ہے کہ جس کا طول و عرض دسیوں کلومیٹر ہے اور ایک گہری تاریک رات کو آپ اس بیابان میں تنہا چل رہے ہیں، نہ آسمان پہ چاند ہے نہ ستارہ، صرف ایک چھوٹی سے ٹارچ یا ایک چھوٹا سا چراغ یا ایک چھوٹی سی شمع آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ سے کہا جائے کہ اس شمع کے ساتھ آپ اس بیابان کے آخر تک جائیں۔ آپ مڑ کر کہیں گے کہ جناب! میرے پاس جو شمع ہے اس کی روشنی ایک میٹر سے زیادہ تک نہیں جاتی تو میں یہ دسیوں کلومیٹر اس شمع کے ساتھ کیسے طے کروں؟ یہ ایک نو وارد، کم علم یا بے علم اور ناتجربہ کار شخص کی منطق ہو سکتی ہے۔ اس کا صحیح جواب کیا ہے؟ آپ کے نزدیک اس اندھی اور بے تکی منطق کا جواب کیا ہے؟

کیا اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ جناب عالی! آپ کے اردگرد ایک میٹر کی جگہ روشن ہے یا نہیں؟ ایک قدم آگے بڑھائیں تو ایک میٹر اور روشن ہو جائے گا، اگر روشن نہ ہو تو نہ جائیں۔ یہی ایک میٹر جو روشن ہے یہ تو جائیں، یہی ایک قدم جو اٹھاسکتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کہاں رکھ رہے ہیں یہ تو اٹھائیں، اگر آپ کے آگے ایک اور قدم روشن نہ ہو، تو نہ جانا اور اگر ہوا تو مزید آگے چلے جانا۔ آپ دیکھیں گے کہ بیابان آخر تک تدریجاً روشن ہوتا جائے گا اور آپ اس راستے کو طے کر لیں گے اور منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ کیا واقعاً ایسا نہیں ہے؟ ﴿يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ﴾ خدا ان کے ایمان کے ساتھ ان کی ہدایت کرے گا۔ خود ایمان اس چیز کا موجب بنتا ہے کہ انسان راستوں کو تلاش کر لے۔

اگلی آیت ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا﴾[۱] اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے برہان آگیا، روشن اور قطعی دلیل، ثابت و مثبت حجّت، ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا﴾ اور ہم نے تمہاری طرف واضح و آشکار نور کو نازل کیا۔ اس برہان اور نور سے مراد قرآن اور اس کے حقائق ہیں۔ ہمارا شاہد اگلی آیت میں ہے ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا﴾ پس وہ لوگ جو خدا پر ایمان لے آئیں اور اسی سے متمسک ہوں اور اسی پر اعتماد و بھروسہ کریں، صرف قلبی ایمان بھی کافی نہیں ہے بلکہ خدا، خدا کے

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۱۷۴ اور ۱۷۵

دامن یعنی خدا کے دین و آئین اور صراط الٰہی کے ساتھ تمسّک بھی کرنا چاہیے۔ ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ﴾ تمسک کیا، تھام لیا، اعتماد کیا، اگر ایسا ہوا تو ﴿فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ﴾ خدا انہیں اپنی رحمت اور فضل و کرم کے سائے میں داخل کردے گا اور پھر ﴿وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا﴾[۱] اپنی جانب ان کی رہنمائی کرے گا، ہدایت کرے گا؛ سیدھے اور نزدیک کے راستے سے ہدایت کرے گا، یہ ہدایت مومنین کے لیے مخصوص ہے۔ اگر ایمان نہ ہو؛ اگر ایمان ہو لیکن اعتصام اور تمسک نہ ہو، خدا کے مقابلے میں آپ اپنی ذمہ داریوں پر عمل نہ کریں تو خدا کی طرف آپ کی ہدایت و راہنمائی نہیں ہو گی، ہدایت کا وہ نور آپ کے دل پر نہیں چمکے گا؛ یہ مومنین کے ساتھ مختص ہے۔

ایک اور آیت ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا﴾ ہے، یہ مشہور و معروف آیت ہے جو زبان زد خاص و عام ہے، ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾[۲] جو لوگ ہمارے راستے میں (خدا فرما رہا ہے، خدا کا رستہ کیا ہے؟) اور الٰہی اہداف و مقاصد کی خاطر، (الٰہی اہداف، ہر وہ ہدف جو خدا اس جہاں میں رکھتا ہے) جہاد کریں۔ خدائی اہداف کیا ہیں؟ عدالت ہے، امن ہے، خدا کی عبادت اور بندگی ہے، انسانوں کی رشد و کمال تک رسائی ہے، زمین کا آباد ہونا ہے، انسانوں کے دلوں کا آباد ہونا ہے، انسانوں کی دنیا و آخرت کا آباد ہونا ہے، تمام موجودات و مخلوقات کا راہ کمال پہ گامزن ہونا ہے؛ یہ خدائی اہداف و مقاصد ہیں۔ ظن و گمان کا نہ ہونا، شرک کا نہ ہونا، کفر کا نہ ہونا، بدامنی کا نہ ہونا، تندخوئی اور درندہ صفتی کا نہ ہونا، سرکشی اور بغاوت کا نہ ہونا؛ یہ سب خدائی اہداف ہیں۔ ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا﴾ جو لوگ ہمارے اہداف و مقاصد کے راستے میں جہاد کریں، الٰہی و خدائی اہداف کے لیے کوشش کریں ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ بغیر کسی شک و تردید کے، ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے، انہیں سرگرداں نہیں چھوڑیں گے۔ وہ شعر جو میں نے پڑھا اس کی جگہ یہی ہے:

تو پای بہ راہ در نہ و ہیچ مپرس
خود راہ بگویدت کہ چون باید رفت[۳]

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۱۷۵
۲. سورہ مبارکہ عنکبوت: آیت ۶۹
۳. عطار

تو راستے میں قدم رکھ اور پھر کچھ نہ پوچھ، رستہ خود تجھے بتائے گا کہ کیسے جانا ہے۔
ہم نے کہا کہ نور ان چیزوں میں سے ایک ہے جو انسان کے سعادتمند اور خوشبخت ہونے کے لیے ضروری ہیں اور گذشتہ صفحات میں ہم نے نور کے بارے میں وضاحت بھی کر دی تھی۔ مومنین کو نور کا وعدہ دیا گیا ہے۔ ﴿اللہُ وَلِیُّ الَّذِینَ آمَنُوا یُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾[1] خدا مومنین کا سرپرست اور ہم محاذ ہے۔ میں ولی کا معنی ہم محاذ، متصل اور ہم سطح کرتا ہوں اور اسے سرپرست، دوست اور ناصر و مددگار جیسے رائج معانی پر ترجیح دیتا ہوں۔ کیوں کہ ولایت اتصال کے معنی میں ہے، دو چیزیں جو باہم اکٹھی اور ایک دوسرے سے متصل باندھی جاتی ہیں، اسے ولایت کہتے ہیں۔ خدا مومنین کا ولی ہے یعنی ہمیشہ مومنین کے ساتھ ہے، کیا مطلب کہ ہمیشہ مومنین کے ساتھ ہے؟ یعنی خدا اور مومنین ایک صف میں اور دشمنانِ خدا دوسری صف میں مومنین اور خدا کے مقابلے میں ہیں۔ قرآن کریم میں جہاں پر بھی ﴿ولی﴾ ہے جیسے ﴿وَاللہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِینَ﴾[2] یا ﴿أَوْلِیَاءَ اللہِ﴾ یا دوسری تعبیرات، ان سب میں ولی اس معنی میں ہے؛ یہ آپ کے مدِّ نظر رہے۔
﴿اللہُ وَلِیُّ الَّذِینَ آمَنُوا﴾ خدا مومنین کا سرپرست اور ہم محاذ ہے، ﴿یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ انہیں ظلمات اور تاریکیوں سے نکالتا ہے اور نور تک پہنچاتا ہے۔ اس جگہ کی ہم نے مختصر وضاحت کی تھی کہ جو ظلمات کا معنی سمجھنے کے لیے مناسب ہے۔ خدا انہیں ظلمتوں سے، جہالت و نادانی کی ظلمتوں سے، خرافات، غرور و تکبر، طاغوتی اور غیر انسانی حکومتی نظاموں اور تمام وہ چیزیں جو انسان اور اس کی فکر اور عقل و خرد کے گراں بہا گوہر کے لیے زندان اور تاریک گڑھا شمار ہوتی ہیں، ان ظلمتوں سے انہیں خارج کرتا ہے، رہائی بخشتا ہے نور کی جانب، کیسا نور؟ معرفت، علم و دانش اور انسانی اقدار کے نور تک پہنچاتا ہے۔ خدا مومن کے ساتھ یہ کام کرتا ہے۔ اور کسی بھی صورت میں غیر مومن کو، بے ایمان کو، شک و تردید کے شکار، اور ناشکرے کافر کو نور تک نہیں پہنچاتا۔ لہٰذا مشرک ہمیشہ مضطرب رہتا ہے، مشرک ہمیشہ پریشان رہتا ہے، مشرک کی زندگی ہمیشہ اضطراب اور پریشانی میں گزرتی ہے، اس کے لیے نورانیّت نہیں ہے، حقیقی معرفت نہیں ہے، صحیح شناخت نہیں ہے، جہاں بھی پہنچ جائے۔

---

۱. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۲۵۷
۲. سورہ مبارکہ آل عمران: آیت ۶۸

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا﴾ لیکن کفار کی صورت حال کیا ہے؟ کفار یعنی وہ لوگ جنھوں نے دینی عقیدے اور دین کے مکتب کی نا شکری کی، اس الٰہی تحفے اور ہدیے کو نا شکری کے ساتھ ٹھکرا دیا، نعمتوں کے کافر۔ کافر وہ نہیں ہے کہ جس نے دین کو قبول نہیں کیا، کافر یعنی نعمت کو چھپانے والا، نعمت کی ناشکری کرنے والا، ایسے شخص کو کافر کیوں کہتے ہیں؟ اس نے دین کو قبول نہیں کیا، لیکن کافر کس لیے؟ اس لیے کہ یہ دین خدا کا تحفہ تھا، یہ خدا کی طرف سے اس کی اور تمام انسانوں کی سعادت و خوشبختی کے لیے ہدیہ تھا؛ اس نمک ناشناس اور نمک حرام ناشکرے اور نعمت کے منکر نے اسے ٹھکرا دیا، لہٰذا اسے کافر کہتے ہیں۔ ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا﴾ وہ لوگ جنھوں نے کفر اور انکار کیا ﴿أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ﴾ ان کے سرپرست اور ہم محاذ طاغوت اور سرکش لوگ ہیں۔ ﴿يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ﴾ جو انہیں نورِ معرفت سے دور کر کے ظلمتوں اور تاریکیوں کے زندان کی طرف کھینچ کے لے جاتے ہیں۔﴿أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ وہ سب آگ کے مصاحب و ہم نشیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ اے وہ جو ایمان لائے ہو ﴿اذْكُرُوا اللهَ ذِكْرًا كَثِيرًا﴾[1] خدا کو بہت زیادہ یاد کرو ﴿وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴾ اور ہر صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔ ﴿هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ﴾ وہ اور اس کے فرشتے تم پر درود بھیجتے ہیں، کیوں؟ ﴿لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ تاکہ تمہیں ظلمات اور تاریکیوں سے نکالے اور نور کی طرف تمہاری ہدایت کرے۔ یہ ہے قرآن اور قرآن کی نوید و بشارت اور خوشخبری۔

---

۱. سورہ مبارکہ احزاب: آیات ۴۱ سے ۴۳

ساتویں نشست

خوشخبریاں (۲)

۸ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری

۱۹۷۴-۰۹-۲۵

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۞ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ﴾

(سورہ رعد/۲۸-۲۹)

مقام فکر و تصور میں جن چیزوں کو ہم نے سعادت و خوشبختی کے عوامل و عناصر کے طور پر حاصل کیا ہے اور ان میں سے دس بارہ کو گذشتہ تحریر اور سابقہ تلاوت میں بیان کیا ہے، وہ سب قرآن کریم میں مومنین کو یقینی و حتمی نویدوں، بشارتوں اور خوشخبریوں کی صورت میں ذکر ہوئی ہیں۔ ان نویدوں اور بشارتوں میں سے دو نویدوں یعنی ہدایت اور نور کا کل ہم نے قرآن کریم کی آیات کریمہ کی تلاوت کے دوران مشاہدہ کیا اور ان سے بہرہ مند ہوئے۔ مزید دو کو آج پیش کرتے ہیں اور ان کی آیات کو اختصار کے ساتھ پڑھتے ہیں اور باقی ماندہ کو آپ دوستوں پر چھوڑتے ہیں۔

اطمینان یعنی دل کے سکون کی حالت، قلب و روح کے آرام کی حالت۔ آرام یعنی کیا؟ یہاں پر آرام و سکون کس معنی میں ہمارے مدّ نظر ہے؟ کیا اس معنی میں کہ ہماری روح کسی بھی قسم کی حرکت اور سعی و کوشش نہ کرے؟ کیا آرام اس معنی میں ہے کہ ہمارا دل نیم خوابی یا نیم بے ہوشی کی حالت میں ہو؟ یا نہیں بلکہ آرام و سکون، اضطراب و بے چینی کے مقابلے میں ہے، سکون و اطمینان، بے سکونی و پریشانی کے مقابلے میں ہے۔

آپ دو افراد کو مدِّ نظر رکھیں، طے یہ ہے کہ دونوں کمرۂ امتحان میں حاضر ہوں۔ ان میں سے ایک نے

اچھی طرح درس پڑھا ہے، کئی بار اسے دہرایا ہے، دوستوں کے ساتھ مباحثہ کیا ہے اور اب جس کتاب کا امتحان دینا ہے اس کے تمام مسائل و مطالب اس کے ذہن میں حاضر و موجود اور واضح و روشن ہیں؛ جبکہ دوسرے نے یہ کتاب سرے سے پڑھی ہی نہیں یا تھوڑی پڑھی ہے یا اسے اپنے حافظے پر اعتماد نہیں ہے، طے یہ ہے کہ دونوں کمرۂ امتحان میں حاضر ہوں، تو کیا یہ دونوں ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے برابر ہوں گے؟ آپ دیکھیں گے کہ جب پہلا شخص کمرۂ امتحان میں داخل ہوگا تو اس کا ذہن پُرسکون ہوگا، بےچینی و بےسکونی نہیں ہوگی، اضطراب نہیں ہوگا، پریشانی نہیں ہوگی، کہے گا کہ جہاں سے بھی سوال پوچھیں میں جانتا ہوں۔ جبکہ دوسرا ہمیشہ مضطرب ہوگا، بےقرار ہوگا، اس کشتی کی طرح جو متلاطم اور بپھرے ہوئے دریا کی بےرحم اور تلاطم خیز موجوں کے رحم و کرم پر ہو، کبھی اس طرف، کبھی اُس طرف، کبھی اس راستے سے، کبھی اس راستے سے، ہوائیں اسے ادھر ادھر لیے پھرتی ہیں، امتحان کے لیے تیاری نہ کرنے والے اس شخص کی روح کی حالت ایسی ہی ہوگی۔ ایک قاضی کے سامنے آپ انہی دوحالتوں کا تصور کر سکتے ہیں، اجتماعی سرگرمیوں اور تاریخ کی عظیم اجتماعی تحریکوں میں ایک فرد یا ایک معاشرے میں آپ انہی دو حالتوں اور کیفیتوں کو مدِّنظر قرار دے سکتے ہیں۔

اطمینان اور سمجھانے کے لیے ایک اور مثال دوں تاکہ تدریجاً ہم اس روح اور نفسِ مطمئنہ کے نزدیک ہو جائیں جو قرآن کریم میں مدِّنظر ہے۔ ایک طالب علم کے امتحان سے شروع کرتے ہیں عدالت کے سامنے ایک ملزم تک۔ اس کی ایک اور مثال وہ انسان ہے جو ایک راستے پر چل رہا ہے اور اپنے مقصد و ہدف اور مقصود ومطلوب کی طرف بڑھ رہا ہے، ممکن ہے کہ دسیوں عوامل اسے اس راہ کو طے کرنے اور ہدف کا تعاقب کرنے سے روکیں۔ ڈر اور خوف ان عوامل میں سے ایک ہے، رعب و وحشت، خوف و ہراس۔ ممکن ہے کہ ڈر اور خوف کی وجہ سے وہ اس راستے کو جاری نہ رکھ سکے۔ کس چیز کا خوف؟ راستے میں بھوک کا خوف، راستے میں چور کا ڈر، اس بھیڑیے کا خوف جو راستے میں چھپا بیٹھا ہے، اس راستے کی مشکلات و زحمات اور بےخوابیوں کا خوف اور آخرکار ہدف تک نہ پہنچ سکنے کا خوف۔ یہ ان چیزوں میں سے ایک چیز ہے جو ایک سالک کو آگے بڑھنے اور راستے اور منزل کا تعاقب کرنے سے روک دیتی ہیں۔

ایک لالچ اور طمع ہے، کس چیز کا لالچ؟ پُرسکون زندگی کا لالچ؛ کہ اگر میں اس راستے کو طے نہ کروں،

اس مقصد و ہدف کے پیچھے نہ جاؤں تو سکون سے گھر میں نرم و گرم بستر پہ سوؤں گا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ چین سے رہوں گا۔ یہ چیز ایک عام اور معمولی انسان کے لیے، ایک چھوٹی سطح کے انسان کے لیے، ایک کمزور روح کے لیے آئیڈیل ہے، محبوب ہے، مطلوب ہے، پُرکشش ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے آسانی سے کھونا نہیں چاہتا۔ پُرسکون زندگی کی لالچ، دولت کی لالچ کہ اسے یہ کہا جائے کہ اگر تو اس راستے پر نہ جائے تو تجھے اشرفیوں اور زر و جواہرات کی یہ تھیلی دی جائے گی، عہدے اور منصب کی لالچ کہ اگر تو نے یہ دربدری قبول نہ کی تو تجھے فلاں عہدہ اور منصب دیا جائے گا۔ لالچ اور طمع! یہ وہ عوامل ہیں جو انسان کو اس راستے کے طے کرنے سے روک دیتے ہیں، خوف اور لالچ؛ اگر ہم خوف کا تجزیہ کریں تو دسیوں ایسی چیزیں سامنے آئیں گی جن کا خوف انسان کے دامنگیر ہو سکتا ہے؛ اگر لالچ کی تحلیل کریں تب بھی دسیوں ایسی چیزیں سامنے آئیں گی جن کی لالچ انسان کو ہدف کی طرف قدم بڑھانے سے روک سکتا ہے جیسے راحت و سکون، صحت و عافیت اور فرصت و منفعت وغیرہ کی لالچ۔

اب آپ ایک راہی اور سالک کو مدِّنظر رکھیں جس نے بہرحال یہ رسک لیا ہے کہ اس راستے میں قدم رکھا ہے، چل رہا ہے اور آگے بڑھ رہا ہے، لیکن کیا یہ عوامل ختم ہو گئے ہیں؟ کیا وہ رکاوٹیں جو اس شخص کو اس راستے میں قدم نہیں رکھنے دے رہی تھیں اب اس کے راستے میں چلنے اور آگے بڑھنے سے ختم ہو گئی ہیں؟ نہیں، ختم نہیں ہوئی ہیں۔ اچھی طرح توجہ فرمائیں! یہ رکاوٹیں پہلے بھی اسے اس لمبے اور طویل راستے میں قدم نہیں رکھنے دے رہی تھیں، اب جب کہ وہ اس راستے میں قدم رکھ چکا ہے تو اسے آرام اور آسودگی کے ساتھ یہ رستہ طے نہیں کرنے دیں گی۔ ہر قدم جو بڑھائے گا ایک کانٹے کی طرح، ایک کنڈی کی طرح اور ایک زنجیر کی طرح اس کے پاؤں کو، اس کے دامن کو اور اس کے ہاتھ کو پکڑ لیں گی، اپنی طرف کھینچیں گی اور اسے رستہ طے کرنے سے روکیں گی۔ یہ شخص کبھی اِس طرف گرے گا کبھی اُس طرف گرے گا۔ کبھی یہ کانٹا اِس کے دامن کو پکڑے گا، کبھی وہ زنجیر اُس کے پاؤں کو آگے جانے سے روکے گی۔ اولاد کی محبت اسے اپنی طرف کھینچتی ہے، پُرسکون زندگی کی یادیں اسے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اس طرف سے اس طرف سے مختلف عوامل اس انسان کو مختلف اطراف و جہات کی طرف لے جاتے ہیں، نتیجتاً یہ انسان متزلزل ہو جاتا ہے، اسی کشتی کی طرح کبھی اس طرف کبھی اس طرف۔ یہ انسان نامطمئن ہے۔

ایک دوسرا انسان بھی ہے کہ جب وہ اس راستے میں قدم رکھتا ہے تو اپنے لیے ایک ایسا عامل بناتا ہے جو اس کی ساری توجہ کو اپنی طرف مبذول رکھتا ہے اور دوسرے تمام چھوٹے اور معمولی عوامل سے اسے غافل کر دیتا ہے۔ ایک ایسی کشش اور قوت جاذبہ اس کے دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے کہ یہ چھوٹی کشش، اولاد کی کشش، بیوی کی کشش، زندگی کی کشش، دولت و ثروت کی کشش، مقام و منصب کی کشش اور جان و زندگی کی کشش اس بڑی کشش اور قوت جاذبہ کے سامنے ہیچ اور ہیچ، نیست و نابود اور بے اثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایک چھوٹے جسم کو دسیوں مقناطیس اس طرف اور اس طرف کھینچتے ہیں لیکن جب ایک طاقتور مقناطیس آتا ہے تو اس کی قوت جاذبہ اس چھوٹے لوہے کو اس طرح اپنی طرف کھینچتی ہے کہ دوسرے مقناطیس بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہ انسان جب اس طاقتور اور مضبوط جذبے اور ارادے کے ساتھ اس راستے میں قدم رکھتا ہے اور اس راستے کو طے کرنا شروع کرتا ہے تو پھر بیوی بچوں کی محبت اور دوسری خوشیوں، لذتوں، خوبصورتیوں اور عیش و نوش کی کشش اس پہ اثر نہیں کرتی۔ یہ انسان کون ہے؟ مطمئن انسان ﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾[1] وہ شخص الٰہی راستے کو آخر تک طے کر سکتا ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے جو مطمئن ہو، سکون و اطمینان کی حالت میں ہو۔ اطمینان اس معنی میں ہے؛ یعنی ایک جاذبہ اور کشش اسے کھینچے۔ ایمان کی کشش، عشقِ خدا کی کشش اور ہدف اور مقصد سے محبت کی کشش اس طرح اسے مجذوب کرے اور اپنی طرف کھینچے کہ دوسری تمام کششیں اور رنگینیاں اسے ہیچ محسوس ہوں۔ جیسے زمین کی کشش جو ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس کی کشش کے سامنے ہر چیز کی کشش ہیچ ہے چاہے وہ پہاڑ ہی کیوں نہ ہو، کوہ ہمالیہ ہی کیوں نہ ہو، دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر آپ ایک پتھر کو پھینکیں تو کیا کوہ ہمالیہ اسے اپنی طرف کھینچے گا؟ ہرگز نہیں۔ کوہ ہمالیہ میں جاذبہ ہے، کشش ہے لیکن زمین کی کشش کے مقابلے میں اس کی کشش صفر ہے، بے اثر ہے، عمل نہیں کرتی ہے۔ کوہ ہمالیہ اور اس جیسا ہر بڑا جسم اس وقت چھوٹے اجسام پر اثر کرتا ہے اور انہیں اپنی طرف کھینچتا ہے جب زمین جیسا ایک زیادہ بڑا جسم اس کے ساتھ نہ ہو۔ جب زمین کی کشش ہے تو

---

۱. سورہ مبارکہ فجر: آیات ۲۷ اور ۲۸۔ «اے نفسِ مطمئن! اپنے رب کی طرف پلٹ آ اس عالم میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔»

کوہ ہمالیہ کی کشش کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔

جب ایک انسان کی روح میں خدا پر ایمان ایک طاقتور قوت جاذبہ کی طرح عمل کرتا ہے تو اسے اس طرح ایمانی اہداف و مقاصد کی طرف کھینچ کے لے جاتا ہے کہ یہ چھوٹی موٹی کششیں جو بے ایمان افراد کے نزدیک بڑی ہوتی ہیں لیکن ایمان کے سامنے چھوٹی اور معمولی، اس پر اثر نہیں کرتیں۔

خلاصہ یہ کہ اطمینان یعنی روح انسانی کا چین و سکون، قلبِ انسان کا آرام و قرار۔

دل آرام و سکون میں ہو، اس سے کیا مراد؟ نہ یہ کہ بے حرکت ہو، نہ یہ کہ آگے نہ بڑھے، پیشرفت نہ کرے بلکہ مراد یہ ہے کہ مختلف کششیں اور دنیا کی رنگینیاں اسے اپنی طرف نہ کھینچیں، متزلزل نہ کریں، اس کے لیے باعثِ زحمت نہ بنیں۔ یہ مادی عشق و محبت اور ہوا و ہوس اس پر غالب نہ آجائے بلکہ ایمان کی سنگینی کے نتیجے میں آرام و سکون۔ لیکن انتہائی تیزی کے ساتھ مقصدِ انسانیت اور ہدفِ خلقت کی طرف حرکت کرے، یہ ہے اطمینان کا معنی۔

دوسرا لفظ «سکون» ہے۔ سکون بھی اسی معنی میں ہے۔ ﴿ثُمَّ أَنزَلَ اللهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ﴾[۱] خداوند متعال نے اپنے رسولؐ پر سکینہ (سکون و اطمینان) نازل کیا۔ قرآن کریم میں پانچ چھ مقامات پر یہ تعبیر آئی ہے۔

مثلاً ایک جنگ حنین[۲] میں۔ جنگ حنین میں جب پیغمبر خداؐ کے سپاہی ایک بے جا غرور کی وجہ سے، اپنی طاقت اور عددی کثرت پر مغرور ہونے کی وجہ سے اور یہ سوچ کر کہ آج کوئی ان پر غالب نہیں آسکے گا؛ اور خدا کی سنت کے مطابق غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے اور ہر مغرور گروہ غافل ہوگا اور نقصان اٹھائے گا، یہ (حضورؐ کے ساتھی) میدانِ جنگ میں غافل ہو گئے، حق بجانب بھی تھے ﴿إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ﴾[۳] زیادہ تھے، اور اس عددی کثرت نے انہیں غرور اور خودپسندی کا شکار کر دیا تھا کہ کمال ہے! ہماری اتنی بڑی تعداد ہے؟ ﴿فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا﴾ تمہارا یہی غرور باعث بنا کہ تم جنگ میں غافل ہو گئے اور شکست کھا گئے۔ دشمن سے شکست کھانے کے بعد، البتہ نہ حتمی اور آخری شکست، ایک معمولی اور چھوٹی سطح کی شکست کھائی اور پھر سنبھل گئے۔ چند اچھے سپاہیوں نے، چند لائق اور مومن

---

۱. سورہ مبارکہ توبہ: آیت ۲۶
۲. غزوہ حنین فتح مکہ کے بعد ہوا۔
۳. سورہ مبارکہ توبہ: آیت ۲۵

کمانڈروں نے، امیر المومنینؑ اور چند دوسرے افراد نے بہت زیادہ کوشش کے بعد شکست خوردہ سپاہیوں کو واپس میدان میں پلٹا دیا، وہاں پر پروردگار فرماتا ہے: ﴿ثُمَّ أَنزَلَ اللهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ﴾ خداوند متعال نے روحانی و قلبی آرام و سکون تمہیں لوٹا دیا؛ آرام و سکون۔

ایک مرتبہ اور اس وقت جب مسلمانوں نے اس درخت کے نیچے پیغمبر اکرمؐ سے اپنی بیعت کی تجدید کی۔[۱] ایک اور بار اس وقت جب پیغمبر خداؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی، اسلامی معاشرے کی تشکیل کے مقصد سے، کافروں اور دشمنوں کے لیے خطرناک ارادوں اور منصوبوں کے ساتھ، سینکڑوں مضبوط ارادوں اور عزائم کے ساتھ، سینکڑوں افکار کے ساتھ رسولِ خداؐ مدینہ جانے کے لیے مکہ سے نکلے۔ ان تمام اہداف، مقاصد، عزائم، افکار اور تدابیر کے وقوع پذیر ہونے کی شرط یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ صحیح و سالم مدینہ پہنچیں وگرنہ اگر راستے میں کفار انہیں قتل کر دیں، شہید کردیں تو ان خوابوں میں سے کوئی ایک بھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ آپؐ نے ایک غار میں پناہ لی، وہاں بھی خدا فرماتا ہے: ﴿فَأَنزَلَ اللهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ﴾[۲] خداوندِ متعال نے اس حساس موقع پر اپنے آرام و سکون کو اپنے حبیب کے قلب مطہر پہ نازل کیا۔ اسی طرح چند اور موارد بھی ہیں جہاں سکینہ (آرام و سکون) کی یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ مومن صاحبِ سکینہ (سکون) ہے، سکینہ اس معنی میں ہے؛ پس ایک بار پھر سکینہ: آرام، سکون، اطمینان، جمود، بے حسی اور خوابِ غفلت کا شکار ہونے کے معنی میں نہیں ہے۔

اور آخری کلمہ «امن» ہے۔ البتہ واضح ہے کہ یہاں پر مراد روحانی امن ہے نہ کہ اجتماعی اور معاشرتی امن۔ اجتماعی امن البتہ اس معنی میں ہے کہ ایک معاشرے میں تمام افراد امن و امان میں ہوں تاکہ ہر ایک اپنا حق حاصل کر سکے اور سکوت، جبری سکوت امن کے علاوہ ہے۔ امن یہ ہے کہ تمام لوگ مکمل امن و امان کے ساتھ اپنے جائز اور قانونی حقوق حاصل کر سکیں۔ یہ امن جس کی یہاں پر بات کر رہے ہیں اس امن کے علاوہ ہے جو اجتماعی مسائل اور اجتماعی امن کے سلسلے میں مدِ نظر

---

۱. صلح حدیبیہ کے دوران ہونے والی یہ تجدید بیعت «بیعت رضوان» کے نام سے مشہور ہوئی۔ سورہ مبارکہ فتح کی اٹھارویں آیت اسی بیعت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا﴾ یقیناً خدا صاحبانِ ایمان سے اس وقت راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے پھر اس نے وہ سب دیکھ لیا جو ان کے دلوں میں تھا تو ان پر سکون نازل کر دیا اور انہیں اس کے عوض قریبی فتح عنایت کردی۔

۲. سورہ مبارکہ توبہ: آیت ۴۰

ہوتا ہے۔ یہ امن یعنی روحانی امن، عدم تزلزل، عدم اضطراب، خوف و ہراس کا نہ ہونا۔ یہ تین جملے ہیں۔ اب قرآن کریم کی آیات کو دیکھیں کہ مومنین کے بارے میں ان تین صفات کے سلسلے میں کیا کہتی ہیں۔ سورہ رعد آیت نمبر ۲۸ اور ۲۹، دو مختصر آیات، ﴿اَلَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللهِ﴾ البتہ آیت شاید پچھلی آیات کا تسلسل ہے لیکن چونکہ ان آیات کے ذکر سے بات لمبی ہو جاتی، اس لیے انہیں چھوڑ رہا ہوں۔ ﴿اَلَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللهِ﴾ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جن کے دل ﴿بِذِكْرِ اللهِ﴾ یاد خدا کے ساتھ اطمینان حاصل کرتے ہیں، دیکھیں یہ یاد خدا وہی طاقتور جاذبہ اور کشش ہے، وہی جاذبہ کہ جس کے بارے ہم نے کہا کہ جھوٹے جاذبوں اور کششوں کو نابود کر دیتا ہے، انہیں بے اثر کر دیتا ہے، وہ یہی ذکر اللہ ہے۔ نماز کو کیوں اتنی زیادہ اہمیت دی گئی؟ یہ کیوں کہا گیا کہ اگر نماز قبول نہ ہوئی تو دوسرے اعمال بھی قبول نہیں ہوں گے؟ کیوں حج کے بارے میں کہا گیا کہ زندگی میں صرف ایک بار، روزے کے بارے میں کہا گیا سال میں ایک بار، زکوٰۃ کے بارے میں کہا گیا خاص مورد میں، خمس کے بارے بھی ایسے ہی، دوسری عبادات بھی اسی طرح، لیکن نماز کے بارے میں کہا گیا ہر روز، وہ بھی پانچ مرتبہ اور اگر زیادہ نماز پڑھیں تو اور بہتر؛ ایسا کیوں کہا گیا ہے؟ اس لیے کہ نماز، ذکر خدا کا کیپسول ہے۔ نماز ابتدا سے لے کر آخر تک ذکر اللہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بھی ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾[۱] کہ نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکنے والی ہے، کے بعد فرماتا ہے ﴿وَلَذِكْرُ اللهِ أَكْبَرُ﴾ خدا کی یاد اور ذکر بالاتر ہے۔ نماز کا یہ پہلو انتہائی اہم ہے کہ وہ یاد خدا ہے، یہ بالاتر ہے، نماز کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے اور ﴿ذِكْرِ اللهِ﴾ کی خاصیت یہ ہے: خدا کی یاد، خدا کی طرف توجہ، ہمیشہ خدا کو دیکھنا، پہچاننا اور اپنے ساتھ سمجھنا اس کی اہم ترین خاصیتوں میں سے ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ چیز تمام کاموں میں، سب مسائل میں دل کو اضطراب، پریشانیوں، وسوسوں اور مختلف جاذبوں اور کششوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہ دل پُر سکون ہو جاتا ہے جس طرح بپھری ہوئی موجوں میں گھری کشتی پر اگر وزن ڈال دیا جائے تو وہ اسے بھاری اور سنگین کر دیتا ہے اور اس کی حرکت اور اضطراب کو کم کر دیتا ہے۔ ذکر خدا یہ ہے۔ ﴿اَلَّذِينَ آمَنُوا﴾ جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل یادِ خدا سے مطمئن اور ثابت قدم ہوگئے، ثابت قدم کو جان بوجھ کر یہاں پر لائے ہیں؛

---

۱. سورہ مبارکہ عنکبوت: آیت ۴۵

ثبات یعنی آرام و سکون کی حالت، لوگوں کی خدا کی طرف ہدایت کی جاتی ہے۔ یہ ترجمہ پچھلی آیت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کیا ہے۔ ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ بےشک خدا کی یاد کے ذریعے دل مطمئن اور پُرسکون ہوتے ہیں۔ خدا کی یاد یہ عجیب خاصیت رکھتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ایک انسان کی کامیابی و کامرانی کیلیے اطمینان اور آرام و سکون کتنا موئثر ہے۔ مومن کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اسے یہ عجیب روحانی طاقت اور سہولت میسر ہے۔ آیت کا اگلا حصہ ہے ﴿اَلَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ﴾ جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دیے ﴿طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ﴾ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اور شائستہ اعمال انجام دیے (شائستہ عمل، یعنی ایمان کے تقاضوں کو پورا کیا) ان کا حال مبارک ہو اور مستقبل روشن اور آباد۔

منادی توحید حضرت ابراہیم خلیل الرحمانؑ قدیم زمانے میں اپنی قوم اور امت سے مجادلہ و مناظرہ اور بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے اور ان کی باتوں کا جواب دیتے تھے۔ قرآن کریم ان کی قوم کی کٹ حجتیوں کو نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ﴿وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ﴾[1] اور حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے ان کے ساتھ کٹ حجتی کی، مجادلہ کیا، ان کے ساتھ بحث کرنا شروع کی۔ قرآن نہیں کہتا کہ انہوں نے کیا کہا، کس طرح حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بحث کی، ان کا مدعا کیا تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ نے جو جواب انہیں دیا اور جسے قرآن نقل فرما رہا ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا مدعا کیا تھا۔

جب انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بحث مباحثہ اور کٹ حجتی شروع کی تو ﴿قَالَ﴾ حضرت ابراہیمؑ نے کہا: ﴿أَتُحَاجُّونِّي فِي اللهِ﴾ کیا تم میرے ساتھ خدا کے بارے میں مجادلہ اور بحث کر رہے ہو؟ ﴿وَقَدْ هَدَانِ﴾ حالانکہ خدا نے میری ہدایت کی ہے؛ یعنی میں واضح اور روشن ہوں، مجھے اپنے راستے کی حقانیت میں کوئی شک و تردید نہیں ہے کہ تم اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے ساتھ مباحثہ و مجادلہ کر کے مجھے اس راستے سے واپس لوٹا دو۔ ﴿وَقَدْ هَدَانِ﴾ میں ہدایت یافتہ ہوں، راہ یافتہ ہوں، واضح و روشن ہوں، جانتا ہوں کہ کیا کر رہا ہوں۔ ﴿وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا﴾ اور جسے تم نے خدا کا شریک قرار دیا ہے، مجھے اس کا کوئی ڈر خوف نہیں ہے مگر یہ کہ خدا میرے بارے میں کسی چیز کا ارادہ فرمائے؛ یعنی در حقیقت میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ اس جواب سے پتا چلتا ہے کہ وہ لوگ حضرت ابراہیمؑ سے کہتے

---

۱. سورہ مبارکہ انعام: آیات ۸۰ سے ۸۲

تھے کہ اے ابراہیم! ان سے ڈرو جنہیں ہم نے خدا کا شریک قرار دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جواب میں فرماتے ہیں: میں ان سے نہیں ڈرتا ہوں، ان سے مجھے کسی قسم کا خوف نہیں ہے۔ آیت کے اگلے حصے اور حضرت ابراہیمؑ کے کلام سے یہ بات زیادہ واضح اور روشن ہوجاتی ہے۔

﴿وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ میرے پروردگار کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ﴿وَسِعَ﴾ یعنی وسیع ہے، گھیرے ہوئے ہے، احاطہ کیے ہوئے ﴿رَبِّي﴾ میرا پروردگار، ﴿كُلَّ شَيْءٍ﴾ ہر چیز کا ﴿عِلْمًا﴾ علم و دانش کے لحاظ سے۔ اس کا سلیس اور سادہ ترجمہ وہی بنتا ہے جو ہم نے یہاں لکھا ہے کہ میرے پروردگار کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ﴿أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ﴾ اس کے باوجود کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ہے؟ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں: ﴿وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا﴾ یہاں پر زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ کس چیز پر بحث کر رہے تھے۔ حضرت ابراہیم فرماتے ہیں: میں کیسے ڈروں؟ تمہیں ڈرنا چاہئے۔ کیا میں ان سے ڈروں کہ جنہیں تم نے کسی دلیل کے بغیر خدا کی حکومت و سلطنت اور اس کے امر و خلقت میں اس کا شریک و رقیب قرار دیا ہے جب کہ خدا نے میری ہدایت فرمائی ہے، اور بات میرے لیے واضح ہے، اور تم اس چیز سے نہ ڈرو کہ تم کسی دلیل کے بغیر، کسی منطق کے بغیر، کسی عقلی برہان کے بغیر بعض (بتوں یا لوگوں) کو پروردگارِ عالَم کا شریک و رقیب قرار دیتے ہو؟ تمہیں ڈرنا چاہیے نہ کہ مجھے۔ یہاں سے پتا چلتا ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بحث میں یہ کہتے تھے کہ آپ ڈریں! ڈریں! کس سے ڈریں؟ کس چیز سے ڈریں؟ کیا خدا کے بے جان شرکاء سے یا خدا کے جاندار شرکاء سے یا دونوں سے؟ یہ معلوم نہیں ہے۔ کن شرکاء سے ڈرنے کا کہتے تھے یہ واضح نہیں ہے۔

اس کے بعد ہے: ﴿فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ ہم یا تم؛ میں اس چیز کا زیادہ سزاوار ہوں کہ روحانی طور پر امن و سکون میں ہوں، ذہنی طور پر آسودہ خاطر ہوں، کوئی فکر اور پریشانی میرے دامنگیر نہ ہو یا تم؟ میں کہ جس کا دل خدا سے وابستہ ہے (حضرت ابراہیمؑ فرما رہے ہیں) میں جو خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ ہوں، مجھے کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے یا تجھ بیچارے کو؟ جس کے پاس اپنے راستے اور کام کی کوئی دلیل اور حجت نہیں ہے۔ میرے لیے تو بات واضح ہے ﴿فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ ہم میں سے کون امن و سکون کا سزاوار اور حقدار ہے، میں ابراہیم یا

تو بت پرست؟ حضرت ابراہیمؑ فرماتے تھے: میں کہ جس نے خدا کو پہچان لیا ہے اور آگاہی و بصیرت اور معرفت کے ساتھ اس کی طرف گیا ہوں یا تم لوگ کہ جن کے پاس اپنی غلط سوچ اور باطل فکر پر کوئی دلیل نہیں ہے، اگرچہ تم جانتے ہو! ﴿إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ یعنی معلوم ہے کہ نتیجہ کیا ہے، معلوم ہے کہ جواب کیا ہے، معلوم ہے کہ کون بےچینی و بےسکونی اور خوف و پریشانی کا شکار ہے اور کون ان بدبختیوں سے امان میں ہے، آسودہ خاطر ہے اور مطمئن ہے۔

اور آخر میں خدا فرماتا ہے کہ ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ﴾ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم و ستم سے آلودہ نہ کیا تو انہی کیلیے امن و سکون ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔ یہ امن کے بارے میں۔

اور چوتھی نوید ہے مفید اور ثمر آور ہونا۔ وہ چیزیں جو اگر منزل و ہدف اور توحید کے راہی کے پاس ہوں تو بہتر طور پر حرکت کر سکتا ہے اور اس کے منزل تک پہنچنے کا امکان بڑھ جاتا ہے اور اگر نہ ہوں تو منزل کی طرف آہستگی سے چلتا ہے اور مقصد تک نہ پہنچ سکنے کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے، ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ اپنے کام کو مفید اور ثمر آور سمجھے یا نہ سمجھے۔ اگر مفید سمجھا اس راستے کو؛ اپنی حرکت کو، اپنے کام کو، اپنی محنت کو اور یہ محسوس کیا کہ اس کی کوشش رائیگاں نہیں جائے گی، اس کا عمل ضائع نہیں ہوگا، اس کی حرکت اور قدم پر ایک اثر مرتّب ہوگا تو اس کی ہر حرکت ایک موج اور لہر پیدا کرے گی، تو وہ بڑھے گا، بہتر انداز میں کام کرے گا، کم تھکے گا، زیادہ آرام سے حرکت کرے گا اور اگر یقین نہیں ہوگا تو پھر اس کا خدا ہی حافظ ہے! مومن اس طرح ہے، مومن اپنے کام کو مفید سمجھتا ہے اور یہ چیز اسے قرآن نے سکھائی ہے۔ قرآن میں اس کے بہت سے موارد ہیں ﴿إِنَّ اللهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾[1]، ﴿أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا﴾[2] قرآن کی ابتدا سے انتہا تک اس مطلب کی بہت سی آیات ہیں۔ میں قرآن کے شروع میں سورۂ بقرہ سے ایک آیت لایا ہوں۔ آیت قبلہ کے بارے میں ہے۔ پہلے مختصر طور پر قبلہ کی تاریخ عرض کردوں۔ جب مسلمان مکہ میں تھے تو خانۂ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ ہجرت سے پہلے نماز کیلیے، عبادت کیلیے خانۂ کعبہ کی طرف رخ کرتے تھے۔

---

۱. سورہ مبارکہ ھود: آیت ۱۱۵

۲. سورہ مبارکہ کہف: آیت ۳۰

جب مدینہ آئے تو شروع شروع میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے؛ البتہ خدا کے حکم سے۔ وہی کام جو یہودی بھی کرتے تھے۔ اسی زمانے میں مدینہ کے یہودی بھی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے عبادت کرتے تھے، مسلمان بھی اسی طرح۔ کچھ عرصے بعد آیت نازل ہوئی: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾[1] خانۂ خدا کی طرف پھر جا، کعبہ کی طرف، مسجد الحرام کی طرف۔ اور اس کے بعد مسلمانوں نے کعبہ کی طرف نماز پڑھنا شروع کر دی۔ قبلہ کی داستان سورۂ بقرہ کے اوائل میں تفصیلی طور پر آئی ہے۔

ان آیات میں سے ایک آیت یہ ہے کہ خداوند متعال پیغمبر اکرمؐ اور مومنین سے فرماتا ہے کہ مکہ سے مدینہ آنے کے بعد شروع شروع میں بیت المقدس کو تمہارا قبلہ قرار دینے کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے چاہا کہ تمہارا ایک امتحان لیا جائے۔ تم مسلمان ہونے سے پہلے جب مکہ میں تھے تو اس وقت بھی خانۂ کعبہ کی حرمت کے قائل تھے، اس کی قداست کے قائل تھے، مسلمان ہونے کے بعد بھی مکہ میں تمہاری نماز خانۂ کعبہ کی طرف تھی، اب جبکہ تم لوگ مدینہ میں آئے تو ہم نے چاہا کہ ایک جدی پشتی سنت اور روش کو یکایک تم سے چھین لیں۔ یہ نہ سمجھو کہ مدینہ میں آنے کے بعد شروع شروع میں جو نمازیں تم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی تھیں وہ ہمارے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتیں، وہ ہمیں قبول نہیں ہیں اور قبلۂ بیت المقدس، باطل قبلہ تھا؛ نہیں، ہرگز ایسا نہیں ہے۔ جو کام تم نے کئے وہ سب اپنی جگہ پر منظور و مقبول ہیں۔ تم مومنوں کی سعی و کوشش چاہے وہ قبلہ کے بارے میں ہو یا دوسرے مسائل کے سلسلے میں، اسے ہماری تائید و تصدیق حاصل ہے اور اس کا اجر و ثواب ہمارے ہاں محفوظ ہے۔ درمیان میں یہ جو فاصلہ پیدا ہوا تو یہ اس لئے تھا کہ ہم تمہارا امتحان لیں۔ آیت اس پس منظر میں ہے۔ اب دیکھیں کہ ہم آیت کے کون سے حصے سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا﴾[2] اے پیغمبر! ہم نے قرار نہیں دیا اس قبلہ کو کہ جس پر تم تھے (جس کی طرف رخ کر کے تم نماز پڑھتے تھے) یعنی بیت المقدس، پس آیت کب نازل ہوئی تھی؟ اس وقت جب بیت المقدس سے کعبہ کی طرف پھرے تھے، کعبہ کی طرف نماز پڑھتے تھے۔ خدا فرما رہا ہے

---

۱. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۱۴۴، ۱۴۹ اور ۱۵۰

۲. سورہ مبارکہ بقرہ، آیت ۱۴۳

کہ وہ قبلہ کہ تم پہلے جس کی طرف رخ کرتے تھے یعنی بیت المقدس، اسے ہم نے کس لیے قبلہ قرار دیا تھا؟ ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا﴾ ہم نے اسے قبلہ قرار نہیں دیا تھا کہ جس پر تم پہلے تھے ﴿إِلَّا لِنَعْلَمَ﴾ مگر اس لئے کہ معلوم ہوجائے ﴿مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ﴾ کہ وہ لوگ جو پیغمبرؐ کی پیروی کرتے ہیں ان لوگوں سے جدا، علیحدہ اور معین و معلوم ہوجائیں جو اپنے گذشتگان کی طرف میلان و رجحان رکھتے ہیں اور ماضی کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ پس یہ تمہارا ایک امتحان لیا ہے۔
ہم نے آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: تمہارا پہلا قبلہ (بیت المُقدّس یا بیت المقدَس) ہم نے معین نہیں کیا تھا مگر اس لیے کہ پیغمبرؐ کے حقیقی پیروکار، زمانہ جاہلیت کی سنتوں اور رسموں کے پیچھے چلنے والوں سے علیحدہ، ممتاز اور معلوم و معیّن ہوجائیں۔ ﴿وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللهُ﴾ اگرچہ یہ (تحویل قبلہ کا مسئلہ) بہت بڑا، مہم، سخت اور گراں لگ رہا تھا مگر جن لوگوں کی خدا نے ہدایت کی ہے، جن کے دلوں کی ہدایت ہو چکی ہے ان کیلیے یہ مسئلہ معمولی تھا، اسے برداشت کر سکتے تھے؛ لیکن جن کی ہدایت نہیں ہوئی، وہ نہیں۔

آیت کا اگلا حصہ: ﴿وَمَا كَانَ اللهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ اس حصے کو ہم اپنے مطلوب و مقصود پر بطور دلیل و سند لانا چاہتے ہیں۔ اور خدا ہرگز تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرتا۔ ایسا نہ تھا کہ تمہارا ایمان، تمہارا عمل اور تمہارا کام ضائع، باطل اور بےاثر و بے نتیجہ رہ جائے۔ کچھ عرصے کیلیے تم ایک جگہ رک جاؤ یا آگے نہ بڑھو۔ نہیں! تمہارے ہر قدم اور تمہاری ہر حرکت نے تمہیں ایک قدم مطلوب و مقصود اور منزل کے نزدیک کردیا ہے۔ پس تمہارا ایمان ضائع نہیں ہوا۔ ﴿إِنَّ اللهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ بےشک خدا انسانوں پر مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

دوسرا باب

توحید

آٹھویں نشست

توحید؛ اسلامی تصورِ کائنات کے آئینے میں

۹ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری ۱۹۷۴-۰۹-۲۶

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿اللهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾ (سورہ بقرہ/۲۵۵)

گذشتہ بحثوں کو نہ بھولیں جن میں ہم نے کہا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ دینی افکار و اصولوں میں سے ہر فکر اور ہر اصول پر ایمان، علم و آگہی کے ساتھ ہونا چاہیے، فہم و ادراک، شعور اور بصیرت کے ساتھ ہونا چاہیے نہ کہ اندھا دھند؛ اور دوسری بات یہ کہ ایمان، احساس ذمہ داری کے ساتھ ہونا چاہیے۔ وہ چیز کہ جس پہ ہمیں ایمان لانا چاہیے یقیناً وہ چیز ہماری زندگی میں، ہمارے عمل میں چاہے وہ عمل انفرادی ہو یا اجتماعی، چاہے اس کا تعلق ہماری ذات سے ہو یا ہمارے معاشرے سے، خواہ وہ عالمِ بشریت سے مربوط ہو یا آنے والی تاریخ سے، یقیناً وہ ہمارے شانوں پہ ایک ذمہ داری ڈالتی ہے۔ اس تمہید کے ساتھ جب ہم توحید کی بحث شروع کرتے ہیں تو یقیناً یہ بحث ہمارے لیے ایک ذمہ داری لانے والی بحث بن جاتی ہے اور ہم اس انداز سے توحید کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں کہ ایک تو ہم مکمل آگہی اور بصیرت کے ساتھ توحید تک پہنچیں اور دوسری بات یہ کہ دیکھیں کہ وہ کون سی ذمہ داریاں ہیں جو توحید ہمارے کندھوں پہ ڈالتی ہے۔ کیا توحید کسی بھی قسم کی ذمہ داری کے بغیر صرف ایک فہم (سمجھنے) کا نام ہے؟ کیا توحید محض ایک حقیقت کے جان لینے کا نام ہے بغیر اس کے کہ وہ جاننا ہمارے کندھوں پہ کوئی ذمہ داری ڈالے؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ توحید اس آگہی اور بصیرت کا نام ہے کہ جس

کے بعد انسان کے شانوں پر بہت زیادہ ذمہ داریاں آن پڑتی ہیں۔ جب ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کریں گے تو اس سوال کا جواب پا لیں گے۔

توحید کو ہم نے دو زاویوں سے مدِ نظر رکھا اور مورد بحث قرار دیا۔ سب سے پہلے تو توحید کو اسلام کے تصورِ کائنات (Worldview) میں موردِ بحث قرار دیا۔ اس میں شک نہیں کہ توحید، اسلام کے تصورِ کائنات میں ہے۔ اسلام کے تصورِ کائنات میں توحید کیا ہے اور کس معنی میں ہے اور قرآنِ صامت کی آیات اور قرآنِ ناطق کی روایات اس توحید کی کیا تشریح اور تفسیر کرتی ہیں جو اسلامی تصورِ کائنات میں مدِّ نظر ہے؟ اور دوسری بحث کو اس طرح پیش کیا کہ اسلام کی آئیڈیالوجی میں توحید کیا ہے۔ کیونکہ توحید جہاں اسلامی تصورِ کائنات کا حصہ ہے وہاں اسلام کی زندگی ساز آئیڈیالوجی کا حصہ بھی ہے۔

ان کے علاوہ اسلام کے فروعی قوانین و ضوابط میں سے ہر ایک میں توحید اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اور آپ جہاں پر بھی دین کے نام پر ایک ایسا حکم، قانون اور ضابطہ دیکھیں کہ جس میں توحید کا جلوہ کم ہے یا اس میں توحید کے خلاف کوئی چیز پائی جاتی ہے اور اس میں سرے سے توحید ہے ہی نہیں تو جان لیجیے کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ کیونکہ توحید تمام اسلامی قوانین و ضوابط کے پیکر میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔

توحید، اس عمارت کے تمام اجزاء میں نرم و لطیف ہوا کی طرح موجود ہے کہ جس عمارت کا نام اسلام ہے۔ توحید، اسلام کے جسم میں حتی کہ اس کی باریک رگوں میں بھی پاک و پاکیزہ، صاف اور تازہ خون کی طرح موجود ہے۔ آپ اسلام کا کوئی ایک حکم بھی ایسا نہیں دکھا سکتے جس میں توحید کا رنگ اور توحید کی نشانی نہ پائی جائے۔ آج کی بحث اسلامی تصورِ کائنات میں توحید کے بارے میں ہے۔

اسلامی تصورِ کائنات سے کیا مراد ہے؟ آپ جب ایک انسان کے طور پر اس کائنات اور انسان کے بارے میں اپنی فکر اور ادراک کی طرف رجوع کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں کچھ تصورات و خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ ممکن ہے آپ نے یہ فکر نہ کی ہو لیکن جو شخص اس فکر میں ہے جب وہ کائنات کے بارے میں سوچتا ہے، انسان کے بارے میں فکر کرتا ہے، کائنات اور انسان کے درمیان رابطے اور تعلق کے بارے میں غور کرتا ہے، اس مادی جہان اور انسان و کائنات سے ماورا کسی چیز کے بارے میں تأمل کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کچھ افکار و تصورات پیدا ہوتے ہیں، انہی کو جہان بینی یا تصورِ

کائنات کہا جاتا ہے۔ ہر مکتب اس کائنات کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر، فکر اور سوچ رکھتا ہے؛ کائنات کے بارے میں اسی نقطۂ نظر، فکر، سوچ اور کائنات کو دیکھنے کی اسی کیفیت کا نام تصورِ کائنات ہے۔ بطور خلاصہ تصورِ کائنات کی، اس طرح تعریف کی جاسکتی ہے کہ تصورِ کائنات یعنی ایک انسان کا کائنات کے بارے میں نقطۂ نظر، ایک انسان کا کائنات کے بارے میں فہم، ایک انسان کا کائنات یا دوسرے انسان کے بارے میں ادراک۔ ہم نے کہا کہ ایک انسان کا نقطۂ نظر؛ آپ ایک انسان کی جگہ پر ایک مکتب، ایک مسلک، ایک دین یا ایک اجتماعی رویے کو بھی رکھ سکتے ہیں۔ کائنات کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو تصورِ کائنات کہا جاتا ہے۔ اسلام کا ایک تصورِ کائنات ہے، اسلام کائنات کے بارے میں ایک نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ کائنات کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر جس حد تک ہماری توحید کی بحث ے مربوط ہے، اسے میں اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔

اسلام کا عقیدہ اور نظریہ یہ ہے کہ موجودات و مخلوقات کا یہ مجموعہ جس کا نام کائنات ہے، اوپر سے نیچے تک، معمولی اور حقیر چیزوں سے لے کر غیر معمولی اور عظیم چیزوں تک، پست‌ترین جاندار یا بے جان اشیاء سے لے کر جاندار اور عقل و خرد سے بہرہ مند، با شرف و باعظمت‌ترین اور طاقتورترین مخلوق یعنی انسان تک، سب کے سب اور اس کائنات کی ہر چیز ایک بہت عظیم طاقت و قدرت سے وابستہ اور اس کی مخلوق اور غلام ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جسے میں اور آپ دیکھتے ہیں اس سے ماورا، سائنس اور تجرباتی علوم کی تیزبین اور دوربین نگاہوں کی جہاں تک رسائی ہے اس سے ماورا اور تمام قابلِ حس اور قابلِ لمس مظاہر سے ماورا ایک حقیقت ہے جو تمام حقیقتوں سے برتر، اعلیٰ تر، با شرف تر اور عزیز تر ہے اور کائنات کے تمام مظاہر اسی کے دستِ قدرت کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس ارفع و اعلیٰ طاقت کو ہم ایک نام دیتے ہیں؛ اس کا نام خدا ہے، اس کا نام اللہ ہے۔

پس کائنات ایک ایسی حقیقت ہے جو خود بخود مستقل نہیں ہے؛ اس نے خود اپنے آپ کو وجود نہیں بخشا ہے، وہ خود اپنے اندر سے پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ ایک طاقتور ہاتھ نے ان مختلف مظاہر اور موجودات کو (جو کہ علم کی روز افزوں پیشرفت کے نتیجے میں اپنے آپ کو زیادہ نمایاں کر رہے ہیں) پیدا کیا ہے۔ ایک طاقتور اور قدرتمند ہاتھ ہے کہ جس نے ذرّے اور ایٹم کے دل میں وہ تلاطم ایجاد کیا ہے اور نامعلوم اور مجہول عالَم ہائے بالا میں کہکشاؤں اور ان کہکشاؤں کے اس پار ممکن ہے کہ اب تک جو کچھ

دریافت ہوا ہے اس سے اربوں گنا زیادہ قابلِ دریافت چیزیں موجود ہوں، ان سب کو خلق کیا ہے۔ اس کارخانے کا کوئی بنانے والا ہے، اس مشینری کا کوئی چلانے والا ہے، اتفاقی نہیں ہے، خود بخود نہیں ہے۔ اسلام کائنات کو ایک ایسی چیز سمجھتا ہے۔

یہ سب توحید کے سلسلے میں اسلام کے تصورِ کائنات (Worldview) کا مواد ہے کہ جسے میں، اسی طرح اختصار کے ساتھ تھوڑا تھوڑا بیان کروں گا۔وہ خدا جو کہ کائنات اور کائنات والوں سے بالاتر ہے، وہ طاقتور ہاتھ جو کائنات کی ہر چیز کو چلا رہا ہے اور ہر چیز کو اسی نے بنایا ہے اور ہر چیز کو ہر آن وہی باقی رکھے ہوئے ہے؛ وہ طاقتور ہاتھ (کہ جس کا نام اللہ ہے، جس کا نام خدا ہے) ذاتی طور پر تمام نیک اور نیکی آفریں صفات سے متّصف ہے؛ یعنی علم رکھتا ہے، قدرت اور طاقت رکھتا ہے، حیات اور زندگی رکھتا ہے، ارادہ رکھتا ہے اور ہر وہ چیز جو ان صفات سے جنم لیتی ہے۔ اس کی زندگی کسی اور سے نہیں لی گئی ہے، اس کا علم کہیں اور سے ماخوذ نہیں ہے اور اسی طرح کی اور باتیں۔

کائنات کا اختیار اسی کے پاس ہے۔ کائنات والے کون ہیں؟ کائنات کے ذرّات اس کے مقابلے میں کیا ہیں؟ کائنات کے ذرّات جب اس کے بنائے ہوئے ہیں تو کیا جس طرح ایک بچہ ماں سے علیحدہ ہو جاتا ہے، وہ بھی اسی طرح اس سے جدا اور علیحدہ ہو گئے؟ نہیں، اصولاً معاملہ اس طرح نہیں ہے۔ یہ ہر لمحہ رہنے اور ہونے کے لیے اس کے محتاج ہیں۔ اس کی قدرت اور اس کے ارادے کے محتاج ہیں، سب اسی کے بندے ہیں۔ تمام موجودات اسی کے بندے، غلام اور مصنوع و مخلوق ہیں۔ وہ سب میں تصرّف کر سکتا ہے۔ اس نے سب کو ایک خاص نظم کے تحت خلق فرمایا ہے، سب کو منظم اور دقیق قوانین و ضوابط کے تحت پیدا کیا ہے۔

جب ہم قرآن کریم کی آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ پروردگارِ عالَم نے ہوبہو یہی مطلب قرآنی آیات میں ذکر کیا ہے۔ قرآن کریم کے دو مقامات سے ہم نے چند آیات کو مدِّنظر رکھا ہے کہ جن کی آج تلاوت کی جائے گی اور پھر ان کا ترجمہ کیا جائے گا۔ ایک سورۂ بقرہ کی وہ آیت ہے جو آیت الکرسی کے نام سے معروف ہے۔ آیت الکرسی کا پہلا حصہ اسی سلسلے میں ہے کہ اب ہم جس کی تلاوت اور ترجمہ کرتے ہیں اور اس میں تدبّر کرتے ہیں۔ آیت نمبر ۲۵۵ ہے:

﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ اللّٰہُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ﴾ اللہ یہ نام کہ جس کی تشریح و توضیح کے لیے کوئی مترادف

لفظ تلاش نہیں کیا جا سکتا؛ کیا ہے اللہ؟ خدا ہے۔ خدا کون ہے؟ وہ موجود ہے کہ ﴿لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ﴾ جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ الہٰ کا معنی آپ معبود کریں۔ الہٰ یعنی ہر وہ موجود کہ جس کے سامنے انسان تقدیس اور تعظیم و تکریم کی صورت میں خضوع و خشوع کرتا ہے، اپنا اختیار اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے، زندگی کی باگ ڈور اس کے حوالے کر دیتا ہے، اسے اپنی زندگی کے تمام امور میں مطلق العنان اور صاحب اختیار سمجھتا ہے، اسے قرآنی اصطلاح میں کہتے ہیں الہٰ۔ جو لوگ زندگی کی باگ ڈور نفس کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں ان کا الہٰ بھی نفس ہی ہے۔ جو لوگ اپنی زندگی کے تمام امور ایک ظالم و جابر اور باغی و سرکش انسان کے سپرد کر دیتے ہیں تو ان کا الہٰ بھی وہی انسان ہے۔ وہ لوگ جو غلط رسوم اور بے بنیاد عقائد کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں تو ان کا الہٰ بھی وہی غلط رسم اور بے بنیاد عقیدہ ہی ہے۔ جو چیز بھی انسان کے وجود اور انسان کی زندگی میں بغیر کسی قید و بند کے حکومت کرے اوراس پر حکم چلائے وہی اس کا الہٰ ہے۔

یہاں فرما رہا ہے کہ ﴿لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ﴾ اس کے علاوہ کوئی الہٰ اور کوئی معبود نہیں ہے۔ نہیں ہے یعنی کیا مطلب؟ یعنی دنیا میں نہیں ہے؟ دنیا میں ہزاروں معبود تھے، تین سو ساٹھ تو صرف کعبہ کے اندر رکھے اور لٹکے ہوئے تھے، تین سو ساٹھ بے جان پتلے۔ اتنے ہی جاندار پتلے دنیا پر حکومت کر رہے تھے؛ پس کس طرح کوئی الہٰ نہیں ہے! پس یہ جو فرما رہا ہے ﴿لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ﴾ کہ اس کے علاوہ کوئی الہٰ نہیں ہے؛ یعنی حقیقی الہٰ نہیں ہے، قانونی الہٰ نہیں ہے، واقعی الہٰ نہیں ہے؛ یعنی اللہ کے علاوہ جس کو بھی آپ نے الوہیّت (اس معنی میں جو ہم نے ذکر کیا) اور معبودیّت کے لیے قبول کیا تو آپ نے گناہ کیا اور حق کے خلاف کام انجام دیا؛ اس لیے کہ اللہ کے علاوہ کوئی بھی معبود ہونے اور الوہیّت کے لائق نہیں ہے۔

﴿اللهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ﴾ اس اللہ، اس واحد اور احد الہٰ کی خصوصیت کیا ہے؟ اس کی چند خصوصیات کو شمار فرماتا ہے: ﴿اَلْحَيّ﴾ زندہ ہے؛ سب مردہ ہیں، دوسرے مردہ موجودات اور مردار ہیں، وہ زندہ ہے، بے جان تو واضح ہے یہاں تک کہ جاندار بھی مردہ ہیں۔ وہ جاندار جو ایک دن نہ تھے اور پھر ایک دن نہیں ہوں گے، وہ جاندار کہ جس کی جان ہمیشہ خطرے کی زد میں ہے، وہ زندہ موجود کہ جس کی زندگی بعض اوقات ایک معمولی سی حرکت سے نیست و نابود ہوجاتی ہے، تو یہ کیسی زندگی ہے؟ زندۂ جاوید، اصلی زندہ اور حقیقی زندہ وہ ہے کہ زندگی جس کے لیے ہے (زندگی جس کی ذاتی ہے نہ کہ کسی اور سے

مستعار لی ہوئی) اور تمام جانداروں کی زندگی اسی کی طرف سے عطیہ، ہدیہ اور تحفہ ہے، اور وہ خدا ہے۔ ﴿اَلْحَیُّ﴾ وہ زندہ ﴿اَلْقَیُّومُ﴾ وہ پائیدار اور پائندہ، وہ کہ جس کی زندگی دائمی اور ہمیشگی ہے۔ وہ کہ سب زندہ جس کی زندگی سے زندہ ہیں۔ اور اگر وہ نہ ہو، اگر وہ نہ چاہے، اگر وہ ارادہ نہ کرے تو دنیا میں کوئی ایک بھی زندہ اور زندگی کا کوئی ایک بھی جلوہ باقی نہیں رہے گا، ﴿اَلْقَیُّومُ﴾۔

﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ نہ تو اسے اونگھ آتی ہے اور نہ ہی نیند؛ ہلکی نیند (اونگھ) بھی نہیں آتی، گہری نیند تو دور کی بات ہے۔ اسے اپنے آپ سے غافل نہیں کرتی، یعنی کیا؟ یعنی اس کے وجود اور اس کی زندگی میں ایک لمحے کی بھی غفلت اور ایک لحظے کی بھی بے توجہی کا امکان نہیں ہے۔ دوسرے موجودات، خدائی کے جھوٹے دعویدار غفلت کرتے ہیں اپنے آپ سے، اپنے زیرِ نظر اور ماتحت لوگوں سے، اس دنیا سے جو ان کے قبضے میں ہے، سر تا پا غفلت میں ہیں، ہمیشہ غفلت میں ہیں، جہاں پر علم و آگہی کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کی آگہی اور اطلاع جھوٹی ہے۔ جو چیز ان پر مسلّط اور غالب ہے وہ غفلت اور جہالت و نادانی ہے۔

﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ آپ کے ذہن میں یہ نہ آئے کہ ﴿سِنَةٌ﴾ یعنی اونگھ، ہلکی نیند اور ﴿نَوْمٌ﴾ یعنی معمولی یا گہری نیند کی خدا سے نفی کرنے کی یہاں پر کیا ضرورت تھی؟ کیوں؟؛ بعد کی بحثوں میں دیکھیں گے۔ کیونکہ توحید میں ہر اشارہ، توحید میں ہر نکتہ غیر خدا کی الوہیّت کی نفی کی طرف اور غیر خدا کے نقائص کی طرف اشارہ ہے۔ جو کچھ خدا کے بارے میں ثابت کیا جاتا ہے اس کی الوہیّت کے جھوٹے دعویداروں سے نفی کی جاتی ہے۔ جو کچھ توحید کے بارے میں کہا جاتا ہے اس کی جھلک موحّدین اور خدا پرستوں کی عملی زندگی میں نظر آنی چاہیے۔ توحید کی تمام خصوصیات اور دقائق و ظرائف کے نمونے موحّد لوگوں کی زندگی میں پائے جانے چاہئیں کہ یہ چیز آئندہ بحثوں اور تلاوتوں میں آئے گی۔ بنا بر یں ﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّومُ﴾ اشارہ ہے جھوٹے خداؤں کی غفلتوں، نیندوں اور بے خودیوں کی طرف۔

﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے؛ اس کی ملکیت ہے، اس کی غلام ہے۔ ﴿مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ کون ہے جو اس کے مقابلے میں شفاعت کرے، وساطت کرے سوائے اس کے اذن کے۔ کوئی اور ایسی طاقت نہیں ہے جو کہ ایک شفیع (شفاعت کرنے والے) کی حد تک بھی خدا کے مقابلے میں آسکے۔

اگر کوئی دوسروں کی شفاعت کرتا ہے تو وہ بھی خدا کے اذن سے کرتا ہے۔ ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، سب کو جانتا ہے؛ یعنی تمام انسانوں اور دوسری موجودات و مخلوقات کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ ان کا علم پروردگارِ عالَم کے علم کے کسی بھی حصے کا احاطہ نہیں کر سکتا مگر جس حد تک وہ خود چاہے۔ ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾ اس کی مسندِ اقتدار آسمانوں اور زمین تک پھیلی ہوئی ہے۔ ﴿وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا﴾ آسمانوں اور زمین کی حفاظت اس کے لیے مشکل اور سخت نہیں ہے۔ ﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾ وہ بلند و برتر اور عظیم ہے۔

اب تک کی گفتگو سے خدا کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے، وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ پوری کائنات اور عالَمِ وجود میں ایک خدا نامی طاقت ہے، خدا کے نام سے طاقت و قدرت کا ایک مرکز ہے، علم و حیات اور طاقت و قدرت کا ایک مرکز ہے اور دوسری طرف تمام مخلوقات و موجودات اس عظیم و جلیل طاقت کی طرف مسکینی و بے چارگی اور عبودیت و بندگی کی حالت میں رخ کیے ہوئے ہیں، طاقت و قدرت کے اس مرکز کے سامنے بندگی و عبودیت کے لحاظ سے کائنات کی مخلوقات میں کوئی فرق بھی نہیں ہے۔ ایک چھوٹے سے ذرّے سے لے کر ایک عظیم کہکشاں تک، ایک مومن انسان یا ایک کافر انسان، ایک حقیر مخلوق یا ایک عظیم انسان، سب اس طاقت و قدرت کے سامنے دست بستہ سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں، اس کے عبد ہیں، غلام ہیں اور بندے ہیں؛ جو بھی تعبیر آپ استعمال کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

البتہ اسلام کی آئیڈیالوجی اور معاشرے کے لیے اسلام کے عملی منصوبوں کی شناخت میں اس موضوع کا سمجھنا بہت حد تک موثر ہے۔ مثال کے طور پر اس کی طرف اشارہ کر سکتا ہوں کہ جب ہم نے جان لیا کہ کلی طور پر تمام انسان اس طاقت اور قدرت کے مرکز کے سامنے برابر ہیں تو پھر اس چیز کی کوئی تُک نہیں بنتی کہ مثلاً کبر و غرور کے ساتھ روم کے بادشاہ والرین[1] کا مجسمہ ایک جگہ بنائیں اور ایک بردہ اور غلام اس کے پاؤں پر گرے۔ ہم کہتے ہیں کیوں؟ کس لیے؟ کیا اس عظیم الشان بادشاہ نے بندگانِ

---

۱. روم کے بڑے بادشاہوں میں سے ایک تھا جو عیسائیوں کو بہت زیادہ تکلیفیں دیتا تھا، یہ بادشاہ آخری عمر میں ساسانیوں کے ساتھ جنگ کے دوران قیدی بنا لیا گیا تھا۔ عیسائیوں نے اس قید کو «والرین» کے لیے عذابِ الٰہی قلمداد کیا کیونکہ وہ عیسائیوں کو تکلیف دیا کرتا تھا۔

خدا کی صف کے علاوہ کوئی اور صف اپنالی ہے؟ اور کیا یہ انسان جو اس وقت اس بادشاہ کے قدموں میں گرا پڑا ہے اور اسے سجدہ کر رہا ہے اور اس کے سامنے خضوع و خشوع کر رہا ہے، اس نے بندگانِ خدا کی صف کے علاوہ کوئی پست اور نچلی صف اپنالی ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ یہ دونوں ایک ہی صف سے وابستہ ہیں، پس یہ صورت حال کیوں ہے؟

خالص اسلامی توحیدی فکر یہ کہتی ہے کہ تمام ممکنات اور موجودات ایک جگہ سے، ایک مبدأ سے، ایک دست قدرت سے خلق ہوئے اور وجود میں آئے ہیں؛ سب اس کے مقابلے میں بندے اور غلام ہیں، سب اس کے مقابلے میں اس کی طاقت و قدرت کے اسیر ہیں، سب کو اس کی فرمانبرداری کرنی چاہیے۔ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنا سر کسی کے قدموں پر رکھے جیسا کہ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنا پاؤں کسی کے سر پر رکھے۔ جس طرح کہ تجھے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنا پاؤں کسی کے سر پر رکھے اسی طرح تجھے یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ اپنا سر کسی کے قدموں پر رکھے، کس لیے؟ اس لیے کہ تو نے دونوں صورتوں میں حق و حقیقت کے خلاف کام کیا ہے۔ ﴿مَنْ ذَا الَّذِی یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ﴾ کوئی بھی اس کے اذن کے بغیر کسی کی شفاعت نہیں کر سکتا اور وہ مفسدین کو ہرگز شفاعت کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ انبیا، اولیاء، صلحاء، شہداء، عالی مقام خاکساروں اور ان بندوں کو اذن شفاعت عطا فرماتا ہے کہ جن کی دنیاوی زندگی تلخیوں اور مشکلوں میں گزری لیکن ان کی روح طاقتور اور مضبوط ہو گئی، انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کے راستے میں قدم بڑھایا، سختیاں اور مشکلات برداشت کیں تاکہ ایک قدم اپنے ہدف اور مقصد کے نزدیک ہو جائیں؛ وہ خدا کے نزدیک شفاعت کر سکتے ہیں۔ البتہ وہ بھی اس لیے شفاعت کر سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے خدا کی عبادت و بندگی بہت زیادہ کی ہے، چونکہ انہوں نے اپنے آپ کو خدا کی طاقت و قدرت کے ماتحت زیادہ قرار دیا ہے۔ پیغمبر خدا ؐ کے زمانے میں کسی نے بھی ان کے برابر خدا کی عبادت نہیں کی، امیر المومنین ؑ کے زمانے میں کسی نے بھی ان کی طرح خدا کی بندگی نہیں کی۔ مجموعی طور پر اس آیت (آیت الکرسی) سے یہ معنی سمجھ میں آتا ہے کہ پروردگار عالم، وہ عظیم طاقت و قدرت ہے کہ جس کے سامنے تمام موجودات، تمام مخلوقات، تمام تکوینیات، تمام کائنات دست بستہ سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں، سب اس کے بندے و مطیع و فرمانبردار ہیں؛ جو بھی اس کے زیادہ نزدیک ہونا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اس کی زیادہ عبادت کرے۔

دوسری آیت سورہ مریم میں ہے، اسے ہم نے سورہ مریم سے انتخاب کیا ہے۔ آیت نمبر ۸۸ اور اس کے بعد؛ ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا﴾ انہوں نے کہا کہ خدائے رحمان نے بیٹا بنا لیا ہے، اس کا بیٹا ہے، یہ کس لحاظ سے کہتے تھے؟ اس نکتے پر غور فرمائیں کہ خدا کا کسی کو بیٹا بنانا جو کہ کچھ مشرکوں یا عیسائیوں یا یہودیوں کا عقیدہ تھا، اس معنی میں تھا کہ کائنات کی مخلوقات کے درمیان، موجودات کے درمیان ایک شخص ایسا ہے کہ جس کی خدا کے ساتھ نسبت یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے (غور کریں) بلکہ اس کی نسبت خدا کا بیٹا ہونے کی ہے، وہ خدا کا بیٹا ہے، آقا زادہ ہے نہ کہ غلام؛ اگرچہ آقا نہیں ہے۔ یعنی یہ دو صفیں جو ہم نے مدِّنظر رکھی ہیں، ایک خدا کی صف اور ایک تمام بندوں اور موجودات و مخلوقات کی صف جو کہ خدا کے سامنے خاضع و خاشع ہیں، وہ لوگ ان دوصفوں کو تین صفیں کرتے تھے اور کہتے تھے: خدا، بندے (عوام) اور خواص؛ یعنی بیٹا، آقا زادہ، خدا زادہ۔ ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا﴾ اور انہوں نے کہا کہ خدائے رحمان نے بیٹا انتخاب کر لیا اور بنا لیا ہے؛ ﴿لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا﴾ یقیناً تم لوگوں نے بڑی سخت، سنگین اور خطرناک بات کی ہے۔ دیکھیں خداوند متعال کی تعبیر کیا ہے: سخت بات، خطرناک بات، تم نے انتہائی خطرناک عقیدے کا اظہار کیا ہے۔ ﴿تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا﴾ قریب تھا کہ آسمان ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے، پھٹ جاتے، زمین شق ہو جاتی اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑتے۔ ﴿أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا﴾ کہ انہوں نے خدائے رحمان کے لیے بیٹا قرار دے دیا اور اس چیز کا عقیدہ رکھ لیا۔

واضح ہے کہ مسئلہ انتہائی اہم ہے۔ خدا جو چیز عقیدے کے طور پر لوگوں کو دیتا ہے وہ الٰہی اہداف کے حصول میں مؤثر ہوتی ہے اور جس چیز کی بھی فاسد عقیدے کے طور پر نفی کرتا ہے اس پر اعتقاد رکھنا معاشرے کے فساد اور خرابی میں مؤثر ہوتا ہے۔ فاسد عقیدے کی نفی انسانی معاشرے میں فساد کی ایک جڑ کی نفی کے معنی میں ہے۔ اور اس چیز کا عقیدہ رکھنا کہ خدا بیٹا رکھتا ہے، خدازادہ اور آقازادہ رکھتا ہے، یہ خدا اور بشر کے درمیان حد واسط اور حد فاصل کا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ معاشرے میں بہت زیادہ مفاسد اور خرابیوں کا باعث ہے۔ ﴿وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا﴾ خدائے رحمان کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ ﴿إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ عَبْدًا﴾ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی بارگاہ میں اور اس کے مقابلے میں عبد اور بندہ بن کر حاضر

ہونے والا ہے، سب خدا کے بندے ہیں، سب خدا کے عبد ہیں۔ ﴿لَقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا﴾ خدا نے سب کا احصاء کر لیا ہے، سب کو اپنے قبضۂ قدرت میں لے لیا ہے اور سب کو شمار کر لیا ہے، یہ ایک اور آیت تھی جو کہ سورۂ مریم میں تھی۔

پس آج کی بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اسلامی تصورِ کائنات (Worldview) میں توحید کیا ہے؟ تصورِ کائنات کے اصولوں کے مواد میں ایک مادے کے طور پر توحید کے بارے میں تحقیق اور جانچ پڑتال۔

نویں نشست

توحید؛اسلامی آئیڈیالوجی میں

۱۰ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری | ۱۹۷۴-۰۹-۲۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ ۗ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ﴾

(سورہ بقرہ/۱۶۵)

ایک الٰہی شخص یہ کہتا ہے کہ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اس سے ماورا ایک حقیقت ہے جو ہر اس چیز سے ارفع و اعلیٰ اور عظیم ہے کہ جسے ہم دیکھتے اور مشاہدہ کرتے ہیں اور اگر وہ حقیقت نہ ہوتی تو یہ موجودات وجود میں نہ آتیں۔ جبکہ ایک مادی شخص کا یہ کہنا ہے کہ ایسا نہیں ہے؛ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اس کے علاوہ کسی چیز کے معتقد اور پابند نہیں ہوسکتے۔ ہم نے لیبارٹریوں اور تجربہ گاہوں میں بہت تلاش کیا لیکن جس ہستی کے آپ لوگ قائل ہیں وہ ہمیں کہیں دکھائی نہیں دی۔ مادی اور الٰہی لوگوں کے اس جھگڑے کو ہم کتابوں اور اس موضوع سے مربوط بحثوں پر چھوڑتے ہیں۔

ہمارا ماننا ہے کہ آج کے مادّہ پرست اگر اس بات کے قائل ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے تو اس کی وجہ مکتبِ الٰہی سے مایوسی ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس دنیا کا نظام، عدل کا قیام، طبقاتی نظام کا خاتمہ مادّہ پرستی پر مبنی فکر کے بغیر ممکن نہیں، اس وجہ سے وہ مکتبِ الٰہی سے دور ہو چکا ہے۔ ورنہ اسے ضد نہیں یا ایسا نہیں کہ خدا کے وجود پر کوئی قانع کنندہ دلیل نہ ہو۔ کیونکہ دوسری طرف بھی کوئی دلیل نہیں ہے، نہ ماضی میں تھی اور نہ آج ہے جو اس بات کو ثابت کرے کہ خدا نہیں ہے۔

ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو یہ کہے کہ میں ثابت کرتا ہوں کہ اس دلیل کی وجہ سے خدا نہیں

ہے۔ اگر کسی کے پاس اس سلسلے میں کہنے کے لئے کچھ ہے تو صرف یہی کہ میرے لیے ثابت نہیں ہوا ہے کہ خدا ہے، میں نے نہیں سمجھا، خدا کے ہونے کے استدلال کو میں نے قبول نہیں کیا۔ اور قرآن کریم بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرما رہا ہے: ﴿إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾[1] یہ لوگ صرف ظن و گمان کے پیچھے ہیں وگرنہ دلیل کے ساتھ خدا کی نفی نہیں کر سکتے۔

ہمارے زمانے کے مادّہ پرست کے بارے میں جو بات ہے (اور یہ بڑی پتے اور نکتے کی بات ہے) وہ یہ کہ مادّہ پرست کا مادّی مکتبِ فکر کی طرف جھکاؤ کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس دور میں مادّی مکتب بہتر طریقے سے دنیا کو چلا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مادی مکتب بہتر انداز میں ظلم و ستم اور مفاد پرستی کو جڑ سے اکھاڑ پھینک سکتا ہے اور دین یہ کام نہیں کر سکتا۔ وہ کیوں یہ کہتا کہ دین یہ کام نہیں کر سکتا؟ اس لیے کہ وہ دین کے بارے میں، دین کے رائج اور معروف معنی و مفہوم کے بارے میں کچھ جانتا نہیں ہے، جانتا بھی ہے تو صرف اسی حد تک جس حد تک گلی کوچے کے لوگوں کے پاس اس نے روایتی اور تقلیدی دین دیکھا ہے؛ خلاصہ یہ ہے کہ دین کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا، اسے کوئی خبر اور اطلاع نہیں ہے۔ اگر اس سے پوچھا جائے کہ دین کیا ہے تو چند ظاہری چیزوں کا نام لیتا ہے کہ یہ دین ہے؛ اور چونکہ یہ چیزیں بے حس کرنے والی ہیں، چونکہ یہ چیزیں ظلم اور ظالم کے برابر اور مساوی ہیں اور چونکہ یہ چیزیں لوگوں کی مشکلات کو حل نہیں کر سکتیں، لہٰذا کہتا ہے کہ دین کو چھوڑیں یہ کسی کام کا نہیں ہے۔

واضح ہے کہ انسان جب ایسی منطق کا سامنا کرتا ہے تو بہترین اور صحیح جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ہاں (آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں)؛ اگر آپ نے ایک ایسا دین دیکھا جس نے ظالم کے ساتھ تعاون کیا، ڈکٹیٹر کے ساتھ سازباز کی، مظلوم کا ایک لمحہ کیلیے بھی ساتھ نہ دیا، عوام الناس کی کوئی مشکل بھی حل نہ کی، لوگوں کے حال اور مستقبل کیلیے ذرہ بھر سودمند ثابت نہ ہوا، تو پھر آپ ہماری طرف سے بھی وکیل ہیں کہ اگر آپ نے اس طرح کا دین جہاں بھی دیکھا تو اسے ٹھکرا دیں اور اسے ایک لمحے کیلیے بھی قبول نہ کریں۔ اس لیے کہ دین اگر خدا کی طرف سے ہو تو پھر ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ میں نے دین کو دیکھا ہے کہ وہ انسانی معاشروں کو نہیں چلا سکتا تو ہم اس سے سوال کرتے ہیں

---

۱. سورہ مبارکہ جاثیہ: آیت ۲۴

کہ کس دین کو؟ دین اسلام کو؟ سچے اور حقیقی اسلام کو؟ محمدیؐ وحی کو؟ علویؑ حکومت کے طرزِ زندگی کو؟ کیا ان کو دیکھا ہے کہ یہ انسانوں کے معاملات کو چلانے اور ان کے مسائل کو سلجھانے سے قاصر اور ان کے منافی ہیں؟ آئیں ثابت کریں، کہاں قاصر ہیں؟ کہاں منافی ہیں؟ وہ اسلام جو آخرکار تفریق کا خاتمہ کرتا ہے، جس زمانے میں طبقاتی اختلاف عروج پر تھا اس دور میں آکر طبقاتی اختلاف کی نفی کرتا ہے، غیر منصفانہ طریقے سے تقسیم ہونے والی دولت و ثروت کو واپس لے کر عادلانہ طریقے سے تقسیم کرتا ہے، انسانوں کو برابری کی سطح پر مواقع اور سہولیات دیتا ہے، حکومت کو بشری طاغوتوں کے چنگل سے آزاد کروا کر خدا کے عادلانہ اور منصفانہ قانون کے سپرد کرتا ہے، ایک پست انسان کو ایک ذلیل و حقیر انسان کو، غلامی کی زندگی گزارنے والے انسان کو، ایک ایسے انسان کو جو ایک بات کیلیے، ایک شاباش کیلیے، ایک کھوٹے سکے کیلیے بدترین ظلم کا مرتکب ہوتا تھا، ایسے پست اور ذلیل و خوار انسان کی جو اسلام تعظیم و تکریم کرتا ہے، اسے رفعت و بلندی کی طرف لے آتا ہے، اسے عزت و عظمت عطا کرتا ہے، اسے انسانی و اخلاقی فضائل سے آراستہ کرتا ہے اور یہ سب کچھ ایک مضبوط، عادلانہ اور منصفانہ نظام کے سائے میں فراہم کرتا ہے۔

پس اگر آپ کہتے ہیں دینِ اسلام کہ حقیقت میں اسلام ہی حقیقی دین ہے، یہ خصوصیات رکھتا ہے اور پھر آپ کہتے ہیں کہ یہ اسلام انسان کی ترقی کے ساتھ، عدل و انصاف کے ساتھ، امن و امان کے قیام کے ساتھ اور انسانی ضروریات کے پورا کرنے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے تو ہم آپ کی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے، یہ ناانصافی ہے، اگر آپ کی یہ مراد ہے تو پھر یہ صحیح نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ مصنوعی دین، ظاہری دین، جھوٹا دین، ظاہر میں اچھا لیکن باطن میں برا دین، ایسا دین جو ہر جگہ لوگوں کو سستی و کاہلی، ظلم وستم برداشت کرنے اور بدبینی و بدگمانی، انتشار و اختلاف اور برادرکشی کی دعوت دیتا ہے، ایسا دین جو غریب سے یہ کہتا ہے کہ اگر تمہارے پاس دولت نہیں ہے، پیسہ نہیں ہے تو اس کے حصول کی کوشش کرنا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے اور دلتمند و ثروتمند سے یہ کہتا ہے کہ تمہارے پاس جو مال و دولت ہے اس میں سے کچھ پیسہ فلاں کلیسا یا فلاں مذہبی ادارے کو دے دو تاکہ اس دولت و ثروت کے حصول میں تم نے دوسروں پر جو ظلم و ستم ڈھائے ہیں ان سب کا کفارہ ادا ہو جائے؛ اگر آپ اس دین کی بات کرتے ہیں تو پھر ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں اور ہم دونوں

اس سلسلے میں قرآن کے پیروکار ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللهِ﴾[1] اے ایمان والو! بہت سے یہودی اور عیسائی عالم اور زاہد ناحق لوگوں کا مال کھاتے ہیں، ﴿لَيَأْكُلُونَ﴾، اس پر بھی اکتفا نہیں کرتے، ﴿وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ﴾ لوگوں کی ترقی اور کمال کا راستہ بھی کاٹتے ہیں۔ ہم بھی اس سلسلے میں آپ کے ساتھ ہم آواز ہیں۔ جو دین اس طرح کا ہو، وہ درحقیقت دین نہیں ہے۔

پس یہ عقیدۂ توحید کے سلسلے میں بطور خلاصہ چند کلی باتیں تھیں۔ اسلامی تفکرات اور افکار و نظریات کے سلسلے میں چند مسائل ایسے ہیں کہ جنہیں سب کو جاننا چاہیے، سب کو سمجھنا چاہیے۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ میں کہتا ہوں اے علمائے کرام! جب آپ توحید کی بحث کرتے ہیں تو اسے ایک علمی فکری اور ذہنی و عقلی سوال کے خشک اور سادہ جواب کے طور پر پیش نہ کریں بلکہ ایک مسئلے کے طور پر پیش کریں کہ جس کا جاننا اور نہ جاننا انسانوں کیلئے زندگی کا مسئلہ ہے، جس کا تعلق ان کی سرنوشت اور تقدیر سے ہے۔ میں ابھی اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ جس طرح عام اور معمولی لوگ یا معاشرتی طور پر بےکار اور غیر ذمہ دار لوگ توحید کو پیش کرتے ہیں وہ اس سے کہیں مختلف ہے کہ جس طرح ایک ذمہ دار شخص کیلیے توحید کا مسئلہ پیش کیا جانا چاہیے۔ ایک فرض ناشناس اور غیر ذمہ دار شخص توحید کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ کیا خدا ہے یا نہیں ہے؟ اچھا اب اگر ہے تو کیا کریں؟ اور اگر نہیں ہے تو کیا کریں؟ اس کا زندگی پر کیا اثر ہے اور اجتماعی و معاشرتی نظام میں کیا تبدیلی لا سکتا ہے؟ اگر خدا ہو تو فلاں بڑی طاقت یا فلاں سپر طاقت کے سرمایہ دارانہ نظام کا کیا حال ہوگا؟ فلاں ملک میں جو صدر بنا ہے اگر وہ خدا کا معتقد ہو تو کیسے عمل کرے گا؟ اور اگر اس کا خدا پر عقیدہ نہ ہو تو کیسے عمل کرے گا؟ کیا کوئی فرق پڑے گا؟ وہ خدا شناس اور وہ خدا پرست کہ جس کا خدا کو قبول کرنا کارٹیلوں، ٹرسٹوں، سرمایہ داروں اور نسلی تفریق و طبقاتی نظام میں کوئی فرق پیدا نہ کر سکے تو ایسی خدا پرستی اور توحید کے ایسے عقیدے کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہے، اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اس کا کیا فائدہ کہ فلاں ملک کا فلاں سیاسی رہنما خدا پر عقیدہ رکھتا ہے جبکہ اس کی خدا پرستی صرف ایک خشک ذہنی سوال کے جواب تک محدود ہے نہ کہ اس سے بالاتر؟ ایک سیاسی رہنما کیلیے، ایک عام آدمی کیلیے، ایک

۱۔ سورہ مبارکہ توبہ: آیت ۳۴

معاشرے کیلیے، ایک قوم کیلیے، ایک ملت کیلیے، ایک آبادی کیلیے، ایک گروہ کیلیے خدا پرست ہونا اور موحّد ہونا اس وقت موثر ہے، مفید ہے، ضروری ہے، زندگی ساز ہے کہ جب توحید کو اس کے آثار و نتائج کیلیے، اس چیز کیلیے جو توحید پر مرتب ہوتی ہے، اس نظام کیلیے جو توحید تجویز کرتی ہے، زندگی کی اس مشکل کیلیے جو توحید چاہتی ہے ان چیزوں کیلیے توحید کو پیش کریں، سمجھیں اور درک کریں۔ ہماری نظر میں یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔

عام طور پہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ توحید ایک ایسی چیز ہے کہ جو صرف ذہن اور دماغ میں واضح ہونی چاہیے، مسلّم ہونی چاہیے: جب عملی زندگی کی بات ہوتی ہے تو وہاں توحید کا کوئی اثر نہیں ہوتا؛ اور اگر کوئی اثر ہو بھی تو صرف ذاتی زندگی میں ہوتا ہے، اجتماعی زندگی میں نہیں ہوتا۔ میں اگر موحّد ہوں تب بھی وہی سرمایہ، وہی گاڑی، وہی کمپنی، وہی کارخانہ، مزدور کے ساتھ وہی سلوک، زمین کے ساتھ وہی تعلق جو موحّد نہ ہونے کی صورت میں ہوتا۔ وہ توحید کہ جس کی طرف اسلام دعوت دیتا ہے وہ توحید ایک سوال کے جواب کی حد سے کہیں بالاتر ہے۔ پس وہ توحید کیا ہے؟ اسلامی توحید الہام ہے حکومت کے سلسلے میں، اجتماعی و معاشرتی روابط و تعلقات کے سلسلے میں، معاشرے کی پیشرفت کے بارے میں، معاشرے کے اہداف و مقاصد کے بارے میں، لوگوں کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں، ان ذمہ داریوں کے سلسلے میں جو انسانوں پر خدا کی نسبت، ایک دوسرے کی نسبت، معاشرے کی نسبت اور کائنات کی دوسری مخلوقات کی نسبت عائد ہوتی ہیں۔ توحید یہ ہے۔ توحید اسلامی وہی الف ہے کہ جس کے بعد ب آتا ہے اور پ آتا ہے اور ج یہاں تک کہ ی آتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ کہیں خدا ایک ہے، دو نہیں ہیں اور بات ختم ہوجائے۔ خدا ایک ہے اور دو نہیں ہیں کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اپنے وجود پر بالخصوص اور آپ کے معاشرے پر بالعموم خدا کے علاوہ کسی اور کو فرمانروائی کا حق حاصل نہیں ہے۔ خدا ایک ہے اور دو نہیں ہیں کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے پاس جتنی دولت و ثروت ہے اور اسی طرح دوسرے لوگوں کے پاس جو مال و دولت ہے وہ سب خدا کا ہے، آپ کو عاریتاً یہ سب کچھ دیا گیا ہے آپ کی حیثیت صرف امانتدار کی ہے۔ اب کون موحّد بننے کیلیے تیار ہے؟ آپ کے پاس یہ پیسہ امانت ہے اور بس، عاریتاً آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ دیکھیں جناب اگر آپ کے پاس آپ کے دوست کا مال امانت ہو تو آپ کیا کریں گے؟ انتظار کریں گے اگر وہ کہے کہ اس میں سے دس تومان اس بچے کو دے

دیں، اس بوڑھے کو دے دیں، اس پرائے اور اجنبی کو دے دیں، اس اپنے قریبی کو دے دیں، اس میں سے دس تومان فلاں صندوقچی میں ڈال دیں، دس تومان کو سرے سے آگ لگادیں؛ مالک کی تحریر کے منتظر رہیں گے، کیا ایسا نہیں ہے؟ کیا آپس سمجھتے ہیں کہ اس امانت میں آپ کا کوئی حق ہے، آپ اس کے مالک ہیں؟ «المالُ مالُ اللهِ جَعَلَهُ وَدائِعَ عِندَ خَلقِه»[1] مال کو خداوندِ متعال نے بطورِ امانت انسانوں کے سپرد کیا ہے۔ یہ توحید کا لازمہ ہے۔

اگر آپ توحید کے قائل ہوں تو پھر معاشرے میں طبقاتی اختلاف اور اونچ نیچ کا کوئی معنی نہیں بنتا، اصولاً کوئی معنی نہیں بنتا۔ جس معاشرے میں اونچ نیچ ہو، ادنٰی و اعلیٰ کا مسئلہ ہو، وہ معاشرہ توحیدی معاشرہ نہیں ہے، توحید تو یہ کہتی ہے کہ «کُلُّکُم مِن آدَمَ و آدَمُ مِن تُرابٍ»[2] سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے ہیں۔ آپ کے خدا کے نزدیک ہونے اور دوسروں سے برتر ہونے کا معیار صرف تقویٰ ہے اور بس۔ جو جس قدر زیادہ خدائی فرامین کا خیال رکھے اور اطاعت کرے وہی بلند و برتر ہے۔ وگرنہ ایک ایسا معاشرہ کہ جس میں تفریق اور اونچ نیچ کے ہزاروں اسباب موجود ہوں (آپ کہتے ہیں کہ جناب! فلاں شخص اس طرح ہے؛ وہ کہتا ہے تو کیا ہوا وہ اشرافیہ میں سے ہے، اس کی بات ہی اور ہے) ایک ایسا معاشرہ کہ جس میں اشرافیہ و غیر اشرافیہ اور ادنٰی و اعلیٰ ہوں، ایک ایسا معاشرہ کہ جس میں لوگوں کے مالی حالات ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہوں اور جس کے پاس وسائل ہیں وہ انہیں اپنا حق سمجھتا ہو، ایک ایسا معاشرہ کہ جس میں بندگانِ خدا باہم برابر نہ ہوں بلکہ بعض، بعض دوسروں کے غلام ہوں تو ایسے معاشرے میں توحید نہیں ہے۔ جب توحید ایک معاشرے میں آتی ہے تو پھر سب انسان مساوی ہوجاتے ہیں، ایک ہی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں؛ یعنی کیا مطلب؟ مراد یہ ہے کہ سب خدا کے بندے بن جاتے ہیں جیسا کہ کل کہا تھا کہ کائنات کی موجودات و مخلوقات، انسان و غیرہ سب خدا کے سامنے مغلوب و مقہور اور اس کے بندے ہیں اور اسکی عبودیت میں سب شریک اور باہم مساوی ہیں، یہ بات کل تفصیل سے بیان کی تھی کہ کوئی شخص اور کوئی چیز بھی بیٹے، بیٹی، بیوی اور ہم شان و ہم مرتبہ ہونے کے عنوان کے تحت خدا کی عبودیت کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔

---

۱. مستدرک الوسائل و مستنبط المسائل، کتاب التجارۃ، أبواب مقدماتھا، باب۱۹، ح۲۰۷۴۱

۲. بحارالانوار، کتاب الایمان والکفر، ابواب المکارم الاخلاق، باب ۵۶، حدیث ۱۰

عبودیت کے دائرے میں اس بات کا کوئی معنی نہیں ہے کہ کچھ بندے بعض دوسرے بندوں کی گردن میں غلامی کی زنجیر ڈالیں، اصولی طور پر اس کا کوئی معنی نہیں بنتا۔ خدا کی بندگی غیرِ خدا کی بندگی سے آزادی کے معنی میں ہے اور یہ دونوں (خدا کی بندگی اور غیرِ خدا کی بندگی) کبھی اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی خدا کا بندہ بھی ہو اور غیر خدا کا بھی۔ خدا کی بندگی یعنی خدا کے علاوہ ہر کسی اور ہر چیز کی عبودیت و بندگی سے آزادی۔

جب ایک انسان اسلام لے آیا تو پھر ہر چیز اس کے لئے مقدمہ ہے، وسیلہ ہے، کس لیے؟ کس کا وسیلہ؟ وسیع و عریض کائنات (موت کے بعد کی دنیا کی بات نہیں کر رہا) تک پہنچنے کا وسیلہ ہے، خود انسان کی فکر و نظر کی جو خدا کی طرح وسیع و عریض ہے، اس دنیا تک رسائی کا ذریعہ۔ سب چیزیں انسان کیلیے وسیلہ ہیں تاکہ انسان خدا کی رضا کو حاصل کر سکے۔ دنیا کی زندگی، دنیا کی دولت و ثروت، دنیا کی آسائش، دنیا کی محبتیں اس کے لیے کوئی وقعت اور قدر و قیمت نہیں رکھتیں۔ اس وقت اس کیلیے قدر و قیمت رکھتی ہیں کہ جب خدا کے راستے میں ہوں، «فی سبیل الله»۔ لیکن اگر یہ محبت، یہ مال، یہ مقام و مرتبہ، یہ منصب، یہ عہدہ، یہ زندگی، یہ اولاد، یہ عزت و آبرو، یہ حیثیت خدا کے راستے میں اور ذمہ داریوں کے راستے میں نہ ہوں تو اس کے لیے کوئی اہمیت اور قدر و قیمت نہیں رکھتیں۔ اسلامی طرز تفکر میں دنیا و آخرت ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں؛ اور ایک مسلمان کیلیے دنیا انجام و اختتام نہیں ہے۔ وہ شخص جو بندوں کا بندہ اور ناقص موجودات و مخلوقات کا بردہ اور غلام ہے اس کی نظر میں دنیا محدود ہے لیکن اِس کیلیے دنیا وسیع ہے۔ موت ایک دروازہ ہے کہ جب آپ اس دروازے سے دیکھتے ہیں تو آپ کو دوسری طرف باغات، گلستان، اور کئی دنیائیں اور جہان نظر آتے ہیں؛ لہٰذا وہ یہ سمجھتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ اس دروازے تک پہنچ جائے، اس دروازے سے گزر جائے، موت اس کیلیے اہمیت نہیں رکھتی، موت اس کیلیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

یہ توحید کے جلوے اور پہلو ہیں۔ البتہ توحید کے بارے میں زیادہ منظم انداز سے اور مختلف عناوین کے تحت بحث کرنی چاہیے اور ان شاء اللہ اگلے دنوں میں کریں گے۔ سورۂ بقرہ کی آیات ہیں۔ قیامت کے دن کے ایک منظر کی تشریح ہے جو مسئلہ توحید سے پوری طرح مربوط ہے؛ آیت کی تلاوت کے دوران یہ بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔ سورہ بقرہ آیت ۱۶۵ سے ۱۶۷ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ

اللهِ أَندَادًا﴾ لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اس کا مثل، ہم پلہ اور رقیب قرار دیتے ہیں؛ یعنی انسانوں یا غیر انسانوں میں سے بعض کو خدا کا شریک قرار دیتے ہیں۔ ﴿يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللهِ﴾ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت خدا سے کی جانی چاہیے۔یہیں پر آیت ایک بریکٹ کھولتی ہے اس لیے کہ محبت کے بارے میں بات نہیں کر رہی تھی لیکن چونکہ خدا کی نسبت ان کی محبت کی بات ہوئی تو گویا آیت ایک بریکٹ کھولتی ہے جملہ معترضہ کی طرح فرماتی ہے: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ﴾ لیکن جو لوگ ایمان لائے، یعنی سچے اور حقیقی مومنین، وہ ان ظاہری جلووں سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ سب جھوٹے خداؤں سے، نفس و شہوت کے خدا سے لے کر ان خداؤں تک جو معاشروں میں اونچے مقامات پر فائز ہوتے ہیں اور انہیں بڑے عہدوں پر بٹھایا جاتا ہے، ان سب سے بڑھ کر مومن کے نزدیک اللہ محبوب ہوتا ہے۔

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ اچانک خدا بات کا رخ قیامت کے ایک منظر کی طرف موڑ دیتا ہے۔ خدا کے اچھے اور برے بندے سب اکٹھے ہیں، اچانک ظالم اور ستمگر دیکھیں گے کہ قیامت کے دن ساری طاقت و قدرت خدا کے اختیار میں ہے۔ انتہائی عجیب چیز ہے ﴿لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾[1] اس منظر کو دیکھتے ہیں، چاہے وہ ظالم جو دوسروں پر ظلم کرتا تھا، چاہے وہ ظالم جو اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے اور اپنے آپ کو اس پہلی قسم کے ظالموں کا غلام بنا رکھا تھا، جب نظر اٹھائیں گے تو دیکھیں گے کہ عجیب ہے؛یہاں تو وہ سارا کرّوفرّ، سارا جاہ و حشم، سب غرور و تکبر، سارے دعوے، سارے محلّات، ساری زندگی سب کچھ یہاں بیکار ہے کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

اس وقت وہ منظر بڑا عجیب منظر ہے۔ آپ دو گروہوں کو نظر میں لائیں، ایک گروہ نے دوسرے گروہ کی عبادت کی؛ یعنی اطاعت کی، بلاچون و چرا اطاعت، یہ دونوں گروہ قیامت کے دن ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہوں گے، باہم نزاع اور جھگڑا کریں گے۔ ﴿وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ اگر دیکھتے وہ لوگ کہ جنھوں نے ظلم کیا (اس ظلم کا غیر خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور بلا چون و چرا اطاعت کرنے کا معنی کیا اور اس سلسلے میں بعض قدیمی شیعہ مفسرین کی پیروی کی) اگر دیکھتے وہ

---

۱. سورہ مبارکہ مومن: آیت۱۶

لوگ کہ جنہوں نے غیر خدا کے سامنے سر تسلیم خم کیا، جب عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو کیا دیکھتے؟ ﴿أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ یہ کہ طاقت و قدرت مکمل طور پر خدا کیلیے ہے۔ ﴿وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ﴾ اور یہ کہ خدا کا عذاب سخت اور خوفناک ہے۔ اگر دیکھتے تو کیا ہوتا؟ (اس کا جواب مقدّر (چھپا ہوا) ہے) تو بلاشک اپنے عمل اور کردار سے پشیمان ہوجاتے۔ پشیمان ہوتے کہ ہم دنیا میں کس طرح دست و گریباں رہے تھے، جاکر ایسے ظالموں کے بردے اور غلام بن جاتے تھے جو آج قیامت کے دن اس طرح بےوقعت و بےحیثیت ہیں، ان سے کچھ بھی نہیں بن پاتا ہے۔ اگر عبرت کی نگاہ سے دیکھتے تو انہیں پتا چلتا کہ وہ دنیا میں بھی اسی طرح بے وقعت ہیں، ﴿إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ﴾ جب پیشوا اور مقتدا اپنے پیروکاروں اور ماننے والوں سے اظہار برائت و بےزاری کریں گے، ﴿وَرَأَوُا الْعَذَابَ﴾ اور خدا کے عذاب کو دیکھیں گے تو اس وقت مثلاً یزدگرد کہے گا، پروردگارا! بار الہا! یہ لوگ کہ جنہیں تو دیکھتا تھا کہ میرے زمانے میں میری بندگی کرتے تھے، میں ان سے بیزار ہوں، یہ نہ سمجھنا کہ میں اس بات پر ان سے خوش ہوں کہ یہ مجھے تیرا شریک قرار دیتے تھے، یہ غلط کرتے تھے جو مجھے تیرا شریک ٹھہراتے تھے، میں ان سے بیزار ہوں۔ اب دیکھیں کہ یزدگرد کی رعایا کا دل کس طرح جلے گا کہ ہم نے اس اپنی دنیا و آخرت کو اس کمینے شخص کے حوالے کردیا تھا، اب یہ قیامت کے دن ہم سے اظہار برائت کر رہا ہے۔ اب دیکھیں قرآن کریم کی یہ آیت کیا کہتی ہے؟

﴿إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ﴾ جب پیشوا و مقتدا اپنے ماننے والوں اور پیروکاروں سے اظہار برائت کریں گے اور خدا کے عذاب کو دیکھیں گے، ﴿وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ﴾ اور ان کے درمیان تمام رشتے ناطے ختم ہو جائیں گے، ﴿وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا﴾ اور پیروکار کہیں گے ﴿لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا﴾ اے کاش ہمیں دنیا میں لوٹا دیا جاتا تاکہ ہم بھی ان سے اسی طرح اظہار برائت کرتے جس طرح وہ آج قیامت کے دن ہم سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ ﴿كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ﴾ اسی طرح خدا ان کے اعمال کو ان کیلیے مایۂ حسرت و افسوس بنا کر انہیں دکھائے گا، ﴿وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ﴾ اور وہ ہرگز جہنم کی آگ سے باہر نکلنے والے نہیں ہیں۔

اس آیت میں جو مطلب ہمارے مدِّنظر تھا وہ یہ تھا کہ جو لوگ وہاں سزا بھگت رہے ہیں وہ غیر خدا کی عبودیت و بندگی کی سزا جھیل رہے ہیں، اس بات کی سزا بھگت رہے ہیں کہ وہ غیر خدا کے بندے

اور غلام بن گئے تھے؛ یعنی غیر توحید اور توحید کے برعکس ایک چیز، حالانکہ قرآن کریم کی تعبیر ہے ﴿اِتَّبَعُوا﴾ پیروی کرنے والے، پیچھے چلنے والے۔

دسویں نشست

۱۱ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری **خدا کی ذات میں منحصر اطاعت و عبادت** ۱۹۷۴-۰۹-۲۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

﴿هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ وَرُدُّوا إِلَى اللهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۞ قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَن يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَن يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ﴾ (سورہ یونس/۳۰-۳۱)

یہ کہا جا سکتا ہے کہ طویل‌ترین اور تفصیلی‌ترین بحث جو پورے قرآن میں پیش کی گئی ہے، وہ توحید کی بحث ہے۔ یعنی یہاں تک کہ بحثِ نبوت کی تمام تر طوالت اور انبیاءؑ کے حالات و واقعات کے با وجود جو بعض موارد میں عبرت حاصل کرنے کے لیے نقل کیے گئے ہیں، توحید، وجود خدا، خصوصاً مختلف صورتوں میں شرک کی نفی کے مسئلے پر جو تاکید کی گئی ہے، اس کی قرآن کریم میں کوئی مثال اور نظیر دکھائی نہیں دیتی، نہ لحنِ کلام کے اعتبار سے اور نہ تعدادِ آیات کے اعتبار سے۔ اگرچہ بحث کی وسعت کی مناسبت سے، توحید کے حوالے سے مسائل کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے۔

بحث اس میں ہے کہ اگر یہ طے ہے کہ توحید ایک ایسا عقیدہ ہے جو اپنے ساتھ، اس عقیدے پر اعتقاد رکھنے والے کے لیے، ایک عہد و پیمان اور ایک ذمہ داری لے کر آتا ہے، تو پھر سمجھنا ہوگا، جاننا ہوگا کہ آخر یہ ذمہ داری اور یہ عہد و پیمان کیا ہے؟

کیا یہ ذمہ داری اسی قدر ہے کہ ہم زبان سے یا دل سے اور فکر سے، اس عقیدے کو قبول کریں؟

یعنی کیا صرف اعتقاد رکھنا ہی ذمہ داری ہے؟

یا اس ذمہ داری کا احاطہ فکر اور دل کی حدود سے باہر نکل آتا ہے، لیکن صرف انفرادی اعمال کی حد

تک۔ مثلاً موحّدِ انسان کے کندھوں پر ذمے داریوں کا ایک سلسلہ توحید کے تقاضے کے طور پر موجود ہوتا ہے، منجملہ یہ کہ نماز پڑھے، یا یہ کہ ہر کام کے آغاز و انجام میں اللہ کا نام لے، یا بھیڑ کو، ذبح کیے جانے والے جانور کو خدا کا نام لیے بغیر ذبح نہ کرے، اسی قسم کی اور چیزیں، تو کیا ساری ذمہ داریاں انہی حدود میں ہیں؟

یا نہیں، جو ذمہ داری توحید، ایک موحِد شخص یا ایک موَحّدِ معاشرے کو دیتی ہے وہ ذاتی احکام اور انفرادی ذمہ داریوں سے بالاتر ہے۔ ایک موحد معاشرے کو توحید جو ذمہ داری دیتی ہے، اس میں ایک معاشرے کے اہم ترین، کلی ترین، بزرگ ترین، ابتدائی ترین اور بنیادی ترین مسائل شامل ہیں، مثلاً کس قسم کے مسائل؟ جیسے حکومت، اقتصاد، بین الاقوامی تعلقات، لوگوں کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات، کہ یہ ایک معاشرے کو چلانے اور اس کی حیات کے لیے اہم ترین بنیادی حقوق ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ توحیدی ذمے داری اور مسئولیت جو موحد کے کندھوں پر آتی ہے، وہ ایک معاشرے کے بنیادی حقوق اور بنیادی ذمے داریوں کے حوالے سے ہے۔

ایک جملے میں اس بات کو بیان کر دوں تاکہ پھر ہم زیادہ باریک اور فروعی یا زیادہ واضح و روشن اور زیادہ جزوی مسائل میں داخل ہو جائیں۔ ایک جملہ؛ وہ یہ کہ توحیدی معاشرے کی شکل اور ڈھانچہ (structure) غیر توحیدی معاشرے کی شکل اور ڈھانچے سے مختلف ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر توحیدی معاشرے کے اندر ایک قانون نافذ ہوتا ہے، پھر وہ قانون یا اس جیسے دس قانون کسی غیر توحیدی معاشرے میں نافذ ہو جائیں تو وہ بھی توحیدی ہے، نہیں۔ توحیدی معاشرے کا طول و عرض، اس معاشرے کے اجزا کی باہمی تشکیل، اس معاشرے کے عمومی اجزا جو توحید، یکتا پرستی اور یکتا گرائی کی بنیاد پر قائم ہوں، غیر توحیدی معاشرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک لفظ میں، وہی چیز جسے موجودہ دور میں نظامِ اجتماعی کہتے ہیں۔

توحیدی معاشرے کا اجتماعی نظم، اجتماعی سسٹم اور اجتماعی شکل ایک ایسی چیز ہے جو غیر توحیدی معاشرے سے مکمل طور پر مختلف، جدا اور بعض اوقات متضاد و متعارض ہے، یہ ایک جملے میں عرض ہوا آپ اس کلمے کا تجزیہ کریں، اجتماعی نظام، معاشرے کے طول و عرض اور معاشرے کے اجزا کے بارے میں ایسی گفتگو اور بحثیں ہیں جنہیں دور جدید اور دنیا کی رائج تہذیب کی مدد سے اور زیادہ تر قرآن

اور حدیث کے منابع (sources) کی مدد سے (ان مسائل کو) سمجھا اور درک کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہو گئی کلی بات۔

اب زیادہ جزئیات، زیادہ خصوصیات اور زیادہ مشخّص کر کے عرض کرتے ہیں۔ ہم توحید کو ایک ایسی قرارداد کی شکل میں پیش کرتے ہیں جس کے کچھ نکات ہیں ہم اس قرارداد کے نکات کو ایک ایک کر کے بیان کریں گے۔

توحیدی قرارداد کے نکات کیا ہیں؟ جس طرح سے دو گروہوں، دو محاذوں اور دو آدمیوں کے درمیان مختلف مذاکرات کے بعد لازم الاجراء معاہدہ ایک قرارداد کی صورت میں سامنے لایا جاتا ہے، دنیا کے موحدین بھی اپنے پروردگار کی جانب سے، خدائے توحید کی جانب سے ذمہ دار ہیں کہ اس قرارداد پر عمل کریں۔ اس قرارداد کا پہلا نکتہ آج کی آیات میں واضح ہو جانا چاہیے۔ اصول توحید کے مطابق، انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کسی بھی شخص کی یا کسی بھی چیز کی بندگی یا اطاعت کریں، یہ توحیدی قرارداد کا پہلا اصول ہے۔ البتہ یہ جو ہم نے کہا کسی بھی شخص اور کسی بھی چیز، تو اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ دیکھیے بندگی اور اطاعت کن مقامات پر صادق آتی ہے۔

ایک حدیث ہے، جسے میں مختلف موارد میں پڑھ چکا ہوں، اس وقت بھی اسی حدیث کو پڑھنے کا ایک موقع ہے کہ ہماری معتبر کتابوں میں امام علیہ السلام سے منقول ہے، منجملہ کافی شریف میں، اصول کافی میں، کہ امام علیہ السلام حدیث قدسی کے طور پر نقل کرتے ہیں، چند جملوں میں، چند عبارتوں میں جو میری نظر میں رہ گئی ہے اور نزدیک‌ترین اور مفصل‌ترین عبارتوں میں سے ایک ہے، وہ یہ ہے کہ:

«لَأُعَذِّبَنَّ كُلَّ رَعِيَّةٍ فِي ٱلْإِسْلَامِ دَانَتْ بِوِلَايَةِ كُلِّ إِمَامٍ جَائِرٍ لَيْسَ مِنَ ٱللهِ وَ إِنْ كَانَتِ ٱلرَّعِيَّةُ فِي أَعْمَالِهَا بَرَّةً تَقِيَّةً وَ لَأَعْفُوَنَّ عَنْ كُلِّ رَعِيَّةٍ فِي ٱلْإِسْلَامِ دَانَتْ بِوِلَايَةِ كُلِّ إِمَامٍ عَادِلٍ مِنَ ٱللهِ وَ إِنْ كَانَتِ ٱلرَّعِيَّةُ فِي أَنْفُسِهَا ظَالِمَةً مُسِيئَةً»[1]

حدیث کا ترجمہ یا بہتر ہے کہ حدیث کا اجمالی مفہوم بیان کروں، اس طاقت کی اطاعت جو خدا کی جانب سے نہ ہو اور خدا کی نمائندہ نہ ہو، ایسے مرکز کی اطاعت کہ جس نے پروردگار کی قدرت کے مرکز سے الہام نہ لیا ہو، یہ شرک کی حد تک ہے یا شرک ہی ہے، اس لیے کہ جو لوگ اس کام کو انجام دیتے ہیں اور اس درد میں، اس بلا میں، اس عظیم اجتماعی حرج و مرج میں مبتلا ہیں، اگرچہ وہ اپنے

---

۱. اصول کافی، کتاب الحجۃ، باب فی من دان اللہ عز و جل بغیر امام من اللہ۔ ح ۴، امام باقرؑ۔

ذاتی معاملات میں بہت اچھے اور منظم انسان ہوں،«بَرَّةً تَقِيَّةً» باتقویٰ، پرہیز گار، خیال رکھنے والے، لیکن یہ عظیم بلا سبب بنتی ہے کہ خدائے متعال اپنے لطف و رحمت کی نظر کو اس امت سے ہٹا لے، انہیں عذاب میں، عتاب میں، اپنی عقوبت میں مبتلا کر دے۔ یہ حدیث ہے۔

کیوں؟ اس لیے کہ غیر خدا کی اطاعت، غیر خدا کی عبادت، اس ہدف کے برخلاف ہے جس کے لیے خدا نے انسان کو خلق کیا ہے، انسان کے تکامل اور بلندی کے منافی ہے، انسان کی آزادی اور عدم وابستگی کے خلاف ہے۔ وہ آزادی اور وہ عدم وابستگی جو انسان کے عروج کا مقدمہ ہے کہ اگر وہ آزادی نہ ہو، آزادی کی جگہ قید انسان کے دامن گیر ہو، تو انسان اس مطلوبہ پرواز تک نہیں پہنچ سکتا جو خدا نے اس کے لیے مقرر کی ہوئی ہے، رشد نہیں کر سکتا، کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔اس پودے کی مانند جس کے اوپر کچھ ڈھک دیا گیا ہو۔ اس پودے کی مانند جس کی ڈنٹھل کے نچلے حصے میں کوئی مضبوط تار باندھ دیا گیا ہو۔ اس پودے کی مانند جس کی نشو ونما میں متعدد رکاوٹوں کو حائل کر دیا گیا ہو۔ یہ پودا نشو و نما نہیں پا سکتا، جب نشو و نما نہیں پائے گا تو پھل نہیں دے گا، جب پھل نہیں دے گا تو پھر اس کے ہونے کا کیا فائدہ، اس کے آنے کا کیا اثر ہے، پھر آیا ہی کیوں؟ کیا پھل دینے کے علاوہ کوئی اور مقصد تھا؟ انسان کے لیے غیر خدا کی اطاعت اور غیر خدا کی بندگی ایسی ہی ایک آفت ہے۔

﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا﴾[1] قیامت کا تذکرہ ہے، جس دن ہم تمام خلائق کو جمع کریں گے، ﴿ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا﴾ پھر کہیں گے ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا، جو خدا کے لیے شریک کے قائل ہو گئے، ﴿مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ﴾ اپنی جگہ پر ٹھہر جاؤ، تم اور تمہارے شریک، تحکمانہ انداز میں، عتاب آمیز لہجے میں، اپنی جگہ رک جاؤ، تم اور تمہارے خیالی شریک، جنہیں تم نے خدا کا رقیب، برابر اور ہم رتبہ فرض کیا ہوا تھا، ﴿مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ﴾ ان کے درمیان اور ان کے ان خیالی شریکوں کے درمیان جدائی ڈال دیں گے جن کو انہوں نے خدا کا شریک فرض کیا ہوا تھا۔

یہاں آپ ایک عام اور سطحی نگاہ سے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ شریک، جنہیں خدا کے ساتھ شرکت کے لیے انتخاب کیا گیا تھا، قیامت میں عقیق کے اس بے جان ہُبل[2] سے ہٹ کر ہیں، اس کا تو حشر و نشر ہی

---

۱. سورہ مبارکہ یونس: آیات ۲۸ سے ۳۲

۲. ہُبل کعبہ میں رکھا ہوا ایک بت جس کی قبل از اسلام لوگ پرستش کرتے تھے۔

نہیں ہے۔ ﴿وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ﴾ خیالی شریک اور رقیب، پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے پیروکاروں کی طرف رخ کریں گے، کہیں گے کہ تم دنیا میں ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔
وہ گروہ جو گمراہی میں ایک دوسرے کے مددگار تھی، قیامت میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے، ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے، جس نے خدا کے ساتھ شرک کیا ہے اور خدا کے لیے شریک قرار دیا ہے، وہ چاہے گا کہ شریک کا گریبان تھام لے اور اسے زمین پر دے مارے، کہے کہ میں نے تجھے خدا کی جگہ قبول کیا تھا اور اب اس مصیبت سے دوچار ہو گیا ہوں۔ اور وہ جس کی دنیا میں بندگی اور پرستش کی جا رہی تھی، وہ بھی اپنی جان چھڑانے کے لیے پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے دنیوی چاہنے والوں کو، پیروکاروں کو مسترد کرنے پر، ان سے بیزاری اور اظہار برائت کرنے پر تیار ہے۔ ﴿مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ﴾ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔ ﴿فَكَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ یہ شریکوں کی زبان سے ہے: ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے خدا کافی ہے، ﴿إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ﴾ کہ ہم تمہاری پرستش سے غافل تھے، ہماری توجہ ہی نہیں تھی کہ تم لوگ ہمیں عبادت اور بندگی کی نظر سے دیکھتے ہو۔ یہ ان شریکوں کا کلام ہے۔
﴿هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ﴾ اس وقت ہر شخص اپنے گذشتہ اعمال کو آزمائے گا، یہ وہ مقام ہے کہ ہر نفس، ہر انسان آزمائے گا اس چیز کو جو وہ پہلے سے انجام دے چکا ہے۔ وہ کام جو دنیا میں انجام پا چکے ہیں، وہاں انسان کے اپنے ہاتھوں آزمائش کیے جائیں گے۔ ﴿هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ﴾ وہاں پر آزمائے گا ہر نفس، اس کو جسے وہ پہلے انجام دے چکا ہو گا، ﴿وَرُدُّوا إِلَى اللّٰهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ﴾ پلٹا دیئے جائیں گے سب لوگ اپنے خدا کی طرف جو اُن کا حقیقی آقا، مولیٰ اور سرپرست ہے۔
﴿وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾ جو باتیں وہ افترا اور بہتان کے طور پر بولتے تھے، ان سے گم اور غائب ہو جائیں گی۔ جو چیزیں بھی غیر خدا کی اطاعت کے لیے انسان کے دل میں ایک محرک کے طور پر تھیں، وہ فراموش ہو جائیں گی۔ وہ سب چیزیں جو غیر خدا کی عبودیت کے لیے ایک بہانے اور عذر کے طور پر انسان کے دل میں تھیں اور وہ سمجھتا تھا کہ قیامت میں یہ اس کے لیے ایک حربہ ہو گا، انسان کے ہاتھ سے لے لی جائیں گی۔
یہاں ان آیات میں خدائے متعال ثابت کرنا چاہتا ہے کہ صرف خدا کے سامنے اطاعت و بندگی کرنی

چاہیے اور وہ اس بارے میں اس راستے سے وارد ہوتا ہے۔ ﴿قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ کہو، کون تمہیں روزی دیتا ہے آسمان اور زمین سے؟ آسمان سے حیات بخش اور زندگی بخش برسات، زمین سے مادۂ حیات، ﴿أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ﴾ یا کون ہے جو مالک ہے سننے کا اور دیکھنے کا؟

﴿وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ اور کون ہے وہ جو زندہ کو نکالتا ہے مردہ سے؟ ظاہری زندہ کو ظاہری مردہ سے؛ کوئی عورت مرجاتی ہے اور مثلاً وہ حاملہ ہے، اس کا بچہ زندہ ہے، اسے ایک مردہ ماں (کے شکم) سے نکالا جاتا ہے۔ دوسرا احتمال، مردہ نطفے سے، مردہ جسم سے، ایسی چیز سے جس کے اندر جان نہیں ہے، زندہ کو نکالتے ہیں۔ اس مردہ زمین سے، اس زمین سے کہ جو اگرچہ ہزارہا حیات بخش اور زندگی افزا مادوں کا خزانہ ہے، لیکن خود مردہ ہے، اس کے اندر سے ہم نے تمہیں نکالا اور ابھی بھی انسانوں کو نکال رہے ہیں۔

انسانوں کا اصلی مادہ اور بنیادی جڑ کیا چیز ہے؟ سوائے اس حیاتی اور غذائی مواد کے جو زمین سے ملتا ہے؟! پس ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ کے چند احتمال ہیں اور یہ سب احتمال قابل قبول ہیں۔ ﴿وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ اور کون ہے جو نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے؟

﴿وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ﴾ کون ہے جو کائنات کے تکوینی امر کی تدبیر کرتا ہے؟

﴿فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ﴾ کہیں گے، اللہ۔ بعض لوگ بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتے ہیں اللہ کہ ان کا یہ عقیدہ تھا، اس زمانے میں بھی تھا، میں تھوڑا سوچتا ہوں، غور کرتا ہوں، ﴿فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ﴾ پھر کہتا ہوں کہ اللہ ہے۔ عالَم تخلیق کا یہ عجیب انتظام خدا کی جانب سے ہے اور بس۔ یہ اس کا دستِ قدرت ہے جو اس گردوں اور چرخ و فلک کو چلا رہا ہے۔ جو کچھ ہم طبیعی اور غیر طبیعی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں اور جو کچھ آج نہیں دیکھتے، لیکن دسیوں سال بعد، علم کی ترقی کے نتیجے میں دیکھیں گے، سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ سب قدرتِ خدا کا پیدا کردہ اور خلق کردہ ہے ﴿فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ﴾۔

اب جب کہ خدا ہے، ﴿فَقُلْ﴾ یہیں پر ان کا گریبان تھام لو اے ہمارے نبی، اے ہماری دعوت کی بشارت دینے والے، اے کمالِ انسان کے ذمہ دار، ﴿فَقُلْ﴾ کہو: ﴿أَفَلَا تَتَّقُونَ﴾؟ کیا تم تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار نہیں کرتے؟

یہ کیا بات ہوئی؟ عظیم خدا سے نہیں ڈرتے، اس عظمت آفرین خدا سے، کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے

کسی کی اطاعت کرتے ہو، عبودیت میں کسی اور کو شریک قرار دیتے ہو؟
اس کے بعد چوتھی آیت پر پہنچتا ہے۔
﴿قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَّن يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ﴾[۱] اے ہمارے نبی! دوبارہ ان کی ہدایت، ان کی تعلیم کے لیے ان سے بات کرو، کہو ﴿قُلْ هَلْ مِن شُرَكَائِكُمْ مَّن يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ﴾ یہ جو تم نے خدا کے لیے خیالی شریک قرار دے دیئے ہیں، کیا ان میں تمہیں ایسا کوئی ملتا ہے جو حق کی جانب، انسانوں کی ہدایت کرے؟ ہے کوئی ایسا تمہارے پاس؟
تو اب جب کہ معلوم ہو گیا کہ خدا حق کی جانب بلاتا ہے اور خیالی رقیب یہ کام نہیں کرتے، ﴿أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ﴾ یہ وہ نتیجہ ہے جسے خدا کی دی ہوئی عقل و خرد اور ذہانت سے حاصل کرنا اور استفادہ کرنا چاہیے، ﴿أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ﴾ آیا وہ ذات جو حق کی جانب ہدایت کرتی ہے، اس کا زیادہ حق ہے کہ اس کی متابعت اور پیروی کی جائے ﴿أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَى﴾ یا وہ جسے خود راستہ نہیں ملتا، مگر یہ کہ کوئی اس کا ہاتھ تھام کر اسے لے جائے۔
آخر پیروی کس کی کرنی چاہیے؟ کس کے پیچھے چلنا چاہیے؟ خدا کے پیچھے جس نے خود حق کو اور حق کی جانب لے جانے والے رہبر اور رہنمائے حق کو پیدا کیا ہے؟
یا اس کے پیچھے جو اگر حق تک پہنچنا چاہے، تو کسی کو اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جانا ہوگا؟
﴿أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَى فَمَا لَكُمْ﴾ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یعنی اے وہ لوگو جو غور نہیں کرتے اور درک نہیں کرتے ﴿كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾ کیسا حکم لگاتے ہو؟ کس طرح کا حکم لگاتے ہو؟ غیر خدا کے لیے کسی گنجائش کے کس طرح قائل ہوتے ہو؟ یہ ہوئی توحید کے بارے میں ایک بات۔

---

۱. سورہ مبارکہ یونس: آیت ۳۵

گیار ہویں نشست

روح توحید؛ غیر خدا کی بندگی کی نفی

۱۲ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری — ۱۹۷۴-۰۹-۲۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿أَفَغَيْرَ اللهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۞ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ (سورہ انعام/۱۱۴-۱۱۵)

آج کے ہمارے نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ کسی کی عبادت کی جاتی ہے، اس انداز سے کہ اسے مقدس اور عالَم طبیعت سے مافوق طاقتوں کا مالک سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ تاریخ میں بعض لوگ بتوں کی یا مقدس اور پارسا لوگوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ عبادت سے ابتدائی طور پر جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہی ہے۔

قرآنی تعلیمات میں عبادت ایک وسیع مفہوم پیدا کر لیتا ہے اور ہمیں یہ وسیع تر مفہوم ڈھونڈنا چاہیے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ خدا کی عبادت کریں اور غیر خدا کی عبادت نہ کریں، یعنی اگر ہم چاہتے ہیں کہ موحِّد اور اصلی توحید کے پیروکار بنیں، تو دھیان رکھیں کہ دوسری قسم کی عبادت (جو قرآنی مفہوم ہے اور میں اسے آگے بیان کروں گا) کو بھی غیرِ پروردگار عالَم کے لیے انجام نہ دیں۔ یعنی وہی چیز جسے دنیا کے زیادہ تر موحّدین باوجودیکہ وہ اپنے خیال میں اور بظاہر، کسی غیرِ خدا کو مقدس نہیں مانتے، کسی کے لیے یا کسی چیز کے سامنے سجدہ نہیں کرتے تھے، اس کے باوجود، عمل میں، فکر میں، دل میں، روح میں، غیرِ خدا کی عبادت کرتے تھے، البتہ دوسرے معنی کے مطابق۔

عبادت کا دوسرا معنی کیا ہے؟ عبادت کا دوسرا معنی بہت سادہ سا ہے۔ فارسی زبان میں یہ اطاعت کے

معنی میں رائج ہے۔ مستقل طور پر اور بلا قید و شرط کسی کی اطاعت کرنا، اس کی عبادت ہے۔ اگر کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی معاشرہ، کسی کی بلا قید و شرط اطاعت کرے، اس کے حکم کو اپنی زندگی میں، اپنے جسم و روح میں، اپنے عمل میں، پیروی کے قابل سمجھے، تو اس نے اس کی عبادت کی ہے۔ ہم کہاں سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟ قرآنی آیات پر تکیہ کرتے ہوئے ہم یہ بات کہہ رہے ہیں۔ یہ قرآن ہے جو ہمارے سامنے عبادت کو اطاعت کے معنی میں بیان کرتا ہے۔ عدیّ بن حاتم طائی[1] (مشہور حاتم طائی کا بیٹا کہ اس عدی کا مقام اپنے باپ حاتم طائی سے بہت بلند اور بڑا ہے) جب مدینہ پہنچا اور رسول اکرمؐ نے اس کی گردن میں صلیب آویزاں دیکھی تو اس آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا﴾[2]

آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسیحیوں اور یہودیوں نے اپنے احبار اور رہبان (علما) کو، اپنے عالموں اور زاہدوں کو، اور حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کو اپنا پروردگار اور خدا بنا لیا، جب کہ خدائے متعال نے انہیں حکم دیا تھا کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں۔ جب یہ آیت عدی بن حاتم تک پہنچی، تو اس نے کہا: اے خدا کے رسولؐ! یہ بات درست نہیں ہے، کب سے ہمارے احبار و رہبان ہمارے رب شمار ہونے لگے؟ ہم نے کب ان کی عبادت کی؟ اس نے پیغمبر اکرمؐ اور آیت قرآن پر اعتراض کیا، کیوں؟ کیونکہ اس کے ذہن میں عبادت کے وہی معنی تھے جو اس وقت آپ کے ذہن میں ہیں۔ جناب وہ عبادت کر رہے ہیں، یعنی نیایش، یعنی تقدیس جیسی حالت اور کیفیت؛ اب یہ قلبی ہے یا قلبی اور زبانی، یا قلبی، زبانی اور بدنی ہے، جیسے نماز پڑھنا۔ چونکہ عدی بن حاتم عبادت کو اسی معنی میں سمجھتا تھا، جب اس نے دیکھا کہ قرآن کی آیت کہہ رہی ہے کہ یہ لوگ اپنے عالموں اور زاہدوں کی عبادت کرتے تھے، اپنا رب اور پروردگار قرار دیتے اور انتخاب کرتے تھے، اس نے اعتراض کیا، کہا نہیں، یہ بات درست نہیں ہے۔ ہم مسیحیوں نے کب اپنے احبار و رہبان کی عبادت کی ہے؟

پیغمبر اکرمؐ نے عدی کے اس تصور کے جواب میں فرمایا کہ ہاں، تم نے ان کے سامنے سجدہ نہیں کیا

---

۱. عدی بن حاتم، حاتم طائی کا بیٹا ہے جو اپنے باپ کے بعد قبیلے کا سردار بنا۔ ۹ ہجری میں نبی اکرمؐ کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر مسلمان ہوا۔ وہ امیر المومنینؑ کے محبوں اور اصحاب میں شامل تھا اور جنگ جمل، صفین اور نہروان میں شریک ہوا اور صفین میں اپنے تین بیٹے اسلام کی راہ میں قربان کیے۔ وہ ۶۷ ہجری میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔

۲. سورہ مبارکہ توبہ: آیت ۳۱

ہے (پیغمبر اکرمؐ کے کلام کا مفہوم پیش کر رہا ہوں) لیکن جو کچھ انہوں نے کہا، اسے بلا چون و چرا مان لیا، «وَلٰكِنَّهُمْ وَأَحَلُّوا حَرَامًا وَحَرَّمُوا حَلَالًا»[۱] حرام خدا کو انہوں نے تمہارے سامنے حلال ظاہر کیا اور حلال خدا کو حرام ظاہر کیا اور تم لوگوں نے بجائے اس کے کہ حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے، جو کچھ انہوں نے کہا، بلا چون و چرا ان کی اطاعت کر لی، عبادت یہ ہے، کسی چیز کو پروردگار اور رب بنانا یہ ہے۔ البتہ اسی مضمون کی ایک روایت امام صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے، جو لوگ چاہیں وہ اسی آیت کے ذیل میں تفسیر نور الثقلین[۲] کی طرف رجوع کریں۔

قرآنی تعلیمات کے مطابق، کسی بھی غیر خدا کی عبادت، خواہ وہ کوئی سیاسی طاقت ہو، خواہ وہ کوئی مذہبی طاقت ہو، خواہ وہ کوئی اندرونی عامل ہو، جیسے انسان کا نفس، اس کے نفسانی اور شہوانی تمایلات و خواہشات، خواہ وہ کوئی ایسی چیز ہو جو انسانی نفس سے باہر ہو، لیکن کوئی باقاعدہ منظم سیاسی یا دینی طاقت نہ ہو، ایک عورت کے سامنے، ایک ایسے آدمی کے سامنے جس کے لیے کسی بے جا احترام کا قائل ہے، کسی دوست کے سامنے، ان کی عبادت کرنا یعنی ان کی اطاعت کرنا۔ جس کسی نے کسی کی یا کسی چیز کی اطاعت کی، اس نے اس کی عبادت کی ہے۔

یہاں پر ایک روایت پڑھوں تاکہ معلوم ہو کہ یہ قرآنی تعلیمات، اسلامی منابع (sources) اور خصوصاً شیعہ منابع، خواہ قرآن ہو یا حدیث، میں ہر مقام پر پھیلی ہوئی ہیں۔ روایت امام محمد تقی علیہ السلام سے ہے کہ آپؑ فرماتے ہیں: «مَنْ أَصْغىٰ إِلىٰ ناطِقٍ فَقَدْ عَبَدَهُ»[۳] عبادت کا دائرہ بہت وسیع ہے، نہ صرف اطاعت کرنا، بلکہ حواس کو پوری طرح کسی کے حوالے کر دینا بھی، اس کی عبادت ہے۔ اچھا، اب آپ کہیں گے: تو اب ہم اچھی باتیں بھی نہ سنیں؟ لہٰذا آگے چل کر اسی حدیث میں آیا ہے: «فَإِن كانَ النّاطِقُ يُؤَدّي عَنِ اللهِ عزّوجلّ فَقَد عَبَدَاللهَ» جو شخص باتیں کر رہا ہے اور تمہارے سارے حواس اور توجہ اس نے اپنی طرف مبذول کر لی ہے، تو اگر وہ خدا کی زبان سے بول رہا ہے، تو اس کے باوجود کہ تمہارا دل اس کی جانب ہے، ذہن اس کی جانب ہے، اپنی روح و فکر کو تم نے اس کے حوالے کر دیا ہے، پھر بھی تم خدا کی عبادت کر رہے ہو۔ «وَإِن كانَ النّاطِقُ يُؤَدّي عَنِ الشَّيطانِ فَقَد عَبَدَ الشَّيطانَ» لیکن اگر

---

۱. تفسیر نور الثقلین، سورہ مبارکہ توبہ کی آیت ۳۱ کے ذیل میں

۲. تفسیر روائی نور الثقلین، مصنف شیخ عبد علی جمعۃ العروسی حویزی، گیارہویں صدی ہجری کے ایک عالم۔

۳. اصول کافی، باب الغناء، حدیث ۲۴

بولنے والا، شیطان کی زبان سے بول رہا ہے، ابلیس کی زبان سے بات کر رہا ہے، فکر الٰہی کی منطق و فلسفہ کے بر خلاف بحث و گفتگو کر رہا ہے، اور تم تسلیم و اعتراف کے ساتھ اس کی بات سن رہے ہو، تو اسی حالت میں ابلیس کی عبادت و اطاعت میں مشغول ہو، یعنی وہ بذات خود ہی شیطان ہے۔ خود وہی جو اس طرح کی باتیں کر رہا ہے شیطان ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ شیطان کا نمائندہ یا اس کا ترجمان ہے، نہیں، خود شیطان، اسی معنی میں جو شیطان کے بتائے ہیں، کہ شیطان کے قرآنی معنی بھی وہی ہیں۔

کسی چیز کی اطاعت کرنا جو اس انداز کی ہو، خواہ وہ کوئی سیاسی طاقت نہ ہو، کوئی مذہبی طاقت نہ ہو، اس کی بلا چون و چرا اطاعت کرنا، اس چیز کی عبادت کرنا ہے اور اگر کوئی صرف خدا کی عبادت کرنا چاہے اور غیر خدا کی عبادت نہ کرنا چاہے، یعنی موحد ہونا، یکتا پرست ہونا، توحید پرست ہونا چاہے تو اسے اپنی مطلق اطاعت کو بھی پروردگار عالَم کے ساتھ، خدائے عظیم کے ساتھ مختص کرنا ہوگا۔ وہ چیزیں کہ جن کی اگر تم نے پیروی کی تو ان کی عبادت کی، ان میں سے ایک چیز قانون بھی ہے۔ وہ چیزیں کہ جن کی اگر تم نے پیروی کی تو ان کی عبادت کی، ان میں سے ایک نظم اجتماعی بھی ہے۔ وہ چیزیں کہ جن کی اگر تم نے اطاعت کی، ان میں سے ایک رسم و رواج بھی ہیں۔ تو پھر کس قانون پر عمل کریں؟ کیا قانون پر عمل نہ کریں؟ رسم و رواج پر عمل نہ کریں؟ کسی نظم و ضبط کی پیروی نہ کریں؟ کیوں نہیں، لیکن کوشش کرو کہ یہ سب خدائی ہوں تاکہ تم اطاعت کرتے وقت، پیروی کرتے وقت، خدا کے بندے بنے رہو اور عبادت خدا میں مشغول ہو۔

مجھے قرآن میں متعدد موارد ایسے ملے ہیں، میں دو مورد لے کر آیا ہوں۔ یہ دو نمونے ایسے ہیں جن سے خوب سمجھ میں آجاتا ہے کہ غیر خدا کی اطاعت، اس کی عبادت ہے اور خالص توحید، دین کی روح اور دین کی بنیاد عبارت ہے اس بات سے کہ انسان، اطاعت کو بھی خدا کی ذات میں منحصر سمجھے اور الٰہی پروگرام، الٰہی نظام اور الٰہی سسٹم ہی کی اطاعت کرے۔

قرآن کی طرف رجوع کیجیے۔ کوشش کیجیے کہ قرآن سے واقف ہو جائیں۔ اپنے آپ کو اس نہ ختم ہونے والے خزانے اور بحر بے کراں سے نزدیک کیجیے۔

میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ آپ سے کہوں کہ قرآن کی طرف رجوع کرنا لازمی ہے۔ یہ عظیم

سمندر، یہ بحر بے کراں، ایسا ہے کہ «هُوَالبَحرُ مِنْ أَيِّ النَّواحِي أَتَيْتَهُ»[۱] یہ ایک شعر ہے، ایک شعر کا ایک مصرعہ ہے۔ جس طرف سے بھی جاؤ گے ایک فائدہ ضرور حاصل کرو گے۔

جو شخص بھی قرآن کے ساتھ نشست و برخاست رکھے گا، اس سے استفادہ کرے گا۔ ہر طرح سے، ہر انداز سے، ایک صلاحیت آپ کے پاس ہونی چاہیے کہ مختصر طور پر اس کی زبان کو آپ سمجھ سکیں، کچھ بہرہ مند ہو جائیں گے، اور جتنا زیادہ رجوع کریں گے، زیادہ معلومات اور زیادہ وضاحت ملے گی کہ امیر المومنین علیہ السلام نے اس مطلب کو ایک عبارت میں جو نہج البلاغہ میں نقل ہوئی ہے، فرمایا: «وَ مَا جَالَسَ هَذَا الْقُرْآنَ أَحَدٌ إِلاَّ قَامَ عَنْهُ بِزِيَادَةٍ أَوْ نُقْصَانٍ زِيَادَةٍ فِي هُدًى أَوْ نُقْصَانٍ مِنْ عَمًى»[۲] یہ امیر المومنینؑ کا کلام ہے۔ فرماتے ہیں کسی نے بھی قرآن کے ساتھ ہمنشینی نہیں کی، مگر یہ کہ جب قرآن کے پاس سے اٹھا، تو اس کے اندر کمی بیشی واقع ہوئی، ایک اضافہ اس کے اندر ہوا ہے، ایک افزائش اس کے اندر ہوئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ایک کمی ہوئی ہے، ایک کاستی ہوئی ہے، «زِيَادَةٍ فِي هُدًى» وہ اضافہ ہدایت تھا، ایک حد تک اس کی ہدایت میں، اس کا راستہ ڈھونڈنے میں فائدہ ہوا، حتمی طور پر۔ «أَوْ نُقْصَانٍ مِنْ عَمًى» وہ کمی گمراہی و ضلالت میں ہوئی، وہ کمی اس کے دل کی نابینائی میں ہوئی۔ وہ دل کا اندھا پن، وہ روح کی، درک کی، باطن کی تاریکی کچھ کم ہوئی اور اس میں کمی ہوئی۔

میں نے آج کی بحث سے مربوط آیات سے دو حصوں کو ڈھونڈا ہے۔ پہلا حصہ سورۂ انعام سے ہے۔ البتہ قرآن کے لہجے پر توجہ رکھیے گا۔ قرآن عام کتابوں کی طرح ایسا نہیں ہے کہ کہے کہ فلاں فصل اطاعت و عبادت کے معنی میں ہے، ایسا نہیں ہے۔ قرآن کا مضمون، اس کا بیان اور قرآن کا بولنے والا، اس عام سطح سے بہت بالاتر ہے۔ پروردگار عالم کے لیے، پوری کائنات اور تمام موجودات ایک سطح کی ہیں، اسی بنا پر جیسی وحی کے موقع کی مناسبت ہوتی تھی، کوئی آیت کسی مورد میں نازل ہو جاتی تھی لہٰذا آیت کے اشاروں سے، ان تعبیرات و جملات سے جو آیت کے اندر ہیں، آیت کے سیاق کو دیکھتے ہوئے، اپنا مورد نظر مطلوب ڈھونڈ لیجیے۔

---

۱. «هُوَالبَحرُ مِنْ أَيِّ النَّواحِي أَتَيْتَهُ- وَلُجَّتُهُ المَعْرُوفُ وَالبِرُّسَاحِلُهُ»۔ یہ وہ سمندر ہے جس طرف سے بھی تم اس پر پہنچو اس کی موجیں نیکیاں اور اس کا ساحل احسان ہے۔

۲. نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۶

﴿أَفَغَيْرَ اللهِ أَبْتَغِي حَكَمًا﴾[1] آیا خدا کے علاوہ کسی اور کو حکم کے طور پر قبول کر لوں اور تلاش کروں؟ تفاسیر میں حکم کے معنی فیصلہ کرنے والے اور حاکم کے بھی بتائے گئے ہیں۔ وہ شخص کہ جس سے انسان حکم طلب کرتا ہے، یعنی اس سے فرمان چاہتا ہے، یا اس سے فیصلہ طلب کرتا ہے، دونوں کو حکم کہا جاتا ہے۔ اور خدائے متعال بہترین فیصلہ کرنے والا بھی ہے، بہترین حاکم بھی ہے۔ پس فرمان بھی خدا ہی دے گا، ﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾[2] جان لو کہ اللہ کے لیے ہے تخلیق اور حکم۔ اس نے خلق کیا ہے، وہی حکم بھی دے گا۔ ﴿أَفَغَيْرَ اللهِ أَبْتَغِي حَكَمًا﴾ آیا خدا کے علاوہ، کوئی اور حاکم، کوئی اور فرمان دینے والا یا کوئی اور فیصلہ کرنے والا طلب کروں؟ ﴿وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا﴾ جب کہ وہ خدا ہے جس نے اس مجموعے کو، قرآن کو، تفصیل کے ساتھ، وضاحت کے ساتھ، اختلاط و امتزاج کے بغیر، تمہارے لیے بھیجا ہے۔ مُفَصَّلًا یعنی اس کے بیان میں کوئی چیز خلط نہیں ہے، کوئی چیز اس میں ملی ہوئی نہیں ہے، غیر خدا کا کوئی کلام اس میں شامل نہیں ہے۔ ﴿مُفَصَّلًا﴾ یعنی مُبَيَّنًا، پوری طرح اور مکمل طور پر وضاحت کے ساتھ بیان شدہ۔

﴿وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ﴾ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، ﴿يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ﴾ وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن نازل ہوا ہے تمہارے پروردگار کی جانب سے حق کے ساتھ۔ یقیناً خدا کی جانب سے نازل ہوا ہے، خدا کی جانب سے آیا ہے، ﴿فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ﴾ پس تم شک و تردید کرنے والوں میں سے نہ ہونا (خطاب پیغمبرؐ سے ہے) مبادا شک کرو! مبادا متزلزل اور شکوک کا شکار ہو جاؤ! تم تو جانتے ہو کہ یہ کتاب تمہارے پروردگار کی جانب سے آئی ہے، خدا نے تمہیں کتاب دی ہے اور تم جانتے ہو، واقف ہو، تردید نہ کرو، یقینی حالت میں رہو۔

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا﴾ پورا ہوا، کامل ہوگیا، ناقابلِ تردید ہو گیا، تمہارے پروردگار کا حکم، سچائی اور استحکام کے اعتبار سے۔ فرمان پروردگار یہ تھا کہ انبیاؑ کا سلسلہ آئے، لوگوں کو بتدریج آخری حد تک پہنچائے، پھر آخری نبی آجائے، انسانوں کو ایک وسیع افق، ایک لامتناہی میدان کے سامنے کھڑا کر دے۔ چلنے کا وسیلہ، زیادہ سے زیادہ تکامل پانے کا وسیلہ انہیں عطا کردے، تاکہ انسان اس میدان

---

۱. سورہ مبارکہ انعام: آیت ۱۱۴ اور ۱۱۵

۲. سورہ مبارکہ اعراف: آیت ۵۴

میں لامتناہی منزلوں تک پہنچ سکیں، ﴿وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾[1] خدا تک۔ یہ تھا فرمان پروردگار، یہ تھی قَدَرِ پروردگار، یہ تھا کلمۂ پروردگار جو پورا ہوا، مکمل ہو گیا اور ناقابلِ تردید ہو گیا۔ ﴿لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ﴾ کوئی نہیں ہے جو اس کے کلمات اور احکامات کو تبدیل کردے، ﴿وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ اور وہ ہے سننے والا اور جاننے والا، تمہاری باطنی ضروریات کی آواز کو سننے والا اور تمہارے لیے ضروری راہ و رسم اور شیوۂ [زندگی] کا جاننے والا۔ وہ تمہارے لیے لائحۂ عمل ترتیب دے سکتا ہے۔

﴿وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ﴾[2] دیکھیے کس طرح سے سننے والے کے ذہن کو آمادہ کرتا ہے۔ پہلے جملے میں، پہلی آیت میں، خدا کی حکومت اور اس کے فیصلے کا مسئلہ ہے کہ وہ حکومت اور فیصلے کے لیے سب سے زیادہ حقدار ہے۔ دوسری آیت میں، دین اور فرمان خدا کے ناقابل تردید ہونے کا مسئلہ ہے کہ دشمن، کافر، سرکش اور مخالف جو کرتا ہے، کر لے، خدا کا حکم فیصلہ کن اور قطعی ہے۔ تیسری آیت میں، یہ ہے کہ خواہشات اور ہوا و ہوس کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے، خدا کی اطاعت کرنی چاہیے۔ ﴿وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ﴾ اور اگر تم پیروی کرو گے روئے زمین کے زیادہ تر لوگوں کی، اکثریت کی ﴿يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ﴾ وہ تمہیں خدا کی راہ سے گمراہ کر دیں گے، ﴿إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ﴾ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں، ﴿وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾ وہ صرف اندازوں ہی سے کام لیتے ہیں۔ لوگ ظن پر، اندازے پر، گمان پر عمل کرتے ہیں۔ جو افراد لوگوں کے زندگی گزارنے کے لیے راستے، روشیں اور طریقے بناتے اور تجویز کرتے ہیں، کیا انہیں ان راستوں کے صحیح ہونے کا یقین ہے؟ اگر اپنی سادہ لوحی کے تحت یقین کر بھی لیں، تو دعا کرنی چاہیے کہ چالیس، پچاس سال دنیا میں رہ جائیں تاکہ دیکھ لیں کہ ان کے مضبوط منصوبے کس طرح بےکار ثابت ہوتے ہیں۔ دیکھ لیں کہ ان کے اندازے کس قدر غلط ثابت ہوئے۔ انہیں یقین بھی نہیں ہے، ﴿وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾ تخمینوں سے، گمانوں سے، مفروضوں اور تھیوریوں سے چاہتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں کو، انسانی معاشرے کو چلائیں۔ لیکن خدا خیالی تھیوری سے کسی کو نہیں چلاتا، سچی حقیقتوں کے ساتھ، حقیقی علم و دانش کے ساتھ، انسانوں کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ ﴿إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ﴾ یقیناً

---

۱. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۱۵۶

۲. سورہ مبارکہ انعام: آیات ۱۱۶ سے ۱۱۸

تمہارا پروردگار ان کے حال سے زیادہ اچھی طرح واقف ہے جو اس کی راہ سے گمراہ ہو جاتے ہیں، ﴿وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ اور وہ زیادہ اچھی طرح جانتا ہے ہدایت یافتہ اور راستہ پانے والوں کو۔

﴿فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ﴾ یہاں انسان کمالِ تعجب سے دیکھتا ہے کہ پہلے ان کلی باتوں کے بعد، کہ لوگوں کی اکثریت کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے، ظن، گمان، خیالی تھیوری اور فرض پر نہیں چلنا چاہیے، آخری نبوت کے بارے میں اور دین کے بارے میں خدا کا حکم پورا، قطعی اور ناقابل تغیّر ہو چکا ہے، ان سب کلی باتوں کے بعد، اچانک کہتا ہے کہ جس چیز پر خدا کا نام لیا گیا ہو، اس میں سے کھائیں، جس بھیڑ کو خدا کے نام کے ساتھ ذبح کیا گیا ہو، اس میں سے کھا سکتے ہو، ایک فرعی مسئلہ! انسان کو بہت زیادہ تعجب آمیز لگتا ہے کہ یہ چیزیں آپس میں کیا ارتباط رکھتی ہیں۔ البتہ ارتباط کے حوالے سے، جو کچھ میں کہوں گا، یہ بھی وہی چیزیں ہیں جو میں اپنے تصور کے ذریعے کہہ رہا ہوں، اس کے اوپر کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے۔ غور و فکر کرنے اور سمجھنے اور درک کرنے کے لیے راستہ کھلا ہوا ہے، مطالعہ کریں، اس تناسب کو ڈھونڈیں، البتہ کچھ چیزیں ہمارے سامنے بھی آرہی ہیں۔

اولاً جیسا کہ ہم نے عرض کیا، پروردگار عالم، جو کہ اس کائنات سے بالاتر اور انسان کے تصور سے کہیں بلند افق اور سطح پر ہے، اس کی نظر میں تمام مسائل ایک ہی سطح پر ہیں۔ خدا کے لیے انسان کی نسبت کلی مسائل اور جزوی مسائل میں کوئی فرق نہیں ہے، سب ایک ہی ہیں۔ خدا کے لیے ہر چیز ایک ہی ہے۔ جو کچھ انسان کی سعادت کی بنیاد ہے، وہ خدا کے لیے ایک حکم کی حیثیت رکھتا ہے، کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ حکم جزوی ہو، فرعی ہو، ایک شخص سے مربوط ہو یا کلی ہو، عمومی ہو اور تمام انسانوں سے متعلق ہو، یہ پہلی بات۔

ثانیاً، ذبح اور تذکیہ کے مسئلے کا درست طور پر تجزیہ کرتے ہیں۔ کیا مطلب ہے اس بات کا کہ جس جانور کو انسان کھانا چاہتا ہے، اسے ذبح کرتے وقت خدا کا نام لیا جائے؟

یعنی آپ کی ابتدائی‌ترین اور لازمی‌ترین ضرورت، جو کہ آپ کی خوراک ہے، وہ بھی خدا کے نام کے ساتھ، خدا کے لیے ہونی چاہیے۔ پیٹ کو جو بھرتے ہو، خدا کے لیے بھرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پیٹ بھرنا اصلی معاملہ نہیں ہے، اصلی مسئلہ خدا ہے۔ اگر ایک مرتبہ آپ کو محسوس ہوا کہ پیٹ بھرنے سے

خدا سے دور ہو جاؤ گے، تو اسے چھوڑ دو، نہ بھرو، اسے بھوکا رہنے دو، بھوک سے مر جاؤ لیکن خدائی راستے کے برخلاف تم سے کوئی حرکت سرزد نہ ہو۔ کیوں؟ اس لیے کہ پیٹ، اگرچہ ایک بنیادی ضرورت ہے، لیکن تمہاری زندگی کی بنیاد نہیں ہے، تمہاری زندگی کی بنیاد، خدا اور خدا کی جانب رخ کرنا ہے۔ یہ بات ہمیں، بھیڑ کو ذبح کرتے وقت «بسم اللہ» پڑھنا، یاد دلاتا ہے، لقمہ لیتے اور کھانا کھاتے وقت «بسم اللہ» پڑھنا یاد دلاتا ہے۔

«بسم اللہ» سے شروع کرو، حتی کہ کھانا بھی۔ «بسم اللہ» سے شروع کرو، حتی کہ افزائش نسل کا عمل بھی۔ «بسم اللہ» سے شروع کرو، حتی کہ داخل ہونا، چلنا پھرنا، باہر نکلنا، گھر کے اندر، دکان میں، ہر کام کو۔ کیا مطلب؟ یعنی تمہاری زندگی کا ہر رخ، ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لیے، اگرچہ لازمی‌ترین ضروریات ہی کیوں نہ ہوں، فرمان خدا کے مطابق اور فی سبیل اللہ ہونا چاہیے۔

﴿فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ﴾ کھاؤ اس میں سے جس پر خدا کا نام لیا گیا ہو، ﴿إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ﴾ اگر تم خدا کی آیات پر ایمان رکھتے ہو۔ ﴿وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ﴾[1] تمہیں کیا ہو گیا ہے، یعنی کس دلیل کی بنیاد پر، کس لیے، ﴿أَلَّا تَأْكُلُوا﴾ نہیں کھاتے ہو، ﴿مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ﴾ اس میں سے جس پر خدا کا نام لیا گیا ہے، ﴿وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ﴾ جب کہ خدا نے تفصیل کے ساتھ، وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے تمہارے لیے، اس چیز کو جو تمہارے اوپر حرام ہے، مگر اضطراری حالت میں، اس کے علاوہ ہر چیز تمہارے لیے حلال ہے۔ ﴿وَإِنَّ كَثِيرًا لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ بہت سے لوگ گمراہ کرتے ہیں اپنی ہوس کی بنا پر، لوگوں کو، بغیر علم، بغیر بصیرت کے۔ صرف اپنی ہوا و ہوس کی وجہ سے، لوگوں کو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ﴿إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ﴾ یقیناً تمہارا پروردگار حد سے تجاوز کرنے والوں سے خوب واقف ہے۔ جو افراد لوگوں کو علم و دانش کے بغیر، گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں، وہ اس آیت کے اشارے کے مطابق، زیادتی کرنے والے ہیں، تجاوز کرنے والے ہیں، دشمنی کرنے والے ہیں۔

﴿وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ﴾ چھوڑ دو اس چیز کو جس کا گناہ ظاہر ہے اور اس چیز کو جس کا گناہ پوشیدہ اور مخفی ہے۔ کچھ کام ایسے ہیں جن کے اشکالات، جن کے برے نتائج ظاہر ہوتے ہیں، کسی انسان کا قتل

---

۱. سورہ مبارکہ انعام: آیات ۱۱۹ سے ۱۲۱

واضح ہے کہ برا کام ہے، ایک جاندار کو ناحق طور پر بے جان کر دینا، ظاہر ہے کہ برا کام ہے، اس کا گناہ ہونا ظاہر ہے۔ کچھ کام ایسے ہیں جن کا گناہ ہونا واضح، ظاہر اور نمایاں نہیں ہوتا۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں انسان نہیں سمجھتا کہ یہ کتنی بری ہیں، بغیر علم کے بات کرنا، لاعلم کے پیچھے چل پڑنا، خدا کے نام اور خدا کی یاد کو ہلکا اور معمولی سمجھنا، غیرِ خدا کی اطاعت کرنا، غیر خدا کے فرمان کو سننا، یہ ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں انسان کے ذہن میں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ اتنی نقصان دہ اور برے نتائج کی حامل ہوں گی، خفیہ ہے، پوشیدہ ہے اس کا گناہ ہونا، لیکن بہر حال، دونوں کو چھوڑ دینا چاہیے، ہر اس چیز کو جو گناہ ہے، خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ ﴿وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ﴾ اور چھوڑ دو ان چیزوں کو جو ظاہر الاثم ہیں، ان کا گناہ ہونا ظاہر ہے اور باطن الاثم ہیں، ان کا گناہ ہونا باطن اور پوشیدہ ہے۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ﴾ جو لوگ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں، انہیں سزا دی جائے گی ان اعمال پر جو وہ انجام دیتے ہیں۔ ﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ﴾ اور نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر اللہ کے نام کا ذکر نہ کیا گیا ہو، ﴿وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ﴾ یہ فسق ہے، دین سے نکل جانا ہے۔ یہاں پر تاکید خدا کی یاد اور اس کے نام کی اہمیت پر ہے۔

﴿وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ﴾ ہماری زیادہ تاکید اس حصے پر ہے۔ البتہ اول سے لے کر اب تک جن آیات کی تلاوت کی ہے، اس میں قدم بہ قدم ایسے اشارے تھے جو ہمارے لیے مفید تھے اس بات کے لیے جو ابھی ہم نے یہاں بیان کی۔ البتہ جتنا زیادہ غور و فکر کریں گے، اتنا ہی زیادہ واضح ہوتا جائے گا۔ لیکن استدلال اور استناد کا اصلی حصہ آیت کا یہی آخری حصہ ہے، ﴿وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ﴾[1] شیاطین اور شیطنت کے مراکز اپنے دوستوں، اپنے حلیفوں اور اپنے ساتھیوں کے ذہنوں میں ڈالتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ شیاطین اور فساد و گمراہی کے مراکز، اپنے ساتھیوں کو، اپنے چیلوں کو، اپنے حلیفوں اور اپنے وابستگان کو اندر سے بھرتے ہیں تاکہ وہ آکر تم لوگوں سے بحث و مباحثہ کریں، تکرار اور کج بحثی کریں۔ ان شیطان کے چیلوں کے مقابلے میں تم لوگوں کی ذمہ داری کیا ہے؟

﴿وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ﴾، لیکن تم لوگ ﴿وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ﴾ اگر تم

---

۱. اور شیاطین تو اپنے والوں کی طرف خفیہ اشارے کرتے ہی رہتے ہیں تاکہ یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں۔

نے ان کی اطاعت کی، پیروی کی، تو تمہارا شمار مشرکوں میں ہوگا۔ دیکھ لیجیے، مشرک، بالکل صاف اور واضح۔ پس اطاعت شیطان، یعنی رحمان کے مقابلے میں شیطنت کا مرکز، شیطان رحمان کے مقابلے میں ہی تو ہے، شیطان خدا کے مقابلے میں ہی تو ہے، اطاعت شیطان یعنی شیطنت کے مرکز، یا شیطان کے چیلوں کی اطاعت، یعنی اس کے ایجنٹوں، اس کے آلہ کاروں، اس کے دوستوں، اس کے حلیفوں، اس کے نوکروں کی اطاعت موجب بنتی ہے کہ تم لوگ مشرک ہو جاؤ۔ ﴿وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ﴾ اور اگر تم نے ان کی اطاعت کی، ﴿إِنَّكُمْ﴾ بے شک تم لوگ، ﴿لَمُشْرِكُونَ﴾ حتمی طور پر مشرک ہو۔

بارہویں نشست

توحید اور معاشرتی طبقہ بندی کی نفی

۱۳ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری — ۱۹۷۴-۰۹-۳۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِن وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾

(سورہ مومنون/۹۱)

عرض کیا تھا کہ عقیدۂ توحید ایک قرارداد ہے جو فرائض اور ذمہ داریوں کے ایک مجموعے کو ہمارے کاندھوں پہ ڈالتی ہے۔ ان شاء اللہ ایک موحدانہ زندگی گزارنے کے لیے ہم پر لازم ہے کہ ان ذمہ داریوں کو پہچانیں۔ ان فرائض میں سے پہلا فرض یہ تھا کہ عبودیت اور اطاعت، خدا کی ذات میں منحصر ہے، یہ توحید کی پہلی ذمہ داری ہے۔ ہم نے ایک، دو یا دو تین تلاوتوں کے ضمن میں یہ بات بیان کر دی۔ آج دوسری ذمہ داری، جو توحید کا عقیدہ ایک موحّد کے کاندھوں پر ڈالتا ہے، موحّد معاشرے، موحّد فرد، موحّد دنیا پر عائد کرتا ہے اسے ہم یہاں «توحید اور معاشرتی طبقہ بندی کی نفی» کے عنوان سے بیان کریں گے۔

«توحیدی معاشرہ» ایک ایسا معاشرہ ہے جس کے اندر انسانوں کے مختلف گروہ، حقوق اور خصوصی امتیازات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ تمام انسان یکساں حقوق کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ سب لوگ ایک ہی راستے پر اور یکساں وسائل و امکانات اور یکساں حقوق کے تحت زندگی گزارتے اور قدم بڑھاتے ہیں۔ یہ وہ معاشرہ ہے جو توحید کا عقیدہ، معاشرے کی طبقہ بندی کے حوالے سے، ہمارے ذہن اور ہمارے تصور کے سامنے پیش کرتا ہے۔

اگر تاریخ کی طرف رجوع کریں، تو ہم دیکھیں گے کہ تمام معاشروں کے اندر طبقاتی اختلاف کا مسئلہ، تاریخ کا مسلسل جاری رہنے والا درد رہا ہے۔ نہ صرف پسماندہ قبائلی معاشرے، نہ صرف تمدن سے کوسوں دور سرزمینوں کے معاشرے، بلکہ ان ممالک اور ان سرزمینوں میں بھی جو انسانی تمدن کی ماں اور انسانی تمدن کا گہوارہ ہیں، وہاں پر تو اتفاق سے طبقہ بندی اپنے بدترین اور مکروہ‌ترین چہرے کے ساتھ تاریخ کے صفحات میں ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ واقعی، تاریخ کا ایک بڑا ظلم اور تاریخ بشریت کے لیے ایک بڑا داغ یہی ہے: طبقاتی فرق۔ کیا مطلب طبقاتی فرق؟ یعنی اس معاشرے میں رہنے والے انسان سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ بعض لوگ مجبور ہیں کہ محروم رہیں، تکلیفیں اٹھائیں، دوسرے گروہ کی خدمت انجام دیں اور اس محرومیت اور تکلیف پر شکوہ بھی نہ کریں۔ دوسرے گروہ کے پاس سب کچھ ہو، بہرہ مند ہو، زندگی کی لذت اور عیش اس کے لیے ہو، تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکے اور کوئی اعتراض بھی نہ ہو۔ مثلاً ہندوستان میں طبقاتی اختلاف اپنے عروج پر ہے۔

یہ لوگ چار اصلی طبقوں کے قائل تھے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقات کے نیچے اور سینکڑوں طبقے ان چار اصلی طبقوں کے درمیان۔ پھر دو مختلف طبقوں کے افراد کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ آپس میں شادی کریں، آپس میں بات کریں، ایک دوسرے سے ہاتھ ملائیں، ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھیں، ساتھ چلیں، ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کریں، اور اسی قسم کی اور باتیں۔ یہ سب ایک دوسرے سے ایک فولادی دیوار کے ذریعے جدا ہو جاتے تھے۔ کیوں جدا ہونا چاہیے؟ برہمن کے پاس کیا ہے، جو مجھ کسان کے پاس نہیں ہے؟ یا مجھ معمولی دکاندار کے پاس نہیں ہے؟ یا فلاں بڑا سپاہی، اس کے پاس ایسا کون سا طبیعی امتیاز ہے جو مجھ عام اور معمولی انسان کے پاس نہیں ہے؟

اگر یہ سوال ہوتا تھا، تو جانتے ہیں وہ جواب میں کیا کہتے تھے؟ کہتے تھے، بیہودہ باتیں بند کرو! اس لیے کہ خود خلقت کے اندر، خود تخلیق کے اندر، تم دو گروہوں کو دو انداز سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق قانون اور معاشرتی رواج سے نہیں ہے، تم دونوں دو مختلف انداز سے پیدا کیے گئے ہو۔

کچھ لوگ بنیاد سے ہی زیادہ اچھے خلق ہوئے ہیں، وہ زیادہ عزت و احترام کے لائق ہیں، ان کی عظمت طبیعی ہے، ان کی برخورداری ان کی ذات کا حصہ ہے، نچلے طبقات کی محرومیت بھی ان کی ذات کا حصہ ہے۔ یہ تھی ان کی منطق۔

آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے ایک معاشرے کے اندر، آیا ممکن ہے کہ کسی دن یہ طبقاتی فرق مٹ جائے گا؟!

کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟

کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟

ایک مختلف الطبقات معاشرے کے اندر طبقاتی اختلاف کو آپ کے خیال میں کون مٹا سکتا ہے؟

کیا وہ طبقہ جو ہر چیز سے بہرہ مند ہے؟

آیا وسائل سے بہرہ مند طبقہ آئے گا اور کہے گا کہ میں خدا کی خاطر اپنے حقوق سے دستبردار ہوتا ہوں؟

یہ ایک خام خیالی ہے۔ اگر کسی معاشرے میں موجود طبقاتی تفاوت کو مٹانا ہے تو لازمی طور پر محروم طبقے کو اپنے حق کا مطالبہ کرنا ہوگا، جو حصہ اس کا ہے، وہ اسے طلب کرے اور اونچے طبقے کے سہولت یافتہ خود غرضوں پر اعتراض کرے، نچلے طبقے کو اعتراض کرنا ہوگا۔ ایک ایسے معاشرے کے اندر، جس کی تصویر میں نے پیش کی، محال ہے کہ نچلا طبقہ اعتراض کرے؟ کیوں؟

اس لیے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے یہ سمجھتا ہے کہ طبیعی صورتحال ایسی ہی ہے، وہ ذاتی طور پر پیدا ہی اس طرح ہوا ہے، تغیر اور دگرگونی ناممکن ہے، کچھ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح خلق ہوا ہے، اسی طرح پیدا ہوا ہے۔ جب ایک انسان معتقد ہو جائے کہ طبیعت و فطرت و سرشت و تخلیق الٰہی نے ہی اسے اس خاص انداز سے پیدا کیا ہے، تو محال ہے کہ اس کے لیے اس سے ہٹ کر کسی اور صورت کی کوئی امید ہو، اور ایسے حقوق و امتیازات جو اس کی ساخت و طبیعت کے متناسب نہیں ہیں، وہ اس سے بہرہ مند ہو جائے۔ وہ کہے گا کہ میرا حق یہی ہے، جس کی تقدیر کی چادر سیاہ دھاگے سے بُنی گئی ہو، پھر اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم ابتدا ہی سے بدبخت پیدا ہوئے ہیں، ہمیں ابتدا ہی سے کمتر بنایا گیا ہے، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

آپ ایک سیاہ چیز کو نہر کے کنارے لے جائیے، ایک سمندر کے کنارے لے جائیے اور دھونا شروع کیجیے، جب وہ ذاتی طور پر سیاہ ہے، جب ابتدا ہی سے، اس کا طبیعی رنگ ہی سیاہ ہوگا، تو کیا ممکن ہے کہ یہ رنگ مٹ جائے؟ بلکہ اس پر پڑا گرد و غبار ہٹ جائے گا اور اس کی سیاہی مزید واضح اور نمایاں ہو

جائے گی۔ بنابریں، طول تاریخ میں، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا، ان معاشروں میں، یہ بڑا ظلم روا تھا اور اس کا کوئی حل بھی موجود نہیں تھا۔

البتہ بعض مصلحین پیدا ہوتے تھے، افکار کو بدل دیتے تھے، اس نکتے پر غور کیجیے گا جسے میں عرض کر رہا ہوں، اس بات کی وضاحت کی جگہ نہیں ہے، کیونکہ یہ ادیان کے ساتھ مختص ایک مخصوص فلسفہ ہے۔ مصلحین آتے تھے، پہلے افکار کو بدلتے تھے، پہلے رسم و رواج کو بدلتے تھے، پہلے کہتے تھے کہ یہ فلسفہ غلط ہے، اس فلسفے کے غلط ہونے کی بنیاد پر، لوگوں کو اس صورتحال کے ظالمانہ ہونے پر قائل کرتے تھے۔ تاریخی تبدیلیوں کی بحث کا درست نچوڑ یہ ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ پہلے صورتحال تبدیل ہو جاتی تھی، پہلے معاشرے کی شکل بدل جاتی تھی، بعد میں فلسفے اور افکار میں تبدیلی آتی تھی، نہیں، مصلحین آتے تھے، یہ ہماری تاریخ ہے، مشرقی سرزمین کی تاریخ ہے، یعنی جن لوگوں نے اس طرح سے سوچا اور اس طرح سے فرض کیا، ہمارے خیال میں، انہوں نے مشرقی سرزمین کی تاریخ کو پڑھا نہیں تھا، یورپ کی تاریخ کو دیکھا تھا، یہ ہندوستان ہے، یہ چین ہے، یہ ایران ہے، یہ مصر ہے، جو مصلحین آئے ہیں، مذہبی مصلحین، انہوں نے پہلے افکار کو تبدیل کیا، فلسفے بدل ڈالے، پھر جب افکار بدل گئے، نظریات بدل گئے، تو ماحول اس بات کے لیے تیار ہو گیا کہ معاشرے کی حالت، معاشرے کا غلط نظام بھی بدل جائے۔

اسلام نے آکر اعلان کیا کہ متعدد خدا نہیں ہیں، یہ کہنا غلط ہے کہ خدا متعدد ہیں، بلکہ خدا ایک ہے۔ جن لوگوں نے یہ تصور کر رکھا تھا کہ دو خداؤں نے، دو قسم کے انسانوں کو خلق کیا ہے، دو قسم کے امتیازات اور مشخصات کے ساتھ، انہوں نے غلطی کی ہے۔ ایک خدا ہے، تمام کائنات کو اسی نے خلق کیا ہے، کائنات اور اس میں رہنے والوں کی تدبیر پوری طرح سے اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس نے سب کو برابر خلق کیا ہے۔ اس نے سب کو ایک اصل سے، ایک طینت سے، ایک فطرت سے، ایک جڑ سے اور ایک مادی بنیاد سے بنایا ہے۔ اس حوالے سے قرآنی آیات متعدد ہیں، ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ﴾[1] اب ہم آج کے موضوع سے متعلق آیات پر گفتگو کریں گے۔

---

[1] ۔ سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۲۱۔ اے انسانو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تم سے پہلے والوں کو بھی خلق کیا ہے۔

ہم نے عرض کیا کہ تمام انسانوں کی اصل، جڑ اور بنیاد ایک ہے۔ تمام انسان یکساں وسائل کے ساتھ دنیا میں آئے ہیں۔ تمام انسان لامتناہی کمال کی جانب پرواز کرنے اور عروج پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تمام انسان عظیم و عظیم تر ہو سکتے ہیں۔ یہ استعداد ہر ایک کے اندر ہے۔ البتہ توجہ کیجیے گا کہ جو موجودات اور جو انسان عام بشری سطح سے واضح طور پر بالاتر ہیں، یعنی انبیاؑ اور ائمہؑ، وہ میری ان کلی باتوں میں شامل نہیں ہیں۔ یہ جو ہم نے کہا کہ ہر انسان پرواز کر سکتا ہے اور لامتناہی منزلوں تک پہنچ سکتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان اپنی کوشش اور جدوجہد سے پیغمبر یا امام بھی بن سکتا ہے، وہ ایک دوسری بحث ہے، پیغمبر یا امام کیا ہوتا ہے اور پیغمبر یا امام کس طرح بن سکتے ہیں، یہ آگے کی بات ہے۔ ایک اور گفتگو میں، ایک اور بحث میں، اگر ممکن ہوا تو مختصراً اشارہ کریں گے۔ بطور اجمال، انبیاؑ اور ائمہؑ کے پاس کچھ خاص امتیازات ہیں، کچھ خصوصیات ہیں جو عام انسان میں نہیں ہیں، البتہ آپ جانتے ہیں کہ ان کی تعداد بہت کم ہے، استثنائی ہیں، جب کہ ہماری گفتگو انسانی معاشرے کے افراد پر ہے بطور عموم۔ البتہ وہ انبیاؑ اور ائمہؑ بھی مادی بنیاد اور منشا کے اعتبار سے عام انسانوں سے فرق نہیں رکھتے ہیں۔ «اَبُوهُم آدَمٌ و الاُمُّ حَوّا»۔ (سب کے باپ آدمؑ ہیں اور ماں حوا ہیں۔ امام علیؑ سے منسوب دیوان میں سے ایک مصرعہ)

یہ ایک اسلامی تعلیم ہے، توحید کے زیر سایہ انسانوں کو تعلیم دی گئی اور ثابت کیا گیا کہ معاشرے کے اندر طبقاتی اختلاف کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جو معاشرہ اسلام وجود میں لاتا ہے، وہ معاشرہ گروہوں میں بٹا ہوا نہیں ہوتا، ناممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو بعض ایسے حقوق میسر ہوں جو دوسروں کو حاصل نہ ہوں۔ اس معاشرے میں یہ کبھی نہیں کہا جاتا ہے کہ لوگوں کو دو مختلف بنیادوں، دو مختلف جڑوں سے خلق کیا گیا ہے۔ اس معاشرے میں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ایک شخص مٹی سے پیدا ہوا ہے اور فرض کیجیے وہ دوسرا نور سے پیدا ہوا ہے۔ مادی اعتبار سے، سب کی مادی جڑ ایک ہی ہے۔ بنابریں، توحید، اس معنی میں کہ ایک خدا کا قائل ہونا، کائنات کی تدبیر و تخلیق کو ایک ہی خدا کی ذات سے جاننا، یہ معاشرے کے اندر طبقاتی فرق کی نفی کا ضامن ہے۔

البتہ ایک بات یہاں پر ہے اور وہ یہ کہ معاشرے کے طبقات، ہمیشہ اس صورت میں جیسا میں نے ہندوستان کے حوالے سے بیان کیا، نہیں تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر جگہ ایسا ہی کوئی فلسفہ ہو، ممکن ہے

کہ بعض معاشروں میں، بعض اقوام و ملل کے اندر، فلسفہ اور نظریات کے حوالے سے دعوے کی حد تک کہا جائے کہ سب لوگ ایک ہی سطح کے ہیں، لیکن عملی طور پر طبقاتی فرق پایا جائے، جیسا کہ آج کی دنیا میں ہے۔

آج آپ دنیا پر نظر ڈالیں، خصوصاً سرمایہ دارانہ دنیا میں، خصوصاً ان ممالک میں جو سرمایہ داری کے لحاظ سے زیادہ عروج پر ہیں، طبقاتی فرق بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ البتہ وہاں ہرگز یہ نہیں کہا گیا ہے کہ مزدور اور مالک تخلیق کی دو مختلف بنیادوں اور مختلف جڑوں سے پیدا کیے گئے ہیں، نہیں، وہ یہ نہیں کہتے کہ فلاں عظیم کمپنی یا فلاں کارٹل کا مالک اور فلاں معدن کا مزدور الگ الگ جڑوں اور بنیادوں سے خلق کیے گئے ہیں، نہیں، لیکن جو کام یہ دونوں انجام دیتے ہیں، جو قوانین ان دو قسموں کے لوگوں کے لیے بنتے ہیں، معاشرے کے اندر ان دو قسموں کے افراد کے درمیان جو سلوک روا رکھا جاتا ہے، اس میں اور اس سلوک میں کوئی خاص فرق نہیں ہے جو ان لوگوں کے درمیان پایا جاتا ہے جن کا عقیدہ تھا کہ یہ دو جداگانہ جڑوں اور بنیادوں سے خلق ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں کے لیے لامتناہی وسائل و امکانات، جبکہ دوسرے بڑے گروہ کے لیے وسائل صفر۔ کچھ لوگ دنیا بھر کی دولت کو اپنے حق میں چھین لیتے ہیں، جبکہ دوسرے لوگوں کو اپنے ہاتھ کی محنت مزدوری کو بھی تنہا کھانے کی اجازت نہیں ہوتی۔

اس پر بھی طبقاتی اختلاف صادق آتا ہے اور آج یہ دنیا کے اندر موجود ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ طبقاتی اختلاف اُن دنوں کے طبقاتی اختلاف سے زیادہ ذلت آمیز اور زیادہ موذی اور مہلک ہے۔ وہ صاف کہتے تھے کہ ہاں، ہم ایک دوسرے سے مختلف ہیں، یہ کہتے ہیں کہ ہم آپس میں بھائی ہیں، سب ایک سطح پر ہیں، ہم تو آپ کے حقوق کے حامی ہیں، لیکن عملی طور پر دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، عملی طور پر وہی بے جا امتیازات پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات قوانین کے نفاذ میں مساوات اور برابری دکھائی دیتی ہے کہ فلاں شخص نے بھی فلاں جرم کیا، تو فلاں سزا دی گئی، اگرچہ اس کا تعلق بالاتر طبقے سے ہے، لیکن دوبارہ نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ نہیں، اصل بات کچھ اور ہے۔ دیکھتے ہیں کہ وہی طبقاتی اختلافات، وہی بے جا اجتماعی امتیازات، مکمل طور پر اپنی جگہ پہ باقی ہیں۔ درحقیقت وسائل سے استفادے کا حق صرف کچھ لوگوں کو حاصل ہے اور ایک بڑی اکثریت محروم ہے اور سب سے پہلی چیز جس سے وہ محروم ہیں، ایک صحیح درک و فہم اور مکمل فکری رشد ہے۔

اسلام نے ان سب کی نفی کی ہے۔ یہاں بطور خلاصہ، اس عظیم کتاب قرآن کریم کی آیات میں مجموعی طور پر اجتماعی معاشرتی طبقہ بندی کی نفی کے حوالے سے جو کچھ ذکر ہوا ہے، اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ جب میں نے اس پر غور و فکر کیا، تو دیکھا کہ بہت زیادہ آیات ہیں جن میں سے چند ایک کو میں نے یہاں لکھا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات میں جن تعلیمات کی نشانیاں بہت واضح ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

سب کا خالق و معبود اور سب کا مدبر خدائے متعال ہے۔ یہ ایک اسلامی بات ہے۔ سب کا خالق ایک ہے اور وہ خدا ہے۔ آپ کہیں گے کہ کیا فرق پڑتا ہے؟ بہت فرق پڑتا ہے، اگر ہم اس بات کے قائل ہو گئے کہ خالق دو ہیں وہ اجتماع اور دو خداؤں کا وہ فلسفہ، دو خدا ہونا، اس کا سب سے پہلا اثر یہ ہے کہ معاشرے کے اندر دو گروہ بن جاتے ہیں۔ جب ہم ایک خدا کے ماننے والے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کے تمام لوگ ایک ہی صف میں ہیں، ایک گروہ ہیں، ایک طبقہ ہیں، ایک دوسرے کے بھائی اور ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کا خدا ایک ہے اور ان کا خالق ایک ہے۔ کیا خدا کو ان میں سے ایک گروہ کے ساتھ زیادہ محبت تھی جب ان کو خلق کیا تھا؟ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللهِ وَأَحِبَّاؤُهُ﴾[1] یہودیوں نے کہا، ہم خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔ خدائے متعال ایک دوسرے مقام پر، ان کے ایک اور جرم کو سامنے لاتا ہے۔ جواب بھی دیتا ہے اور مذمت بھی کرتا ہے۔ ﴿قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللهِ﴾[2] اگر تم لوگ اتنے ہی خدا کے دوست ہو، اس کے نزدیک ہو، اس کے اعزا و اقربا میں سے ہو، تو تم نے اس کے انبیاؑ کو کیوں قتل کیا؟ اس کے برگزیدہ بندوں کو کیوں قتل کیا؟ کس لیے؟ یہودی کہتے تھے کہ ہم خدا کی اولاد اور اس کے عزیز ہیں، ہمارے پاس ایک خصوصی امتیاز ہے۔ نہیں، اسلام کہتا ہے کہ یہ ایک غلط بات ہے۔ ایک اور مقام پر فرماتا ہے:﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾[3] اگر تم لوگ کہتے ہو کہ تم خدا کے ساتھی اور اس سے بہت نزدیک ہو، اگر سچ کہتے ہو، تو موت کی تمنا کرو۔ اس ظاہری زندگی سے آزاد ہو جاؤ، اپنے محبوب، پیارے، ساتھی اور رشتہ دار خدا کے پاس چلے جاؤ نا، یہ

---

۱. سورہ مبارکہ مائدہ: آیت ۱۸

۲. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۹۱

۳. سورہ مبارکہ جمعہ: آیات ۶ اور ۷

تو تمھاری اپنی خواہش ہونی چاہیے، پھر فرماتا ہے:﴿وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا﴾ محال ہے کہ یہ لوگ موت کی تمنا کریں۔ یہودی اور موت کی تمنا؟!

پس سب کا خالق و معبود اور سب کے امور کا مدبر خدا ہے۔ یہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے کہ اگر خالق و معبود ایک ہو، تو ناگزیر طور پر تمام انسان ایک طبقے میں اور ایک ہی صف میں ہوں گے۔ سب لوگ مادی طور پر ایک ہی جڑ اور اصل سے خلق کیے گئے ہیں۔ اس مادی لفظ پر ہم زور دے رہے ہیں، خاص توجہ دے رہے ہیں، مادی اعتبار سے، جسمانی ساخت کے حوالے سے، تمام انسان ایک جڑ اور ایک ہی اصل سے خلق ہوئے ہیں۔ تخلیق کے اعتبار سے کسی بھی شخص کو کوئی ایسا امتیاز حاصل نہیں ہے جو اس کے لیے زائد حقوق کا منشا ثابت ہو۔ تمام امتیازات تمام لوگوں کے پاس اور خود انسان کی اپنی مسلسل کوششوں اور جدوجہد سے وابستہ ہیں۔

اب اس پہلے حصے کی آیات پر توجہ کیجیے جو کہ سورۂ مومنون کی آیات ۸۴ سے ۹۱ تک ہیں۔ ﴿قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ اے پیغمبرؐ! ان سے پوچھیں، زمین اور جو کچھ اس میں ہے، وہ کس کی ملکیت ہے؟ اگر تم جانتے ہو۔ مشرکوں سے کہہ دو، ان مشرکوں سے جو اپنے خداؤں کے اثر و رسوخ کے علاقے کو تقسیم اور معین کرتے تھے، کہہ دو زمین اور جو کچھ اس میں ہے، وہ کس کی ملکیت ہے؟ ﴿سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ﴾ وہ کہیں گے خدا کی ملکیت ہے۔ مکہ کے مشرک اللہ پر اعتقاد رکھتے تھے اور بتوں کو ایسا شفیع سمجھتے تھے جو خدا کے سامنے ان کی شفاعت کریں گے۔ ﴿قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾ کہہ دیجیے کہ پھر سمجھتے کیوں نہیں ہو، ہوش میں کیوں نہیں آتے ہو؟

﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ کہہ دیجیے کہ کون ہے ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا مدبر اور چلانے والا؟ ﴿سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ﴾ کہیں گے کہ یہ بھی خدا کی ملکیت ہے۔ پروردگار کی حکومت اور اقتدار آسمان اور زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ ﴿قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ﴾ کہہ دیجیے کہ پھر ڈرتے کیوں نہیں ہو اس خدا سے؟ اپنے عمل اور اپنی فکر کو اس کے کہنے اور اس کے حکم کے مطابق قرار کیوں نہیں دیتے؟

﴿قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ﴾ کہہ دیجیے، وہ کون ہے کہ ملکوت، حکومت اور ہر چیز کا مطلقہ اقتدار جس کے ہاتھ میں ہے؟ جن لوگوں کے پاس میں طاقت و قدرت ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ کسی جسم پر تسلط رکھتے ہوں گے۔ آپ جو کہ اپنے گھر کے مالک ہیں، ایک اینٹ کو اٹھا

کر دوسری جگہ پر رکھ سکتے ہیں، آپ کا تسلط اسی قدر ہے۔ ایک لوہے کے ٹکڑے کو ادھر سے اٹھا کر ادھر رکھ دیں گے، دو ٹکڑوں کو ملا دیں گے یا انہیں جدا کر دیں گے، ایک لوہے کے ٹکڑے پر آپ کا اتنا ہی زور چلے گا۔ لیکن جو ذات ان موجودات کے اجزا کے تمام ذرات پر مسلط ہے، اس کے ایٹم کی حرکات بھی اس کے اختیار میں اور اسی کے تحت فرمان ہیں، نباتات میں نشو و نما، جانوروں اور انسانوں کے وجود کی تمام اندرونی حرکات، خلاصہ یہ کہ ان کی ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ خدا ہے۔ ﴿قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ کہہ دیجیے کس کے ہاتھ میں ہے ہر چیز کی ملکوت و سلطنت اور اقتدار، ﴿وَهُوَ يُجِيرُ﴾ اور وہ پناہ دیتا ہے، ﴿وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ﴾ اس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دی جا سکتی، یعنی خدا سے بھاگ جاؤ اور خدا کے مقابلے میں کسی اور کی پناہ حاصل کر لو، یہ ہے ﴿يُجَارُ عَلَيْهِ﴾۔ فرض کیجیے کہ عیسائی خدا کی معصیت کریں اور حضرت عیسیٰؑ کی پناہ میں چلے جائیں اور حضرت عیسیٰؑ انہیں پناہ دے دیں، خدا کے مقابلے میں ان کی حمایت کریں، ایسی کوئی چیز ممکن نہیں ہے۔ ﴿وَهُوَ يُجِيرُ﴾ وہ ہر موجود کو پناہ دیتا ہے، ہر انسان کو ﴿وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ﴾ اس کے سامنے، اس کے مقابلے میں، کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی، ﴿إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ اگر تم جانتے ہو۔ کون ہے جو ایسا ہو؟ ﴿سَيَقُولُونَ لِلَّهِ﴾ کہیں گے کہ ہر چیز کا ملکوت خدا کے پاس ہے اور خدا کی ملکیت ہے اور وہ خدا ہے جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی، ﴿قُلْ فَأَنَّى تُسْحَرُونَ﴾ کہہ دیجیے کہ پھر کیونکر دھوکا کھاتے ہو؟ اور لطیف بات ہے کہ قرآن تاکیداً فریب خوردگی پر گفتگو کرتا ہے، دھوکہ کھانا، غافل رہنا۔ ہمیشہ چاہتا ہے کہ لوگ غافل نہ رہیں، دھوکہ نہ کھائیں، اپنی آنکھوں کو کھولیں۔ قرآن کو یقین ہے کہ اگر لوگ آنکھوں کو کھولیں گے، تو اس کا مقصد پورا ہو جائے گا اور صحیح بھی ہے۔ ہم بھی آج یہی کہنا چاہتے ہیں۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر آج لوگ اپنی آنکھوں کو کھولیں گے تو ہمارا یہ قرآن عالمی حکومت پیدا کر لے گا، اگر آنکھ کھول لیں، لیکن جہالت اور غرور اجازت نہیں دیتا اور دوسری جانب سے خیانت کرنے والے ہاتھ اجازت نہیں دیتے کہ آنکھیں کھل جائیں۔

﴿بَلْ أَتَيْنَاهُمْ بِالْحَقِّ﴾ بلکہ ہم نے حقیقت کو ان کے اختیار میں رکھا ہے، ﴿وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ﴾ اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔ ہم نے بات کو ان کے سامنے واضح کر دیا، حق کو ان کے اختیار میں دے دیا، وہ اپنی اس فکری و عملی حالت سے جو انہوں نے اختیار کی ہوئی ہے، بہانے بناتے ہیں، جھوٹے بہانے

تراشتے ہیں۔ ﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَلَدٍ﴾ خدا نے کوئی بیٹا نہیں اپنایا ہے، ﴿وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَهٍ﴾ کوئی معبود اس کے پہلو میں اور اس کے ساتھ موجود نہیں ہے۔

پھر غور کیجیے کہ زیادہ تاکید آیت کے اسی حصے پر ہے، البتہ اس سے پہلے کی آیات میں کچھ دلالت تھی اس بات کی جانب جو ہمارے مدِ نظر تھی۔ ﴿إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَهٍ بِمَا خَلَقَ﴾ اگر اور خدا بھی ہوتے، تو ہر خدا اپنی پیدا کردہ مخلوق کو کسی طرف لے جاتا۔ یعنی اختلاف، انسانوں کے درمیان طبقاتی اختلاف، کائنات اور انسان کی تخلیق سے نظم و ضبط اور اتحاد کو ختم کردینا۔ جو شخص نور کے لیے ایک خدا، ظلمت کے لیے ایک خدا، انسان کے لیے ایک خدا اور اونچے اور نچلے طبقے کے لیے الگ الگ خدا کا قائل ہے، وہ اس تخلیق کو چالیس الگ الگ ٹکڑے سمجھتا ہے۔ لیکن توحید کے مطابق، تخلیق، ایک متصل اور منظم یونٹ ہے۔ انسان، حیوان، پہاڑ، فلک، زمین اور تمام موجودات، یہ سب باہمی طور پر متصل اور مربوط ہیں، سب میں وحدت پائی جاتی ہے۔ ﴿إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَهٍ بِمَا خَلَقَ﴾ اگر کئی خدا اور معبود ہوتے، تو ہر الہ، ہر معبود، اپنی مخلوق اور اپنی پیدا کردہ اشیاء کو ایک جانب لے جاتا، ﴿وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ اور ان میں سے بعض خدا، دوسروں پر برتری حاصل کر لیتے، ﴿سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾ پاک و منزہ و مبرا ہے خدا ان باتوں سے جن سے اس کی توصیف بیان کرتے ہیں۔

اگلا حصہ سورہ بقرہ کی آیات ۲۱ اور ۲۲ سے ہے، ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ﴾ اے لوگو! اے انسانو! کن سے خطاب ہو رہا ہے؟ کسی اونچے یا نچلے طبقے سے خطاب نہیں ہو رہا۔ سیاہ فاموں یا سفید فاموں سے خطاب نہیں ہو رہا۔ انسانوں کے کسی ایک گروہ سے خطاب نہیں ہے، خطاب پوری انسانیت سے ہے۔ ہماری تاکید اس جملے پر ہے، ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ﴾ اے انسانو!، ﴿اُعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾ عبادت اور بندگی کرو اپنے پروردگار کی جو ایک ہے، ﴿الَّذِي خَلَقَكُمْ﴾ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، ﴿وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے، ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ شاید تم تقویٰ اختیار کرو، یعنی یہ عبادت، یہ بندگی، تقویٰ کا موجب ہے۔ ان چیزوں میں سے ایک جو تقویٰ کو، اس نیک اور خوشنما حالت کو (اور میں تشریح کر چکا ہوں کہ تقویٰ کیا ہے)، اس گناہ سے محفوظ رہنے کی حالت کو، روح کے اندر، انسان کے اندر پیدا کردیتی ہے، خدا کی بندگی ہے۔ لہٰذا ایک ایسے معاشرے میں، جس کے تمام لوگ خدا کے بندے ہیں اور معاشرہ خدا کی بندگی کی صورت میں ہے، اس معاشرے میں، جس قدر چاہو تقویٰ فراواں ہے۔ جس قدر تقویٰ چاہو،

فراواں، تقویٰ کا قحط نہیں ہوگا ہمارے دور کی طرح!

﴿الَّذِی جَعَلَ لَکُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا﴾ دیکھیے، ہر چیز ہر ایک کے لیے ہے۔ جس نے تمہارے لیے، تم لوگ یعنی کون؟ تمام انسان، سب کے سب۔ ﴿الْأَرْضَ فِرَاشًا﴾ زمین کو پھیلایا، ﴿وَالسَّمَاءَ بِنَاءً﴾ اور آسمان کو مضبوط ساخت کا بنایا، ﴿وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾ اور آسمان سے پانی برسایا، ﴿فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَکُمْ﴾ اس برسات کے ذریعے تمہارے رزق کے لیے پھلوں کو نکالا، کسی خاص طبقے کے لیے نہیں کہ تم ان کی جان کا صدقہ کھاؤ، نہیں، بلکہ سب کے لیے ہے۔ اب جب کہ ایسا ہے، ﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا﴾ تو دو خدا والے نہ بنو، دو خدا قرار دے کر، خدا کے لیے کسی رقیب اور شریک کو فرض کر کے، انسانوں کو دو، تین اور دس گروہوں میں تقسیم نہ کرو، سب ایک ہی گروہ ہیں، ﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ تم تو جانتے ہو، خدا کے لیے شریک اور رقیب فرض نہ کرو۔

اب سورۂ حجرات کی آیت نمبر ۱۳، یہ مشہور آیت جو زبان زد عام ہے، ﴿یَا أَیُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَأُنْثَىٰ﴾ اے انسانو! ایک بار پھر سب سے خطاب ہے، ہم نے تم کو پیدا کیا ایک مرد اور ایک عورت سے۔ تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے۔ وہی بات جو امیر المومنینؑ سے منسوب دیوان میں اس طرح بیان ہوئی ہے، وہ اسی آیت کا مضمون ہے:

النَّاسُ مِنْ جِهَةِ التِّمْثَالِ أَکْفَاءُ　　　أَبُوهُمُ آدَمُ وَالْأُمُّ حَوَّاءُ

«تمام انسانوں کو ایک جیسا خلق کیا گیا ہے، سب کے باپ آدمؑ اور ماں حوا ہیں۔»

سب یکساں اور برابر ہیں خلقت کی ابتدا اور بنیاد کے اعتبار سے، ﴿وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا﴾ گروہ گروہ ہونا اور قبیلہ قبیلہ ہونا، تعارف اور پہچان کے لیے ہے۔

﴿إِنَّ أَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاکُمْ﴾ طبقات کی نفی کے حوالے سے یہ اسلام کا ایک قطعی حکم ہے۔ خدا کے نزدیک تم میں سے زیادہ قابل احترام وہ ہے جو تقویٰ میں سب سے بہترین ہے۔ یعنی کسی ایک طبقے سے ہونا، کسی خاندان سے وابستہ ہونا، کسی سلسلے اور کسی گروہ سے وابستہ ہونا، ناقابل احترام ہونے کا سبب نہیں ہے۔

اور پھر اس سے بھی زیادہ باریک، دلچسپ اور دقیق نکتہ یہاں پر ہے، جو لوگ با تقویٰ ہیں، وہ دوسروں سے بالاتر ہیں، پھر بھی انہیں دوسروں سے زیادہ حقوق حاصل نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ با تقویٰ

لوگوں کو دوسروں سے زیادہ پیسہ ملے، ان کے کچھ حقوق زیادہ ہوں، یا اجتماعی حقوق میں ان کا حصہ زیادہ یا بہتر ہو، نہیں، ہر گز نہیں، ایسا نہیں ہے، بلکہ ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ﴾ خدا کے نزدیک زیادہ عزت والے ہیں۔ البتہ تقویٰ بعض اجتماعی اثرات کا بھی ایک حد تک سبب ہوتا ہے، لیکن زیادہ نہیں، بعض کام اور عہدے ایسے ہیں جن کے لیے باتقویٰ ہونے کی شرط ہے، صرف اسی حد تک، ﴿إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ بے شک خدا جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

اگلا حصہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۰ سے ہے۔ ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ بے شک ہم نے بنی آدم کو کرامت دی، ﴿وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ انہیں خشکی اور دریا میں اٹھایا، منتقل کیا، ان کے سفر کا وسیلہ فراہم کیا، (یہ ﴿وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ ضمنی طور پر شاید اشارہ ہو انسانوں کے درمیان موجود روابط کی جانب، کہ اگر انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ پر نہ جا سکتا، یہ امکان، یہ خصوصیت ان کے اندر نہ ہوتی، ایک انسانی معاشرے کے اندر، تو ممکنہ طور پر بنابر فرض تفرقہ وجود میں آجاتا) ﴿وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ﴾ اور انہیں پاکیزہ چیزیں عطا کیں، ﴿وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلاً﴾ اور انہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی۔ کن لوگوں کو؟ کن کی بات ہو رہی ہے؟ ہم نے کن لوگوں کو کرامت عطا کی؟ کن لوگوں کو ہم نے پاکیزہ چیزوں سے روزی دی؟ اور کن لوگوں کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی؟ انسانوں کو، نہ کہ کسی طبقے یا گروہ کو۔

تیرہویں نشست

توحید کے نفسیاتی اور روحانی اثرات

۱۴ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری ۱-۱۰-۱۹۷۴

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ (سورہ آل عمران/۱۷۲-۱۷۳)

معاشرے کے اندر توحید کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اور جو شکل انسانی معاشرے اور توحیدی معاشرے کو یہ توحید عطا کرتی ہے، اس کے حوالے سے کچھ گفتگو ہوئی۔ البتہ اس حوالے سے کچھ دوسری بحثیں بھی ہیں، لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر اس بحث کو جاری رکھنے سے گریز کیا گیا۔ ان میں سے اہم ترین پہلو یہ ہے کہ مثلاً توحید اور نظریۂ توحید کے توحیدی معاشرے کے مالی امور پر اثرات کیا ہیں؟ جو کہ توحیدی قرارداد کا ایک اہم نکتہ ہے۔

آج اگرچہ ہمارا موضوع توحید ہے، لیکن ایک ایسی بحث ہے جو ہماری ابتدائی بحثوں سے تناسب رکھتی ہے جو ہم نے ایمان، ایمان کے اثرات اور وہ خوش خبریاں جو مومنین کو دی گئی ہیں، اس حوالے سے بحث کی ہے۔

توحید پر عقیدہ ایک ایمان ہے۔ ایسا ایمان ہے جو ایک باشعور موَحِّد کے لیے شعور و آگہی کے ساتھ ہے، ایسا ایمان ہے جو عمل پر ابھارتا اور ذمہ داری پیدا کرتا ہے۔ جو ذمہ داری عقیدۂ توحید ایک موَحِّد پر ڈالتا ہے، یہ ذمہ داری ان ذمہ داریوں میں سب سے بڑی، سب سے زیادہ بھاری اور سب سے زیادہ مؤثر شمار ہوتی ہے جو دوسرے اسلامی اور دینی عقائد سے مومن پر عائد ہوتی ہیں۔ درحقیقت ایک موَحِّد کی

جانب سے توحید کی ذمہ داری کا خلاصہ ایک توحیدی دنیا تعمیر کرنا ہے؛ موحد کی نظر میں اور موحد کے لیے توحید کی ذمہ داری، شرک کے تمام اثرات کو مٹانا ہے؛ یہ ہیں توحید کی ذمہ داریاں۔

میں یہاں پر ان دوستوں اور برادران کے لیے جو عربی زبان سے کسی حد تک واقف ہیں، ایک بات کی یاددہانی کرادوں۔ لفظ توحید بابِ تفعیل سے ہے۔ آپ کسی بھی دینی طالب علم سے پوچھ لیجئے کہ توحید کا کیا مطلب ہے، اس کے لغوی معنی کیا ہیں، وہ کہے گا کہ ایک کرنا، واحد کرنا، واحد بنانا۔ کیا مطلب؟ یعنی متعدد خداؤں کو ایک خدا کی صورت میں لے کر آنا، غیر توحیدی معاشرے کو توحیدی بنانا، مشرک ذہن اور مشرک دل کو موحّدِ ذہن اور موحّدِ دل بنا دینا۔

پس توحید پر اعتقاد، اتنا بڑا اور عظیم ایمان ہے اور اتنا بھاری، قطعی اور واضح طور پر معین شدہ عہد و پیمان ہے، ایسا عہد و پیمان کہ آپ کسی بھی دوسرے اسلامی یا دوسرے کسی مذہب کے عقیدے یا کسی بھی غیر اسلامی اجتماعی عقیدے کو مدِّنظر رکھ لیں، اس کا عہد و پیمان اتنا سنگین اور عظیم نہیں ہے۔

معاشرے سے غربت کو دور کرنا، مثلاً ایک ذمہ داری ہے یا ہر معاشرے کے اندر دولت کی تقسیم کو متوازن کرنا، ایک ذمہ داری ہے کہ ممکن ہے کوئی اور مکتب بھی یہ ذمہ داری لیتا ہو۔ جنگ کو ختم کردینا ایک ذمہ داری ہے کہ ممکن ہے کسی اور مکتب نے بھی یہ ذمہ داری اپنے اوپر لی ہو اور کچھ لوگ اس مکتب کی جانب رجحان پا کر، اس ذمہ داری کو اپنے اندر منتقل کرلیں۔ یہ سب درست، لیکن توحید اپنے صحیح معنی میں، اپنے اسلامی معنی میں، نہ کہ خرافاتی اور کاہلی و سستی آمیز معنی میں، اپنے درست اور صحیح معنی میں، اگر ہم توحید کو مدِنظر رکھیں، خدا کو ایک کرنا، الٰہی معاشرہ، الٰہی قانون، الٰہی نظام وجود میں لانا، توحید ان تمام ذمہ داریوں پر مشتمل ہے جن کا میں نے ذکر کیا کہ ممکن ہے اس کے علاوہ دوسری ذمہ داریاں فلاں مکتب اور فلاں مذہب میں ہوں۔ دیکھ لیجئے کہ توحید کی ذمہ داری بہت بھاری ہے۔

اگر توحیدی ایمان کا یہ مطلب ہے اور ایک صحیح اور واقعی ایمان ہے، تو اس کا حق ہے کہ ہم جائزہ لیں، دیکھیں کہ اس ایمان کی تاثیر، عمل پر ابھارنے والے اس عقیدے کی تاثیر، اعتقاد رکھنے والے کی نفسیات پر کیا ہوگی اور کیا ہونی چاہئے۔ یہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے۔

اس بحث کا فائدہ دو چیزیں ہیں، ایک یہ کہ ہم توحید سے کچھ زیادہ واقف ہو جائیں گے۔ سمجھ لیں گے

کہ توحید کس روحانی اور نفسیاتی تعلیم کے معنی میں ہے۔ اگر توحید سے کبھی کسی نے سست اور کاہل بنانے والے معنی نکالے تو ہم کہیں گے کہ جناب یہ غلط ہے، توحید کے اثرات، جو تم کہہ رہے ہو، وہ نہیں ہیں، جو میں کہہ رہا ہوں، وہ ہیں۔ پس توحید کو پہچانیں گے، یہ پہلا فائدہ ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو پہچانیں گے کہ موَحّدِ ہیں یا موَحّدِ نہیں ہیں۔ اپنے دل کے اندر توحید کو پہچاننے کے لیے یہ ایک کسوٹی ہے۔

توحید کے نفسیاتی اثرات کا خلاصہ چند جملوں میں ہو سکتا ہے، موَحّدِ انسان کی روح پر توحید کی جانب سے جو اثرات ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے، اس کی نگاہ (vision) وسیع ہو جاتی ہے۔ موَحّدِ انسان تنگ نظری، کوتاہ بینی، نزدیک بینی، جلد بازی اور ناعاقبت اندیشی سے محفوظ رہتا ہے۔ موحد انسان یہ نہیں کہتا کہ میں نے اس میدان میں شکست کھائی یا ہم اور ہمارے حلیفوں نے اس محاذ پر پسپائی اختیار کی اور معاملہ ہمارے نقصان میں رہا۔ وہ اتنا جلدباز اور ناعاقبت اندیش نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ توحیدی فکر کی حدود کا دائرہ انسانیت کی عمر کے برابر ہے، انسانیت کی عمر، انسانیت کی عمر کو معیار قرار دیا جائے تو دس سال، بیس سال، پچاس سال اور سو سال، ایک لمحے اور ایک منٹ سے زیادہ نہیں ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اور دوسرے اعتبار سے، موَحّدِ انسان کا ویژن مادی مسائل اور پست و حقیر ضروریات تک محدود نہیں ہوتا ہے، اسی پر توقف نہیں کرتا ہے۔ موَحّدِ انسان جب نظر ڈالتا ہے تو اپنے سامنے مادی ضروریات کے ساتھ ہی دسیوں اور سینکڑوں گنا زیادہ عظیم اور زیادہ عزیز انسانی ضروریات کو دیکھتا ہے۔ اس کا پورا ذہن، پوری فکر اور تمام حواس پست، حقیر اور معمولی ضروریات تک محدود نہیں ہوتے، جیسا کہ باطن میں مادی، اگرچہ ظاہر میں الٰہی اور معنوی لوگوں نے اپنے آپ کو ان ضروریات کے اندر مقید اور پابند کرلیا ہے۔ موَحّدِ انسان جب نظر ڈالتا ہے تو اسے تاحد نگاہ دور تک پھیلا ہوا وسیع مستقبل نظر آتا ہے۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ کسی دن عرض کیا تھا، موَحّدِ دنیا کو آخر نہیں سمجھتا۔ کیونکہ وہ دنیا کے آخر کو آخرت سے متصل دیکھتا ہے۔ موت کو زندگی کی آخری دیوار نہیں سمجھتا، اسے راستے کا اختتام فرض نہیں کرتا، بلکہ ایک کھڑکی، ایک راستہ اور ایک پل سمجھتا ہے ایک وسیع دنیا کے لیے۔ یہ توحید کی خصوصیت ہے۔

ایک غیر موَحّدِ انسان کے لیے، اگرچہ وہ کتنا ہی بےلوث کیوں نہ ہو، عظیم اور انسانی نظریات کی طرف

کتنا ہی مجذوب کیوں نہ ہو، موت کے وقت اس کے نزدیک ہر چیز کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جب کہ موَحّدِ انسان کے لیے، موت کا وقت ایک وسیع تر زندگی، ایک زیادہ دلچسپ اور زیادہ خوشنما ماحول کا آغاز ہے۔ ایک مادی انسان اگر بہت ہی زیادہ فداکار شخص ہو، تو وہ تیار ہوتا ہے اپنے آپ کو ایک ایسی جگہ پر اور ایسے مقام پر قرار دینے کے لیے جو اس کی نظر میں عدم اور نابودی ہے۔ لیکن ایک موَحّدِ انسان، اگر بہت زیادہ فداکار ہوگا تو ایک پروانے کی طرح، ایک شمع کی مانند، خودسوزی اور اپنے ذاتی مفادات کو مدِ نظر نہ رکھنے کے علاوہ، اس سے کوئی اور توقع نہیں ہوتی۔ اگر وہ اتنا فداکار نہ ہو، اس قدر قربانی نہ دینا چاہے، پھر بھی اس کے لیے ایک ایسے مقام پر خود کو قرار دینا، جسے مادی انسان نابودی سمجھتا تھا، زیادہ آسان ہے، کیونکہ وہ اسے نابودی نہیں سمجھتا، وہ اس جگہ کو وسیع انسانی زندگانی کا ایک دوسرا ماحول، ایک دوسرا مقام، اور دوسرا علاقہ سمجھتا اور جانتا ہے۔

موَحّدِ کی نفسیات پر توحید کے اثرات میں سے ایک اور اثر یہ ہے کہ یہ اس کے اندر سے خوف کی جڑوں کو نکال پھینکتا ہے، اور یہ بہت اہم بات ہے۔ قرآن مجید کے اندر چند موارد میں (جن میں سے چند مورد آج آیات کی صورت میں آپ کی سماعتوں تک پہنچیں گے اور مورد تدبر قرار پائیں گے) مومنین سے خطاب ہوتا ہے کہ ﴿فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾[1] دوسروں سے خوف کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو، مجھ سے ڈرو اور جو خدا سے ڈرے وہ کسی اور سے نہیں ڈرتا۔ جو شخص موَحّدِ ہو، جو شخص خدا کی طاقت پر ایمان رکھتا ہو، اس کے اندر سے خوف ختم ہو جاتا ہے۔ اور جب میں دیکھتا ہوں، تأمل کرتا ہوں، محاسبہ کرتا ہوں، تو دیکھتا ہوں کہ یہ خوف و ہراس ہے جو خوف و ہراس رکھنے والوں سے دنیا و آخرت کو چھین لیتا ہے۔ غربت کا خوف سبب بنتا ہے کہ انسان انفاق (راہِ خدا میں خرچ) نہ کرے، پریشانیوں کا شکار ہونے کا خوف سبب بنتا ہے کہ انسان ظلم و ستم اور ذلت و خواری میں پڑ جائے۔ اس بات کا خوف کہ انسان دو دن مزید اس دنیا میں زندگی نہ گزار سکے اور وہ بھی کیسی زندگی! کسی انداز کی زندگی! اسی پست زندگی سے ہاتھ دھونے کا خوف کہ جس کے بارے میں یہ بھی معلوم ہے کہ دو دن ہوگی، تین دن ہوگی، کوئی باقاعدہ تحریر تو نہیں دی گئی ہے کہ فلاں سال تک، فلاں تاریخ تک تم زندہ رہوگے، اس قسم کی بےاعتبار زندگی سے ہاتھ دھونے کا خوف، سبب بنتا ہے کہ انسان زندگیوں کا خاتمہ

---

۱. سورہ مبارکہ آل عمران: آیت ۱۷۵

کردے، اجتماعی زندگی کو تلخ کردے یا برباد کردے۔ لالچ کا تعلق بھی خوف سے ہے اور خوف و ہراس انسانوں کی زندگی میں بدبختیوں اور پریشانیوں کی جڑ ہے۔ آپ طویل تاریخ پر نظر ڈالیں تاکہ دیکھیں کہ کونسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے حق کے طرفدار اقلیت میں رہ گئے، جہاں پر اقلیت میں رہے۔ کونسی چیز موجب بنی کہ مسلمان سچے اسلام کی طرف، اس سوغات کی طرف جو خدا نے انہیں مفت میں دی تھی اور ان تک پہنچائی تھی (دوسری نسل کو مفت میں ملی تھی، پہلی نسل نے قربانیاں دی تھیں) یہ سوغات جو مفت میں انہیں ملی تھی، کونسی چیز سبب بنی کہ وہ اس کی حفاظت نہ کرسکیں؟ سوائے خوف کے؟

کون یزید بن معاویہ کو نہیں پہچانتا تھا؟

کون عبدالملک بن مروان سے واقف نہیں تھا؟

بنوامیہ کے خاندان کو کون تھا جو جانتا نہ ہو، پہچانتا نہ ہو، آزمایا نہ ہو، تجربہ نہ کیا ہو؟

قرآن کے کلام کو، رسولؐ اور تاریخی حقائق کو جو ان کی مذمت کرتے تھے، ان کو سمجھ نہ سکا ہو، محسوس نہ کرسکا ہو؟ سب جانتے تھے۔ لیکن خوف زدہ تھے؟ یہ جو وہ لوگ تسلیم ہو جایا کرتے تھے، ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے، ان کے مزدور اور ایجنٹ بن جایا کرتے تھے اور اس مزدوری میں مگن تھے، ان کے اشاروں پر خوشی سے رقص بھی کرتے تھے۔ ان سب کا سبب خوف کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ اور یہ خوف، لوگوں کے نچلے طبقے سے لے کر اونچے طبقے تک، ان مشہور لوگوں تک بھی جن سے لوگوں کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں، سب پر طاری تھا۔

عبداللہ بن عمر وہ شخص ہے جس نے جناب عثمان کے قتل ہوجانے کے بعد امیرالمومنینؑ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ کیوں بیعت نہیں کی؟ کہنے لگا کہ میرے لیے معاملات واضح نہیں ہیں۔ احتیاط کی، علیؑ کے ہاتھ پر بیعت نہ کی۔ دین کے معاملے میں کمالِ احتیاط کی خاطر امیرالمومنینؑ کے ہاتھ پر بیعت نہ کی۔ کیونکہ وہ زندگی پر اثر ڈالنے والے اس اہم اسلامی اصول پر، کہ یہ نہ دیکھنا کہ دوسرے کیا کہہ رہے ہیں، جہالت یا ذاتی اغراض کی پابند اکثریت کی اعتنا نہ کرنا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، کیونکہ یہ اصول اس کے اختیار میں نہیں تھا، اس کے ہاتھ میں نہیں تھا، اس پر عمل نہیں کرتا تھا، اس نے امیرالمومنینؑ سے کنارہ کشی کرلی، از روئے احتیاط بیعت نہیں کی۔

امیر المومنینؑ کی شہادت کے کئی برس بعد بنوامیہ کا ظالم جلاد حجاج بن یوسف ثقفی، عبدالملک کی جانب سے مکہ کو فتح کرنے کے لیے آیا، جہاں عبداللہ بن زبیر کی حکومت تھی۔ عبداللہ بن زبیر سختی سے ڈٹا ہوا تھا اور عبدالملک بن مروان کے شام سے آئے ہوئے لشکر کے مقابلے میں شدید جنگ میں مصروف تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس شورش کو اب ختم ہونا چاہیے۔ حجاج بن یوسف کو جو تمام لوگوں سے بڑھ کر جلاد صفت انسان تھا، اسے بھیج دیا۔ وہ آیا اور مکہ کے اطراف کے پہاڑوں کے اوپر اس نے منجنیقیں لگائیں اور خدا کے گھر پر پتھر پھینکنے لگا۔ بڑی تعداد کو قتل کر دیا، پھر عبداللہ بن زبیر کو بھی قتل کر دیا اور اس کی لاش کو سولی پر چڑھا دیا۔

حجاج بن یوسف خیمے میں بیٹھا ہوا مرکز خلافت، شام کے لیے فتح کی رپورٹ لکھ رہا تھا۔ عبداللہ بن عمر بھی اہل مکہ میں شامل تھا۔ لوگوں نے جوق در جوق حجاج بن یوسف کے پاس آنا اور بیعت کرنا شروع کی۔ ایسا نہیں تھا کہ لوگ حجاج کو پہچانتے نہیں تھے، پہچانتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ حجاج کیسا پست اور ذلیل انسان ہے اور کیسے پست تر اور ذلیل تر انسان کا یہاں پر نمائندہ ہے۔ ان باتوں کو جانتے تھے، لیکن چونکہ وہ فاتح تھا، چونکہ طاقت اس کے پاس تھی، چونکہ اگر لوگ اس کی بیعت نہ کرتے، تو وہ ان پر تلوار مسلط کر دیتا، خوف کی وجہ سے، جوق در جوق آتے تھے اور حجاج بن یوسف کی بیعت کر لیتے تھے۔

عبداللہ بن عمر ہزاروں دوسرے لوگوں کے درمیان حجاج کے خیمے کے پاس آیا جس نے شہر سے باہر پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ حجاج سے جا کر کہا گیا کہ عبداللہ بن عمر آیا ہے۔ اس نے کہا کہ کہو اندر آجائے۔ یہ اندر آیا۔ حجاج اس کے لیے اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ کوئی عزت نہیں کی، کاغذ سے اپنا سر بھی نہیں اٹھایا کہ اس کی طرف دیکھے اور اس کو خوش آمدید کہے۔

[عبداللہ بن عمر] کہنے لگا: امیر! اپنا ہاتھ دو، تم سے بیعت کرلوں۔

کون کہہ رہا ہے؟ عبداللہ بن عمر۔

کس سے؟ حجاج سے۔

وہ عبداللہ بن عمر جس نے حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے نہیں کہا کہ اپنا ہاتھ دو میں بیعت کرلوں، وہاں پر احتیاط سے کام لیا، دین میں احتیاط، حجاج سے کہہ رہا ہے کہ اے امیر، اپنا ہاتھ دو، میں تمہارے

ہاتھ پر بیعت کرلوں۔

حجاج نے اس کے جواب میں کیا کہا؟

حجاج نے کہا، میرا ہاتھ لکھنے میں مصروف ہے، میرے پیر پر بیعت کرلو۔ اس نے اپنا پیر پھیلایا اور کہا کہ میرے پیر پر بیعت کر لو۔ اس نے بھی حجاج بن یوسف کے پیر پر بیعت کرلی۔ ایک ذلیل اور پست انسان کے دو دن زیادہ زندگی گزارنے کے لیے، وہ بھی ایسی بری زندگی، ایسی زندگی کہ جس میں نہ دنیا کی لذت ہو نہ آخرت کی، ایسی زندگی کہ جس میں صرف چند کلو حرام غذا کھانا ہو اور بس، ایسی زندگی جو انسان کو خدا سے نزدیک نہیں کرتی بلکہ شیطان سے نزدیک کرتی ہے۔ ایسی دو دن کی زندگی کے لیے، انسان آئے اور حجاج کے ساتھ اور حجاج کے پیر پر بیعت کرلے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ اس کی بنیاد خوف کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔

لہٰذا اہل بیت علیہم السلام کی روایات میں اور ان دعاؤں میں مخصوصاً جو ماہ رمضان میں وارد ہوئی ہیں (اور میں سب کو پُر زور تاکید کرتا ہوں دعاؤں کو پڑھنے اور آئمہ سے روایت ہونے والی دعاؤں کی طرف توجہ دینے کی) ان دعاؤں میں یہ مطالب، نفسیاتی مطالب و مفاہیم، وہ باتیں جو انسان کی روح سے متعلق ہیں، ان پر بہت زیادہ توجہ اور دقّت کی گئی ہے اور خصوصی تاکید کی گئی ہے۔ امام سجادؑ ایک دعا میں فرماتے ہیں:«اللهُمَّ عَمِّرْنِي مَا كَانَ عُمُرِي بِذْلَةً فِي طَاعَتِكَ»[1] خدایا مجھے عمر دے، زندگی دے، لیکن میں بطور مطلق نہیں چاہتا، سو سال، ایک سو بیس سال کی بیہودہ عمر دراز نہیں چاہتا، «مَا كَانَ عُمُرِي بِذْلَةً فِي طَاعَتِكَ» اس وقت تک جب تک میری عمر بے دریغ تیری اطاعت کی راہ میں اور تیری بندگی کی راہ میں ہے، مجھے عمر دے۔ ایسی عمرِ دراز جو تیری بندگی کو اور طویل کردے، ایسی زندگی چاہتا ہوں۔ ایسی طویل عمر جو کام میں اور عمل میں صرف ہو، میں وہ چاہتا ہوں۔ بےفائدہ اور بےکار عمرِ دراز نہیں چاہتا۔

«اللهُمَّ عَمِّرْنِي مَا كَانَ عُمُرِي بِذْلَةً فِي طَاعَتِكَ، فَإِذَا كَانَ عُمُرِي مَرْتَعاً لِلشَّيْطَانِ فَاقْبِضْنِي إِلَيْكَ» خدایا جب بھی تو دیکھے کہ میری عمر شیطان کی چراگاہ ہے جب بھی تو دیکھے کہ میری عمر وسیلہ بن گئی کہ شیطان مجھے استعمال کرے، جب دیکھے کہ میری عمر تیرے مخالف محاذ کے لیے قابلِ استفادہ بن گئی ہے، وہ مجھ سے پروپیگنڈے کے لیے استعمال کر رہے ہیں، انہوں نے مجھے اپنا ایک حربہ اور آلۂ کار بنایا ہوا ہے، وہ

---

۱. صحیفہ سجادیہ، دعاء مکارم الاخلاق

میری جہالت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، میرے غرور سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، میرے تکبر سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، جب بھی تو دیکھے کہ میں ایک وسیلہ بن گیا ہوں برے لوگوں کی آرزوؤں کی برآوری اور اچھے اور نیک لوگوں کی ناکامی کے لیے، جب بھی تو دیکھے کہ میں عملی طور پر، بغیر اس کے کہ خود مجھے بھی معلوم ہو، شیطان کا بندہ بن گیا ہوں، شیطان کی چراگاہ ہوگیا ہوں «فَاقْبِضْنِي إِلَيْكَ» مجھے اپنی طرف بلالے، مجھے ایسی عمر نہیں چاہیے، یہ دعا ہے۔

آپ کو خدا کا واسطہ، جو انسان اپنی روح سے یہ کلام ادا کر رہا ہو، سچے دل سے اس کلام کو کہہ رہا ہو، یہ بات معانی پر توجہ کے ساتھ کہہ رہا ہو، وہ اپنی زندگی میں کیسی حالت پیدا کر لے گا؟ یہ ایک دعا ہے۔ ہمیں آئمہ ہدیٰ علیہم السلام اس طرح سے سکھاتے ہیں کہ جو زندگیاں دشمنانِ خدا کے استفادے کا وسیلہ بن جائیں، موت ان زندگیوں سے بہت بہتر ہے۔

بہر صورت، قرآن کریم کی یہ فصل کہ جس کا آج انتخاب کیا ہے آپ کے سامنے پڑھنے کے لئے، سورہ آلِ عمران کی ۱۷۲ویں آیت: ﴿الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ البتہ آیت کے مقدمات طویل ہیں، جس حصے کا میں نے انتخاب کیا ہے، اس کی دو تین آیتیں میرے مدِ نظر ہیں۔ بات کو آپ کے سامنے واضح کرنے کے لیے، اس سے پہلے دو تین آیتیں بھی پڑھ لیتا ہوں۔ ﴿الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ﴾ جن لوگوں نے لبیک کہا خدا اور رسول کو۔ لبیک کہا یعنی کیا مطلب؟ یعنی پیغمبر کی دعوت کو اور الٰہی دعوت کو انہوں نے قبول کیا، فعال قبولیت، صرف دل میں نہ کہیں کہ جی، ہم نے آپ کی باتوں کو قبول کر لیا، نہیں، بلکہ خدا کے رسولؐ کے پیچھے چل پڑیں۔ اور یہ کب تھا؟ سخت ترین اور دشوارترین حالات میں انہوں نے خدا اور رسول خداؐ کی دعوت کو قبول کیا۔ اور دشوارترین حالات کب تھے؟ اس وقت جب وہ میدان جنگ میں زخمی ہوگئے تھے، ﴿مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ اس کے بعد کہ جب انہیں قرح (زخم) لگے تھے۔ ﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ جن لوگوں نے نیکی اور نیکوکاری انجام دی اور تقویٰ اختیار کیا، اس لبیک کہنے والے گروہ میں سے، ان کے لیے بڑا اجر، عظیم اجر رکھا گیا ہے۔

یہ آیت جنگ اُحد سے متعلق ہے، آپ جانتے ہیں کہ جنگ احد میں کچھ لوگ بھاگ گئے تھے اور اللہ کے رسولؐ انہیں آواز دے رہے تھے، کچھ لوگ ڈر رہے تھے، نہیں آئے اور کچھ لوگ زخمی ہونے

کے باوجود آگئے۔ امیر المومنینؑ نے اس دن اکھتر (۷۱) زخم کھائے۔ اکھتر یا شاید کم یا زیادہ، اس وقت درست طور پر مجھے یاد نہیں، بہت زخم کھائے اور اسی طرح سے اصحاب رسولؐ میں سے کچھ دوسرے لوگوں نے بھی کچھ کمتر۔ کچھ لوگوں نے لبیک کہا اور خدا اور رسولؐ کی دعوت کو قبول کیا اور کچھ لوگوں نے قبول نہیں کیا اور بھاگ گئے۔ یہ آیت، ان لوگوں کے اجر و پاداش کا ذکر کر رہی ہے، جنھوں نے قبول کیا اور لبیک کہا۔ ﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ﴾[1] توجہ کیجئے گا ان آیات کے کلی پہلوؤں پر، ہم اپنے آپ کو جنگ احد کے میدان میں مقید نہ کرلیں، صدر اسلام کے واقعات میں اور جو کچھ نزول آیات کا موجب ہوتا تھا، ان میں قرآنی اصولوں کو محصور، متوقف اور منحصر نہ کریں۔ جو چیز ہمارے لیے اہمیت کی حامل ہے، وہ آیت میں بیان کردہ اصول ہے۔ آیت کیا کہنا چاہتی ہے؟

اور یہ قرآن کا ایک نکتہ ہے جسے شاید میں نے کسی مناسبت سے ذکر کیا ہو۔ کبھی کسی واقعے کے ضمن میں، کوئی ایک جملہ بول کر، جس کا تعلق اس واقعے سے ہوتا ہے، اسلام کا ایک کلی اصول بیان کر دیا جاتا ہے۔اب ان آیات پر توجہ کیجئے۔

﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ﴾ یہ ہمارا اجر لینے والے لوگ، یہ ہیں وہ لوگ جن سے بعض لوگوں نے کہا۔ کیا کہا؟ کہا: ﴿إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ﴾ ان سے کہا کہ لوگ تمہارے خلاف جمع ہوگئے ہیں، سازش کر رہے ہیں، تعاون کر رہے ہیں، تمہیں نابود کردینا چاہتے ہیں، ان سے ڈرو۔ یہ باتیں خیر خواہ اور مصلحت پسند لوگوں نے ان مومنوں سے کہیں۔ وہ مومن کہ جس کے اجر و پاداش کو ہم نے گزشتہ آیت میں بیان کیا، اس قسم کے مومن ہیں کہ جب خیرخواہوں اور مصلحت پسندوں نے ان سے یہ کہا، تو انہوں نے جواب میں کیا کہا؟ ﴿فَزَادَهُمْ إِيمَانًا﴾ اولاً تو یہ کہ ان کا ایمان اس بات سے اور بڑھ گیا۔ دشمن کی سازش سے مومن کا ایمان مزید بڑھ جائے، بہت دلچسپ ہے۔ اولاً ان کا ایمان بڑھ گیا، پھر کیا کہا؟ ﴿وَقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ کہا: خدا ہمارے لیے کافی ہے، اور خدا بہترین کارساز ہے۔ وہ بہترین ذات ہے جسے انسان اپنا کام سونپ سکتا ہے۔

﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ خدا ہمارے لیے کافی ہے۔ کیا مطلب، خدا ہمارے لیے کافی ہے؟ خدا ہمارے لیے کافی ہے، یہ کئی معنی میں ہے اور سب درست ہیں۔ خدا ہمارے لیے کافی ہے اور اپنی

---

۱. سورہ مبارکہ آل عمران: آیات ۱۷۳ سے ۱۷۶

نصرت سے ہماری مدد کرتا ہے۔ خدا ہمارے لیے کافی ہے، طبیعت (nature) کی طاقتوں کو ہماری ہی سمت میں راستے پر لگا دیتا ہے۔ خدا ہمارے لیے کافی ہے، یعنی خواہ ہم دنیا میں کامیاب نہ ہوں، خدا ہم سے راضی ہو، یہی ہمارے لیے کافی ہے۔

﴿فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللهِ وَفَضْلٍ لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ﴾ پس لوٹ گئے وہ خدا کی جانب سے نعمت اور فضل و زیادتی کے ساتھ ﴿لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ﴾ کوئی بدی بھی انہیں نہیں پہنچی ﴿وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللهِ﴾ وہ خدا کی خوشنودی کے پیچھے چلے ﴿وَاللهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ﴾ اور خدا بڑے فضل والا ہے۔ یہی لوگ کہ خدا کی نعمت ان کا مقام قرار پائی، کوئی بدی، پریشانی اور گزند انہیں نہیں پہنچا اور خوش اور مسرور بھی ہوئے۔ کس طرح سے خوش اور مسرور ہوئے؟

قرآن یہ نہیں بتاتا کہ ان کا کیا ہوا، کوئی فرق نہیں پڑتا، کچھ بھی ہوا ہو، یا اس میدان جنگ میں شہید ہوئے ہوں یا صحیح و سالم و آزاد اپنے گھر لوٹ گئے ہوں، شہر مدینہ لوٹ گئے ہوں، برابر ہے۔ اگر اپنے گھر بار کی طرف لوٹ گئے، فتح و ظفر کے ساتھ لوٹ کے آئے، تو انہیں کوئی تکلیف بھی نہیں پہنچی، کیونکہ میدانِ جنگ کے زخم، خاندان کے پُر حرارت ماحول میں اور فتح و ظفر کی خوشی میں جلدی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

﴿فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللهِ وَفَضْلٍ﴾ اور اگر میدانِ جنگ میں خاک و خون میں غلطاں اور شہید ہو گئے ہوں، تو یہاں تو اور بھی زیادہ ﴿فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللهِ وَفَضْلٍ﴾ لوٹ گئے نعمت خدا کی طرف، لازوال نعمت، بے انتہا فضل و کرم، ایسا فضل جس میں کوئی برائی نہیں ہے، ایسا سکون جس میں بے سکونی اور بے اطمینانی کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ ﴿فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللهِ وَفَضْلٍ لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ﴾ کوئی برائی انہیں نہیں پہنچی۔

﴿إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ﴾ یہ آیت آپ کو یاد رہے، اسے حافظے میں رکھ لیجئے، خوب پڑھیے، سمجھ لیجئے۔ ﴿إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ﴾ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کہنے والے، شیطان ہیں۔ شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے، کہتا ہے جناب، آپ کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں، چالیں چلی جا رہی ہیں، دشمنوں نے لشکر جمع کیا ہوا ہے، منافقین کفارِ قریش کے ساتھ مل گئے ہیں، منافقین نے اپنے لباس کے نیچے تلواریں چھپا رکھی ہیں، آپ کو مارنا چاہتے ہیں، آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں، یہ

کرنا چاہتے ہیں، وہ کرنا چاہتے ہیں۔ جو تمہیں ڈرا رہا ہے، وہ شیطان ہے۔ ﴿إِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ﴾ دشمنِ خدا سے تمہیں ڈرانے والا شیطان ہے اور شیطان ڈراتا ہے۔ لیکن تم کیا؟ کیا تم شیطان کے کہنے سے ڈر جاؤ گے؟ خوف زدہ ہو جاؤ گے؟

اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ تم کون ہو۔ وہ اپنے دوستوں کو خوف زدہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگر تم اس کے دوست ہوئے تو خوف زدہ ہو جاؤ گے، اگر دوست نہ ہوئے، تو نہیں ڈرو گے۔ دیکھ لیجئے کتنی مختصر آیت ہے لیکن ضمنی طور پر کس قدر پُرمغز و پُرمعنی ہے۔ ﴿إِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ﴾ بےشک یہ شیطان ہے:﴿يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ﴾ جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے، ﴿فَلَا تَخَافُوهُمْ﴾ پس ان سے نہ ڈرو ﴿وَخَافُونِ﴾ اور مجھ سے ڈرو، میرے حکم کی اطاعت کرو، میرے عذاب اور انتقام سے ڈرو ﴿إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ اگر تم مومن ہو۔

﴿وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ﴾ اور آپ کفر میں تیزی کرنے والوں کی طرف سے رنجیدہ نہ ہوں، ﴿إِنَّهُمْ لَنْ يَضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا﴾ یہ خدا کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے ﴿يُرِيدُ اللّٰهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ﴾ خدا چاہتا ہے کہ ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہ رہ جائے ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ اور ان کیلئے عذابِ عظیم ہے۔ البتہ میں سمجھتا ہوں کہ شاید بعد والی آیات ہماری مورد نظر نہ ہوں۔ صرف یہی دو تین آیات تھیں کہ جن میں خدا اور شیطان سے ڈر اور خوف کا تذکرہ ہوا تھا۔

تیسرا باب

نبوت

چودھویں نشست

فلسفۂ نبوت

۱۵ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری — ۲-۱۰-۱۹۷۴

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿هُوَ الَّذِى بَعَثَ فِى الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِى ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۞ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (سورہ جمعہ/۲-۳)

نبوت کے حوالے سے چند ایک موضوعات ہمارے مدِ نظر ہیں، جنہیں آیاتِ قرآن کی روشنی میں واضح کیا جائے گا۔ البتہ برادران جانتے ہیں کہ نبوت تمام ادیان کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے، اسے اصولِ دین میں سے ایک اصل کہا جا سکتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر کہنا چاہیے۔ اگر اسے اصولِ دین میں سے ایک اصل کہا جا سکے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے اصل ہونے کا کوئی انکار کرے، نہیں؛ بلکہ اصل سے بڑھ کر اصولاً نبوت پر اعتقاد کے بغیر دین بالکل ہی بے معنی ہے۔ دین یعنی وہ پروگرام، وہ مسلک، وہ مکتب، وہ آئین جو خدائے متعال کے کسی پیغام لانے والے کے ذریعے سے آیا ہو؛ پس پیغام لانے والا اور خدا کی طرف سے آنا، یہ دین کے ذاتی عناصر میں سے ہے، دین کا دار و مدار ہی اس پر ہے۔

سب سے پہلی بات جس کا نبوت کی بحث میں ذکر کیا جائے گا، وہ فلسفۂ نبوت ہے۔ نبوت کیوں ضروری ہے؟ پروردگارِ عالَم کی جانب سے کوئی شخص انسان کی ہدایت کے لیے کمر ہمت کیوں باندھے؟ کیا انسان خود یہ کام نہیں کر سکتا؟ کیا انسانی علم اور انسانی فکر کافی نہیں ہے؟ پیغمبر کی کیا ضرورت ہے؟ غیب و شہود کے درمیان کسی پیغام لانے والے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ایک ایسی بات ہے جسے جاننا چاہیے۔ اگر

فلسفۂ نبوت کا علم نہ ہو، تو نبوت کے بارے میں جو دوسری بحثیں ہیں، تقریباً وہ سب بے بنیاد بحثوں کا ایک سلسلہ ہو گا۔

فلسفۂ نبوت کے بارے میں بہت زیادہ گفتگو نہیں کریں گے، ایک جملہ اور وہ جملہ یہ ہے کہ انسان کے حواس، انسان کی فطرت و طبیعت اور انسان کی عقل، انسان کی رہنمائی اور اس کی دستگیری کے لیے کم ہے۔ عام طور پر زیادہ تر حیوانات اپنی ہدایت کے لیے اپنی جبلت (instinct) سے مدد لیتے ہیں، یعنی شہد کی مکھی کی جبلت اس سے کہتی ہے کہ جاؤ پھول پر بیٹھو، خوشبودار پھول پر اور اس کا عطر اور اس کا جوہر چوسو، اس کے بعد گھر اور چھتے میں چلی جاؤ، گھر کو چھ کونوں والا اور مسدّس کی شکل میں بناؤ اور وہاں پر ایک خاص ترتیب کے ساتھ داخل اور خارج ہو، اور ملکہ، مزدور، سپاہی اور خلاصہ یہ کہ شہد کی مکھی کا ایک مخصوص تمدن جاری رکھو۔

﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ﴾[1] یہ شہد کی مکھی کے لیے وحی الٰہی ہے۔ شہد کی مکھی کے لیے وحی الٰہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شہد کی مکھی بیٹھ جاتی ہے، جبرئیل اس پر نازل ہوتے ہیں بلکہ شہد کی مکھی کی تخلیق ہی ایسی ہے، شہد کی مکھی کی جبلت ہی ایسی ہے۔

انسان بھی فطرت و جبلت سے استفادہ کرتا ہے، لیکن کم۔ جب پہلی بار آپ دنیا میں آئے تھے، تو بلاتشبیہ آپ کا حکم وہی تھا جو کسی جانور کا ہوتا ہے۔ جبلت سے، فطرت اور طبیعت کی کشش سے آپ اپنی ماں کے سینے میں اپنی خوراک کا مخزن ڈھونڈ پائے تھے اور جب وہ آپ کے منہ میں دیا تو اسے چوس پائے تھے۔ کسی نے آپ کو چوسنا سکھایا نہیں تھا، کسی جگہ پر اس کا عملی، سمعی و بصری طریقہ سیکھا نہیں تھا، یہ آپ کی فطرت تھی۔ جس قدر آپ بچپن کے مرحلے سے نکلتے رہے، بتدریج یہ آلہ، یہ عینک، یہ ہتھیار جس کا نام فطرت و جبلت ہے، کمزور ہوتا گیا، بے اثر ہوتا گیا، کم فائدہ ہوتا گیا؛ ایک زیادہ پر اثر، زیادہ طاقتور، زیادہ مضبوط چیز جس کا نام عقل و خرد ہے، اس نے اس کی جگہ لے لی اور آپ ہو گئے صاحبِ عقل۔

انسان کی صحیح و سالم اور بے غرض عقل، فیصلہ دیتی ہے کہ میں جداگانہ طور پر انسانیت کو ہدایت دینے

---

۱. سورہ مبارکہ نحل: آیت ۶۸ اور ۶۹۔ اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں اور درختوں اور گھروں کی بلندیوں میں اپنے گھر بنائے۔ اس کے بعد مختلف پھولوں سے غذا حاصل کرے اور نرمی کے ساتھ خدائی راستوں پر چلے۔

کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ دلیل چاہیے؟ ہمارے پاس دو قسم کی دلیلیں ہیں۔ ایک دلیل یہ ہے کہ انسانی عقل محدود ہے، لامتناہی نہیں ہے، جب کہ انسان کی ضروریات لامتناہی ہیں۔ کس طرح سے ایک عقل تمام ضروریات کو سمجھ سکتی ہے، تاکہ ان ضروریات کے مقابلے میں، جو چیز ان ضروریات کو پورا کرتی ہو، اس کو فراہم کرے یا قانون بنائے؟ عقل انسانی یہ کام نہیں کر سکتی، وہ کمزور ہے، ناتواں ہے، تمام دردوں کو پہچاننے کے اور ان کا علاج فراہم کرنے کے قابل نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ تاریخی و علمی حقائق پر نظر ڈالیے، دیکھیے کہ آیا عقل سے یہ کام ہو پایا ہے؟ آیا ارسطو، افلاطون اور سقراط کی عقل جیسی عقلیں انسان کے معاملات کو حل کر سکیں؟ افلاطون جیسا مفکر، جب بیٹھتا ہے، سوچتا ہے، مشورہ کرتا ہے، مطالعہ کرتا ہے، تحقیق کرتا ہے، ایک ایسا مدینۂ فاضلہ (model society) تشکیل دیتا ہے جو صرف ذہنوں کے اندر اور جناب افلاطون کے اپنے گھر کے صندوق ہی کے اندر رکھے جانے کے قابل ہے، کیونکہ دنیا میں ایک لمحے کے لیے یہ مدینۂ فاضلہ (model society) عمل پذیر نہیں ہوا۔ اور آج اگر آپ افلاطون کے مدینۂ فاضلہ کو دیکھیں، تو آج کی دنیا کی ترتیب کے مطابق، آپ کو ایک ناقابل قبول اور مضحکہ خیز چیز معلوم ہو گی۔

نبوت کے معنی یہ ہیں؛ انسان کو حس کی ہدایت سے، فطرت و جبلت کی ہدایت سے، عقل کی ہدایت سے زیادہ مضبوط اور زیادہ گہری ہدایت کی ضرورت ہے۔ یہ ہدایت آکر کیا کام کرتی ہے؟ کیا یہ آکر آپ کی حس سے رقابت کرتی ہے؟ کیا یہ آپ کی فطرت و جبلت کی مخالفت کرنے آتی ہے؟ کیا عقل کے سر پر پتھر مارنے آتی ہے؟ ہر گز نہیں۔ وہ عقل کی رہنمائی کرنے آتی ہے، تاکہ عقل کی پرورش کرے تاکہ منوں مٹی تلے دبی ہوئی عقل کو ملبے سے نکالے۔

اگر بولنے میں اس طرح کہا جائے کہ ہمارے امیر المومنین صلوات اللہ و سلام اللہ علیہ، تو یہ اشتباہ ہے، کیونکہ امیر المومنینؑ صرف ہمارے نہیں بلکہ بشریت کے امیر المومنینؑ ہیں، انہیں صرف اپنے تک محدود نہ کیا جائے وہ معلم انسانیت ہیں، انسانیت کے عظیم امیر المومنینؑ جیسا کہ نہج البلاغہ میں آیا ہے، فرماتے ہیں کہ انبیاؑ کو خدا نے بھیجا ہے، تاکہ انسانوں کو اس چیز پر ابھاریں کہ اپنی فطرت کے عہد و پیمان کے پابند رہیں اور فراموش شدہ نعمتیں انہیں یاد دلائیں، پھر «وَ يُثِيرُوا لَهُم دَفائِنَ العُقول»[۱]

---

۱. نہج البلاغہ، خطبہ اول، تاکہ وہ عقل و خرد کے خزینے کو باہر نکالیں۔

انسانی سوسائٹی کی عقل و خرد اور درک و شعور جو فرعونوں، نمرودوں، سرداروں اور مقتدر طاقتوں کے ہاتھوں دفن ہو گیا تھا، انبیاؑ آئے تا کہ ان مدفون خزانوں کو باہر نکالیں، ان دفن شدہ عقلوں کو متحرک کر دیں۔ فرعون کو پسند نہیں کہ لوگ صاحبِ عقل ہو جائیں، وہ نہیں چاہتا کہ لوگ سمجھیں کیونکہ اگر وہ سمجھیں گے، تو اس کا وجود افسانوی اور باطل ہو جائے گا اور یہ نبوت کی اگلی بحثوں میں ان شاء اللہ تشریح کے ساتھ بیان ہو گا۔

پس انبیاؑ وحی کی طاقت کے ذریعے عقل کے ساتھ جنگ نہیں کرتے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ دین عقل سے تضاد رکھتا ہے، وہ یا تو دین کو نہیں پہچانتا یا وہ بے عقل ہے، وگرنہ جس کے پاس عقل ہے، جس نے عقل کو تجربے سے پرکھا ہے اور دین کو بھی پہچانتا ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ انسانی علم اور انسانی عقل کے ساتھ دین کوئی تضاد رکھ ہی نہیں سکتا، اور نہ ہے۔ جو بات دین کہتا ہے، عقلِ صحیح اسے سمجھتی ہے اور پسند کرتی ہے۔ وہ جاہل لوگ جو دین کے دفاع کے نام پر، کبھی یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ جناب، دین کی وجوہات تلاش نہ کرو، دین میں استدلال نہ مانگو، دین کے باب میں فلسفہ کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی باتیں (فلسفے کا مطالبہ کرنا، فلسفہ پیش کرنا) دین کی اہمیت میں کمی کر دے گا؛ وہ جان لیں کہ ایسا نہیں ہے۔ سچا دین جب صحیح عقل کے سامنے آئے گا، تو ان کے درمیان کسی بھی قسم کا تضاد اور تعارض نہ ہو گا۔ آج انسانیت کی عظیم عقلیں، دین کی توحید کو، دین کی نبوت کو، دین کی نماز کو، دین کے روزے کو، دین کی زکوٰۃ کو، دین کے فروعی احکام کو سمجھتی ہیں۔

جب انسان کی عقل، انسانی علم کا تجربہ الکحل کو پہچانتا ہے، الکحل کے نقصانات سے واقف ہے، جسم پر، اعصاب پر، نفسیات پر اور سوسائٹی کے عمومی حالات پر اس کے نقصانات کو سمجھتا ہے، تو پھر میں یہ جرأت کیوں نہیں کر سکتا کہ قرآنی آیت کو پوری طاقت سے پڑھوں:﴿إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ﴾[1] قرآن کی آیت کو پیش کیوں نہ کروں؟ اس چیز کو دلیل کیوں نہ بناؤں جسے اس حوالے سے انسانی علم آج سمجھ چکا ہے؟ کیوں نہ کہوں کہ شیطان کا عمل ہے، یعنی شیطان ہیں جو یہ تمہیں دیتے ہیں اور شیطان ہیں جو اس بدبخت شرابی کی شراب خواری سے فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ باتیں کیوں نہ کہوں؟

---

۱. سورہ مبارکہ مائدہ: آیت ۹۰۔ شراب، جوا، بت، پانسہ یہ سب گندے شیطانی اعمال ہیں لہذا ان سے پرہیز کرو۔

بنابریں، دین عقل کی سرکوبی کے لیے نہیں آتا، عقل کو باطل قرار دینے اور اس کو زندگی سے نکال باہر کرنے کے لیے نہیں آتا، پس دین کس لیے آتا ہے؟ عقل کی ہدایت کے لیے، عقل کی دستگیری کے لیے۔ عقل ہے لیکن جب اس کے ساتھ ساتھ ہوس بھی ہو، تو وہ درست طور پر فیصلہ نہیں کر سکتی۔ عقل ہے لیکن جب لالچ اس کے پہلو میں کھڑی ہو، تو وہ درست طور پر دیکھ نہیں سکتی۔ جب مفاد اس کے ساتھ موجود ہو، تو درست طور پر سمجھ نہیں سکتی۔ دین آتا ہے، ہوا و ہوس کو، لالچ کو، خوف کو، ذاتی مفادات کو، عقل سے دور کر دیتا ہے، سالم اور کامل عقل کو مضبوط کرتا ہے، تائید کرتا ہے تاکہ اچھی طرح سمجھ لے۔ اور جب آپ اسلام کی طرف رجوع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ابتدا سے آخر تک اسلام، عقل کے جلووں سے لبریز ہے۔ قرآن میں کتنی بار آیا ہے ﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾، کتنی بار آیا ہے ﴿اَفَلا تَتَفَكَّرُون﴾ اس لیے کہ آپ سمجھ لیں، اس لیے کہ آپ جان لیں۔

کتنی بار آیا ہے، ﴿لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ عقل رکھنے والوں کے لیے۔ روایات میں کتنی بار آیا ہے «إِنَّ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حُجَّتَيْنِ»[۱] خدا کی لوگوں کے اوپر دو حجتیں ہیں: ایک پیغمبر اور ایک عقل۔

اجمالی طور پر اتنا یاد رہے کہ ان باتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ انسان، وحی کی ہدایت کے بغیر، بغیر اس کے کہ وحی اس کے پاس آئے اور اس کی مدد کرے، وہ منزل سعادت تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب وحی آتی ہے تو وہ عقل کو سرکوب نہیں کرتی، اسی طرح طبیعت و جبلت کو بھی سرکوب نہیں کرتی، ظاہری حواس کو بھی ختم نہیں کرتی۔ وحی آتی ہے، ظاہری حواس کو، انسانی اور بشری فطرت و طبیعت کو، انسانی عقل و فکر کی طاقت کو تقویت دیتی ہے، تصفیہ کرتی ہے، تزکیہ کرتی ہے، دستگیری کرتی ہے، اسے سکھاتی ہے۔ یہ وحی کا کام ہے؛ بنابریں یہ نبوت کا فلسفہ ہے۔

چونکہ ایسا ہے، چونکہ ہم ناقص ہیں، چونکہ انسانی علم و بصیرت ہماری ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے غیب سے کسی ہاتھ کو برآمد ہونا چاہیے اور ہماری ہدایت کرنی چاہیے۔ غیب سے ہاتھ کے برآمد ہونے کا مقام یہ ہے، نہ کہ وہ مقام کہ کچھ بھوک لگی ہو اور روٹی کی تلاش میں نہ جائیں، منتظر بیٹھے رہیں کہ غیب سے کوئی ہاتھ برآمد ہوگا۔ نہ ہی وہ مقام کہ کسی گناہ کا سامنا ہو اور حسرت و افسوس اور غم و اندوہ پر اکتفا کر کے بیٹھے رہیں اور انتظار کریں کہ غیب سے کوئی ہاتھ برآمد ہوگا؛ نہ ہی وہ مقام

---

۱. کافی، کتاب العقل و الجہل، حدیث ۱۲

کہ اپنی الٰہی ذمہ داری کو انجام نہ دیں، امر بہ معروف نہ کریں، نہی از منکر نہ کریں، راہِ خدا کو طے نہ کریں، منتظر بیٹھے رہیں کہ غیب سے کوئی ہاتھ برآمد ہوگا اور کچھ کرے گا۔[۱]

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً﴾[۲] یعنی تمام انسان اور تمام لوگ سب یکساں اور برابر تھے، ضرورتوں اور صلاحیتوں کے لحاظ سے۔ تمام انسان ضروریات کی نوعیت کے اعتبار سے یکساں تھے اور تمام انسانوں کی صلاحیتیں بھی ایک جیسی تھیں، اور سوسائٹی کی حقیقت بھی ہمیشہ ایسی ہی ہوتی ہے۔ سب انسانوں کے پاس عقل ہے، فکر ہے، ذہانت ہے، چھٹی حس ہے، ظاہری حواس ہیں، باطنی حواس ہیں۔ تمام انسانوں کو بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے، ان میں جنسی ہوس ہوتی ہے، گھر کی ضرورت ہوتی ہے، لباس کی ضرورت ہوتی ہے اور اس طرح کی دیگر ضروریات۔ ضروریات تمام برابر؛ تقریباً یکساں نوعیت کی، اور صلاحیتیں بھی مشابہ۔ اگر کوئی انسان کسی بہتر ماحول میں تربیت پائے اور اس کی صلاحیتیں کھل جائیں، تو یہ دوسری بات ہے۔ کوئی صاحب زادہ کسی مالدار گھرانے میں پیدا ہو، استاد گھر میں آکر چھ سات سال کی عمر میں اسے بلبل کی طرح بولنے کے لیے ہندی اور چینی زبان سکھا دے، جبکہ بھٹیوں میں کام کرنے والے فلاں مزدور کا بیٹا، جسے سات آٹھ سال کی عمر میں مادری زبان بھی درست طور پر بولنا نہیں آتی ہو؛ یہ اور بات ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُس کی صلاحیتیں اِس کی صلاحیتوں سے زیادہ تھیں، نہیں، اُس کی صلاحیتوں کو سامنے لایا گیا جبکہ اِس کی صلاحیت دبی رہ گئی اور سامنے نہ آسکی۔

﴿فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّينَ﴾ ان ایک جیسے انسانوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ کو منتخب کیا، ان یکساں لوگوں کے درمیان پروردگار عالَم نے، ایک زیادہ بلند، زیادہ مضبوط، زیادہ گہرے، زیادہ پُرجوش اور زیادہ صلاحیتوں والے انسان کو چنا اور اسے مبعوث کیا۔ کس کام کے لیے؟ ﴿مُبَشِّرِينَ﴾ بشارت دینے والے، ﴿وَمُنْذِرِينَ﴾ اور ڈرانے والے۔ انبیاؑ کس چیز کی بشارت دیتے ہیں؟ جنت کی بشارت دیتے ہیں، سعادت دنیا کی بشارت دیتے ہیں، مدینۂ فاضلہ (model city) کی بشارت دیتے ہیں، امن و امان، صلح اور خوشحالی کی بشارت دیتے ہیں، غربت، مایوسی، خوف، بے امنی اور جہالت کے خاتمے کی بشارت دیتے

---

۱. شہر خالی ست ز عشاق، بود کز طرفی   دستی از غیب برون آید و کاری بکند (حافظ)
یعنی شہر تو عاشقوں سے خالی ہے اور پھر انتظار اس بات کا ہے کہ غیب سے کوئی ہاتھ برآمد ہو اور وہ کوئی کام کرے۔

۲. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۲۱۳

ہیں، بشارت دینے والے ہیں، بالآخر یہ کہ انسانوں کو ایک فاضل حکومت اور ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کی بشارت دیتے ہیں اور اس کے بعد جنت میں جانے اور خدا کی خوشنودی سے متصل ہونے کی بشارت دیتے ہیں۔ اور ڈرانے والے ہیں، ڈراتے ہیں، آتشِ جہنم سے ڈراتے ہیں، پلِ صراط کی باریکی سے بھی ڈراتے ہیں، دنیا کی بدبختیوں سے بھی ڈراتے ہیں، جہالت اور غربت کے عفریت[1] کے تسلط سے بھی ڈراتے ہیں، فساد و بربادی کی کھائی میں گرنے سے بھی ڈراتے ہیں، انسانی صلاحیتوں کے نیست و نابود ہوجانے سے بھی ڈراتے ہیں، ڈرانے والے ہیں، خوف دلانے والے ہیں۔

﴿فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ﴾ سب کچھ یہی نہیں ہے کہ یہ کہیں کہ اے لوگو! ڈرو، اے لوگو! تمہیں بشارت ہو۔ نبی کے پاس ہے کیا؟ پروردگار کی جانب سے ایک کتاب۔ نازل فرمائی ان کے ساتھ ایک بر حق کتاب، حق کے مطابق کتاب۔ حق کے معنی کی وضاحت کی یہاں گنجائش نہیں۔ اجمالی طور پر یہ کہ جو کچھ فطرتِ عالَم کے مطابق ہے، جو کچھ دنیا کے فطری سسٹم سے ہم آہنگ ہے، وہ حق ہے۔ جو چیز انسان کی فطرت اور کائنات کی سرشت کے مطابق ہو، اسے کہتے ہیں حق۔ انبیاؑ کی کتاب بھی حق ہے، انسان کو اس کے طبیعی راستے پر، اس کی فطری راہ پر، عام حالات میں اور تکاملی نظام میں آگے بڑھاتی ہے، مدد کرتی ہے، انبیاؑ کی کتاب حق کو اپنے ساتھ رکھتی ہے۔

﴿وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾ تاکہ وہ کتاب، ﴿لِيَحْكُمَ﴾ یعنی تاکہ کتاب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے، ان چیزوں کے بارے میں جن میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں۔ لوگ اختلاف سے دور نہیں ہوتے ہیں، انسانوں کے درمیان اختلافات رائج ہیں اور اس کا ہونا ضروری ہے۔ یہ آپ جان لیجیے، اختلاف کا ہونا اچھا ہے، اس لیے کہ اختلاف تکامل کا سبب ہے۔ اس کا نہ ہونا مضر ہے یا نہیں اس پہ مجھے دوبارہ غور کرنا ہوگا یا اس کی تشریح و تفسیر بیان کرنا ہوگی البتہ اختلاف کا ہونا فائدہ مند ہے۔ کتاب آتی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان قضاوت کرے، فیصلہ دے، فیصلہ کُن حکم دے ان چیزوں کے بارے میں جن میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔ یہاں ہم کیا سمجھتے ہیں؟ ہم سمجھتے ہیں کہ جو حکومت انبیاؑ برپا کرتے ہیں، خود نبی کی حکومت، ایک فرد کی، ایک ذات کی استبدادی حکومت نہیں ہوتی؛ بلکہ قانون کی حکومت ہوتی ہے، کتاب کی حکومت ہوتی ہے، نبی

۱۔ ایک بد صورت اور خوفناک وجود جسے عام اصطلاح میں شیاطین و جنات کہا جاتا ہے۔

جب آتا ہے، تو ایسا معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس میں درحقیقت حاکم وہی کتاب ہوتی ہے؛ یعنی قانون۔ ﴿لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾، ﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ﴾ اس کتاب کے بارے میں اختلاف نہیں ہوا، اختلاف نہیں کیا، ﴿إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ﴾ سوائے ان لوگوں کے جنہیں کتاب دی گئی تھی، انہی لوگوں نے جن کے لیے یہ آسمانی کتاب آئی تھی، خود انہوں نے ہی آسمانی کتاب کے بارے میں اختلاف کیا۔ یہ کس بات کی طرف نشاندہی کرتی ہے؟ ادیان سماوی میں، انبیاؑ کے اقوال میں تحریف کے وجود کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔ انبیاؑ جب آئے تو کتاب، قانون، مکتب لے کر آئے، پھر جنہیں یہ کتاب، قانون اور مکتب دیا گیا تھا، انہوں نے اس بارے میں اختلاف کیا، کیا مطلب اختلاف کیا؟ یعنی ایک گروہ نے درست کہا اور ایک گروہ نے حق کے برخلاف کہا، بنابریں ایسے لوگ موجود ہیں جو کسی دین کے پیروکار ہیں اور دین کی بات کرتے ہیں، لیکن حقیقت کے برخلاف بات کرتے ہیں، اشارہ ہے ادیان میں تحریف اور نسخ کی جانب۔ ﴿مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾ ایک دوسرے کے ساتھ بغاوت اور زیادتی کی بنا پر، ﴿فَهَدَى اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ﴾ جو لوگ صاحبانِ ایمان ہیں، دینِ حق کے ماننے والے ہیں، خدا نے ان کی ہدایت کی اس چیز کے جواب سے جس کے اندر انہوں نے اختلاف کیا ہوا تھا، اپنے اذن اور اجازت سے، ﴿وَاللهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ اور خدا جس کو چاہتا ہے، راہِ درست کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

تو اب تک ہم نے کیا سمجھا؟ ہم نے فلسفۂ نبوت کو سمجھا اور یہ کہ تمام ادیان کے لیے یہ ایک اصل ہے، بلکہ بنیادی ترین اصل ہے، اور اگر یہ نہ ہو، دین صحیح معنی ومفہوم نہیں رکھ سکتا؛ کیونکہ دین وہ ہے جو پروردگار کی جانب سے آتا ہے، ایک پیغام لانے والے، وحی کا پیغام لانے والے کے ذریعے سے۔

پندرہویں نشست

۱۶ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری

نبوت میں بعثت

۱۹۷۴-۱۰-۳

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ ۞ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۞ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۞ الَّذِی عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۞ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۞ كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ ۞ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ ۞ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ﴾ (سورہ علق/۱-۸)

قرآن کے اندر، غالباً جب کسی نبی کے آنے کی بات ہوتی ہے، تو اس کی بعثت کا تذکرہ ہوتا ہے؛﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِی كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا﴾[1] ہم نے مبعوث کیا موسیٰؑ کو، ابراہیمؑ کو اور دوسرے انبیاؑ کو مبعوث کیا، بعثت! نبوت کے اندر ایک بعثت ہوتی ہے۔ بعثت کا مطلب کیا ہے؟ بعثت کیا ہے؟ اگر نبوت کے اندر کوئی بعثت ہے، یہ بعثت کس سے اور کس طرح سے مربوط ہے اور اس کا فائدہ کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

بعثت کے معنی برانگیختہ کرنا ہے۔ برانگیختہ کرنا یعنی کیا؟ یعنی تحرّک، سستی اور ٹھہراؤ کے بعد حرکت۔ جو مردہ برسوں کسی قبرستان میں سوتا رہا اور اس کے بدن کے اجزا خاک ہو گئے، جب وہ خدا کی قدرت سے قیامت میں اٹھے گا تو کہتے ہیں کہ بر انگیختہ ہوا۔ ﴿فَهَٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ﴾[2] بر انگیختہ ہونے کا دن ہے۔ جو انسان گھر کے اندر سو رہا تھا، یا معاشرے کے عام معمولات زندگی میں حرکت کر رہا تھا؛ معاشرے کے عام حالات کے برخلاف اس کے اندر کوئی جوش، کوئی جدوجہد، کوئی فعالیت نہیں تھی؛ درحقیقت ایک لکڑی کے تختے کی مانند، ایک بےجان پودے کی طرح، ایک تنکے کی مثل، معاشرے کی عام روش

---

۱. سورہ مبارکہ نحل: آیت ۳۶۔ اور یقیناً ہم نے ہر ایک امت میں کوئی نہ کوئی رسول (یہ پیغام دے کر) ضرور بھیجا ہے۔

۲. سورہ مبارکہ روم: آیت ۵۶

پر رواں دواں تھا اور معاشرہ اسے اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا تھا۔ ایک ایسا آدمی جب ہوش میں آیا، جب اس جمود کی حالت سے باہر نکلا، جب محسوس کیا کہ یہ راستہ، طبیعی راستہ، یہ عام طریقہ کار، ضروری نہیں ہے کہ اس کے لیے سو فیصد اطمینان بخش اور مطمئن کنندہ ہو، ممکن ہے کہ کوئی اور راستہ بھی تلاش کیا جا سکتا ہو جو انسان کو منزلِ سعادت تک پہنچا دے۔ جب ان افکار کے تحت انسان بیدار ہوگیا، ہوش میں آگیا، اس کے اندر حرکت اور جدوجہد پیدا ہوگئی، اس انسان کو کہتے ہیں برانگیختہ ہوگیا۔ میں چاہتا ہوں کہ نبوت کے بارے میں آپ لوگوں کا نظریہ بالکل نیا ہو جائے۔ نبوت کو بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں، گویا کہ مثلاً ایک واعظ، کسی شہر میں آتا ہے تاکہ اس شہر کے لوگوں کو دین یا کسی اور چیز کے بارے میں کچھ باتیں بتائے۔ یا فرض کر لیں کہ کوئی دینی احکام بتانے والا شخص لوگوں کے درمیان اٹھتا ہے، کھڑا ہوتا ہے تاکہ چند ایک فرعی مسئلے انہیں بتائے یا کوئی خطیب، کوئی مقرر، فرض کر لیجئے کوئی اجلاس بلانے والا کسی معاشرے میں پہنچے تاکہ کچھ شور شرابا کرے اور اجلاس بلائے۔ پیغمبر کو عام طور پر اس قسم کا آدمی سمجھا جاتا ہے؛ ایک ایسے روحانی عالم دین کی طرح جو نیک اور لوگوں کے درمیان سر جھکا کر رکھے۔ البتہ کبھی کچھ لوگ اس کی اہمیت سے واقف ہوتے ہیں، وہ اچھے لوگ ہیں، انہیں مومن کہا جاتا ہے؛ کبھی کچھ اس کی ناقدری کرتے ہیں، وہ ہو جاتے ہیں کافر، اور انہیں مشرک کہا جاتا ہے، ہم سمجھ رہے ہیں کہ پیغمبر کوئی ایسی چیز ہے۔

نبوت میں ایک قسم کا تغیر و تبدل ہوتا ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ دو تبدیلیاں اور دو تغیرات۔

پہلی خود پیغمبر کے وجود کے اندر؛ بعثت، بیداری، انقلاب، تغیّر، پہلے خود پیغمبر کی اپنی ذات کے اندر، خود نبی کے اپنے باطن میں وجود میں آتا ہے۔ پہلے وہ تبدیل ہوتا ہے، پہلے وہ خود ٹھہراؤ اور توقف کی حالت سے نکلتا ہے، جب اس کی روح کے اندر، اس کے باطن کے اندر قیامت برپا ہوگئی، جب نبی کی ذات کے اندر اور اس کی روح کی گہرائیوں میں ہلچل پیدا ہوگئی، جب خدا کی جانب سے نبی کی ذات کے اندر رکھی گئی سرشار صلاحیتیں بیدار ہو گئیں، اس چشمے کی مانند جس سے ہر لمحے پانی کی اربوں لہریں باہر آتی اور بہتی ہیں (اور اس سے پہلے وہ سارا پانی اس کے باطن کے اندر پوشیدہ تھا) خلاصہ یہ کہ جب نبی خود وحی الٰہی کے زیر اثر تبدیل ہوگئے تو اس کے بعد؛ یہی چشمہ، یہی تبدیلی، یہی جوش و خروش، یہی انقلاب، یہی حشر، یہ جوش مارتا بہتا چشمہ، جو نبی کی روح اور اس کا باطن ہے، وہ معاشرے کے اندر جا

نکلتا ہے، انسانی معاشرے کے وجود کے اندر منتقل ہو جاتا ہے۔ جب اس کی ذات کے اندر تبدیلی پیدا ہوگئی، تو اس کے بعد معاشرے کے اندر بھی تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ جب اس کے اپنے باطن کے اندر عظیم قیامت برپا ہوگئی تو اس کے بعد اس سے بڑی قیامت معاشرے کے اندر برپا ہوجائے گی۔ جب اس کے اپنے دل میں انقلاب برپا ہوگیا تو پھر اس کے ہاتھ سے، معاشرے کے اندر انقلاب برپا ہو جائے گا اور حقیقی معنی میں بعثت وجود میں آجائے گی۔ تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ نبوت کے اندر جو کچھ ہے، وہ جوش و خروش، تغیر و تبدل اور بعث و بیداری ہے۔

نبوت سے پہلے، پیغمبر کی حالت کیا ہوتی ہے؟ دو نکات نبوت سے پہلے ہر نبی کی زندگی میں، بطور متضاد، موجود ہوتے ہیں۔ البتہ یہ متضاد اس معنی میں نہیں ہے کہ حقیقی تضاد پایا جاتا ہے؛ ممکن ہے ظاہری طور پر تضاد معلوم ہوں گے۔ ایک یہ کہ نبی، اگرچہ مبعوث نہ ہوا ہو، تو بھی اس کے اندر بہت مضبوط اور گہری انسانی بنیادیں موجود ہوتی ہیں؛ دوسرے لوگوں سے زیادہ۔ اس کے فہم و ادراک کی استعداد، اس کی حرکت کی استعداد، اس کے اندر تبدیلی پیدا کرنے کی استعداد، دوسرے لوگوں اور دوسرے انسانوں کے ساتھ موازنے کے قابل بھی نہیں ہوتیں۔ اس کے اندر خدا کی بندگی کی استعداد اور خدا کا بندہ ہونے کی آمادگی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دوسرے انسانوں کے لیے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تمام صلاحیتیں جو ایک انسان کو خاک کی پستی سے نکال دیتی ہیں اور ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾[1] یعنی خدا کے حقیقی بندے اور الٰہی اخلاق سے آراستہ ہونے کے عروج تک پہنچا دیتی ہیں، وہ ساری صلاحیتیں، نبی کے اندر دوسروں سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔

اب یہ کہ دوسروں سے زیادہ کیوں ہوتی ہیں؟ کیا یہاں پر خدا نے ظلم اور بے جا امتیاز نہیں برتا ہے؟ یہ ایک دوسری بات ہے جس کے جواب میں ایک مختصر کلام کیا جا سکتا ہے اس طرح سے کہ نبوت کا بھاری بوجھ اٹھانے کے لیے زیادہ مضبوط اور زیادہ موٹی ہڈی اور زیادہ گہری صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ رسالت کا بوجھ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ بارِ نبوت کو اٹھانا، لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچانا اور ایک معاشرے کو جاہلیت سے توحیدیت میں بدلنا، یہ بہت عظیم اور بہت مشکل کام ہے اور ضروری ہے کہ کچھ لوگ اس بوجھ کو اٹھائیں۔ کون اٹھائے گا؟ عام انسان؟ یا ایسا انسان جو اردگرد کے ماحول، خاندان،

---

۱. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۱۵۶

آب و ہوا اور رشتہ داری کی خصوصیات کے حوالے سے زیادہ بہتر صلاحیتوں اور وسائل سے بہرہ مند ہوتا ہے اور جب خدا دیکھتا ہے کہ یہ زیادہ بہتر وسائل اس شخص کی مدد کریں گے، تو اسے فیض پہنچاتا ہے، اس پر لطف و کرم کرتا ہے، جو تربیت کے وسائل ہوتے ہیں، وہ اس کے لیے فراہم کرتا ہے، تاکہ یہ دو سو من کا بوجھ نبی کی سو من کی ہڈیوں پر قرار پا سکے۔[1] اسے ایک ایسا انسان بنا دیتا ہے جو اس کام کے لیے تیار ہو۔ اگر رسول اللہؐ یہ بھاری بوجھ نہ اٹھاتے، تو یہ زمین پر پڑا رہتا، اس کو اٹھانا میرے اور آپ کے بس میں نہیں تھا۔ اس کو اٹھانا گاندھی[2] اور لومومبا[3] کے بس میں بھی نہیں تھا، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے بس میں بھی نہیں تھا، ان سب سے کہیں زیادہ طاقت درکار تھی اس بھاری بوجھ کو (جسے رسالت و نبوت و بعثت کہا جاتا ہے) اٹھانے کے لیے، البتہ اس کی تفصیل بہت زیادہ ہے۔ لوگوں کے درمیان نبی ایک ایسی صلاحیتوں کا مالک شخص ہوتا ہے۔ یہ ایک نکتہ، کہ اس پہلے نکتے کا خلاصہ یہ ہوا کہ نبی یا پیغمبر کے اندر ایسی صلاحیتیں ہوتی ہیں، جو عام لوگوں سے کہیں زیادہ بھرپور، گہری اور دوسروں کی نسبت زیادہ قابلِ استفادہ ہوتی ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ نبی بعثت سے پہلے اور نبوت سے پہلے، عام زندگی کے اندر، لوگوں کا ساتھی اور ان کا شریک ہوتا ہے، ایک ہی راستہ کے وہ راہی ہوتے ہیں۔ ابتدا ہی سے وہ معاشرے کو تبدیل کرنے کی فکر میں نہیں ہوتا۔ ممکن ہے وہ معاشرے کے حالات سے راضی نہ ہو اور راضی ہوتا بھی نہیں ہے۔ ایک ذہین انسان اپنے زمانے میں طبقاتی اختلاف سے، اپنے زمانے کی جاہلانہ طرز سے، اپنے زمانے کی غربت سے، اپنے زمانے کے ظلم و ستم سے، اپنے زمانے کی جہالت سے اور ان سب کی جامع اسلامی تعبیر کے مطابق، اپنے زمانے کی جاہلیت سے راضی نہیں ہوتا۔ یقیناً متفق نہیں ہوتا ہے؛ لیکن یہ عدم رضامندی صرف راضی نہ ہونے کی حد تک ہی ہوتی ہے، ایک تبدیلی، ایک انقلاب، عام اجتماعی راستوں

---

۱. یہ فارسی زبان کے ایک محاورے سے بنایا گیا جملہ ہے۔ محاورے کا ترجمہ یہ ہے؛ سو من کے وزن کے لیے دو سو من کی ہڈی درکار ہوتی ہے۔

۲. مہاتما گاندھی (۱۸۶۹ سے ۱۹۴۸) برطانوی سلطنت سے آزادی کی راہ میں ملت ہند کے روحانی اور سیاسی لیڈر تھے۔ وہ برہمن دین کے زیر اثر بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور پر امن جدوجہد کی تاکید کیا کرتے تھے۔ گاندھی نے برطانوی اشیا کے بائیکاٹ کا بھی اعلان کیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد ایک شدت پسند ہندو نے، جو مسلمان ملک پاکستان کے ساتھ وسیع تعلقات کا مخالف تھا، انہیں قتل کر دیا۔

۳. پیٹرس لومومبا (۱۹۲۵ سے ۱۹۶۱) بیلجیئم کے خلاف کانگو کی سامراج مخالف تحریک کے رہنما تھے۔ وزیر اعظم بننے کے بعد امریکا اور بیلجیئم کے جاسوسی اداروں کی سازشوں سے صدر نے انہیں معزول کر دیا اور کچھ خفیہ زندگی گزارنے کے بعد جنرل موبوتو سیسی سیکو نے انہیں قتل کر دیا۔

سے ہٹ کر کسی اور راستے کے ذریعے تبدیلی کی حد تک نہیں ہوتی۔

سورہ ﴿والضحی﴾ کی آیت اس مطلب کو خوب واضح کرتی ہے﴿وَالضُّحَىٰ﴾[1] قسم ہے چاشت کے وقت کی روشنی کی۔ ضُحیٰ یعنی ظہر سے پہلے کا وقت۔ دیکھیے، یہ قسم کھانا خود ایک معنی رکھتا ہے، اس وقت کی قسم کھانا خود بامعنی ہے۔ شاید اس کے اندر کوئی اشارہ ہو، اور واضح ہے کہ چونکہ گفتگو پیغمبر اکرمؐ کی رسالت اور بعثت کی ہے؛ لہٰذا یہ ضُحیٰ اشارہ ہے اس نور کی طرف جو پیغمبر اسلامؐ کی بعثت اور نبوت کے زیر اثر پوری دنیا پر چھا گیا۔ ﴿وَالضُّحَىٰ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ﴾ اور قسم ہے رات کی، جب اس کی تاریکی پوری دنیا کو ڈھانپ لیتی ہے، ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ﴾۔ وحی کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد، گویا کچھ عرصے بعد، وحی منقطع ہوگئی تھی۔ جب پیغمبر کے اندر وہ برانگیختگی پیدا ہوگئی، وہ جوش اور ہیجان ان کے اندر پیدا ہوگیا، وحی الٰہی لانے والے حضرت جبرئیل کے ساتھ آپؐ مانوس ہوگئے؛ اچانک ہی وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا، آپؐ بہت غمگین ہوئے۔ [وحی کے منقطع ہونے کی] اس مدت کو کہتے ہیں فَترَت کا زمانہ۔

اس کے بعد سورہ ﴿وَالضُّحَىٰ﴾، پہلی بشارت آمیز سورہ، پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہتی ہے: ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ﴾ آپؐ کے پروردگار نے آپؐ کو چھوڑا نہیں ہے، خود سے دور نہیں کیا ہے اور آپؐ سے ناراض بھی نہیں ہوا ہے، ﴿وَمَا قَلَىٰ﴾ نہ آپؐ سے ناراض ہوا ہے۔ ﴿وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ﴾ آخرت، مستقبل، آپ کے لیے ابتدا سے، ماضی سے بہتر ہے؛ آپ کے کام کا انجام، آغاز سے بہتر ہے۔ ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ اور عنقریب آپؐ کا پروردگار آپؐ کو اتنا عطا کرے گا کہ آپؐ خوش ہوجائیں گے۔ البتہ اس کے ذیل میں روایت ہے کہ اس سے مراد شفاعت ہے۔ بات بھی درست ہے، شفاعت ان چیزوں میں سے ایک ہے جو پیغمبر اکرمؐ کو دی گئی ہیں اور اس قدر دی جائے گی کہ آپؐ خوش ہوجائیں گے لیکن اس دنیا میں بھی پیغمبرؐ کو اتنا دیا گیا کہ راضی ہوگئے، انسانوں کی ہدایت، مدینۂ فاضلہ (model city) کی تشکیل، خطرناک اور جانی دشمن پر غلبہ اور تسلط، شہروں کی فتح، اسلامی معاشرے کا تکامل کے راستے پر گامزن ہوجانا، یہ سب پیغمبر اسلامؐ پر خدا کی نعمتیں تھیں۔

جی ہاں، ﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ﴾ کیا خدا نے آپؐ کو یتیم نہیں پایا؟ تو پناہ کی جگہ دی؟ خدائے متعال

---

۱. سورہ مبارکہ ضحیٰ: آیت ۱ سے ۷

نے آپؐ کو ایک یتیم پایا، بے کس، بے پناہ، آپؐ کو پناہ دی۔ آپؐ کے والد تو تھے نہیں، آپؐ کی ولادت سے پہلے ہی آپؐ کے والد دنیا سے جا چکے تھے، والدہ بھی کچھ عرصے بعد ہی دنیا سے چلی گئیں، آپؐ کے دادا بھی چند سال بعد ہی دنیا سے رخصت ہوگئے، آپؐ اکیلے رہ گئے، تنہا، اپنے چچا حضرت ابوطالبؑ کے زیرِ کفالت۔ اور آپؐ کو جو کہ ابتدا ہی سے یتیم تھے، ہر لمحے ہم نے پناہ دی، کہنا چاہتا ہے کہ خدا کی پناہ ہمیشہ آپؐ ساتھ ہے، بچپن سے ہی تھی، اب جب کہ رسالت کا یہ بھاری بوجھ آپؐ کے دوش مبارک پر ہے؛ تو ڈریئے نہیں، گھبرائیے نہیں، مبادا یہ سوچنے لگیں کہ خدا نے آپؐ کو چھوڑ دیا ہے، ہرگز نہیں؛ خدا آپؐ کو نہیں چھوڑے گا، جب آپؐ کو اس وقت پناہ دی [تو اب کیسے تنہا چھوڑے گا]۔

﴿وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ﴾ اور آپؐ کو گمنام پایا تو (آپؐ کی طرف لوگوں کی) رہنمائی کی۔یہاں پر چند ایک روایات ہیں۔

(لیکن) آیت کا ظاہر، صاف اور واضح زبان میں، یہ کہہ رہا ہے کہ تم ناواقف تھے، گم گشتہ تھے، تمہاری ہدایت کی۔ تم گم گشتہ تھے کا کیا مطلب ہے؟ یعنی بت پرست تھے؟ ہرگز نہیں؛ ایک منحرف انسان تھے؟ ہرگز نہیں؛ گناہ گار تھے، ہرگز نہیں، پھر کیا مطلب ہے؟ یعنی یہ صراط مستقیم جو تمہیں بعثت و نبوت کے ذریعے دکھایا گیا، یہ تمہارے پاس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور ہے کیا؟ وہ علوم و معارف، وہ قوانین، وہ افکار، وہ نظریات جو پیغمبرؐ پر وحی کی آمد سے، آپؐ کے قلبِ مقدس پر روشن ہوئے، کیا وہ نبوت اور بعثت سے قبل، آپؐ کے سامنے تھے؟ یقیناً نہیں۔ گم گشتہ تھے کا مطلب یہ ہے اور یہ آیت کا ظاہری معنی ہے اور کوئی حرج بھی نہیں ہے کہ ہم اس آیۂ مبارک کو (جس کے ظاہری معنی یہ ہیں) تأویلی معنی کے اعتبار سے حمل کریں مکہ والوں کے درمیان گم ہونے پر، مکہ کے اردگرد موجود پہاڑوں میں گم ہوجانے پر، بھیڑوں کو چراتے ہوئے راستے میں گم ہوجانے و غیرہ پر؛ جیسا کہ بعض روایات اور نقل شدہ باتوں میں آیا ہے۔

اس آیت کا مطلب اور اس سورہ کو اس ضمیمہ میں شامل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ پیغمبر اکرمؐ، جیسا کہ آیت کا ظاہری معنی یہی ہے، گم گشتہ تھے، عام لوگوں کے درمیان چلتے پھرتے تھے، معاشرے میں آمد و رفت رکھتے تھے، اگرچہ حالات سے خوش نہیں تھے، اگرچہ اس بات پر کہ قریش کے بڑوں کی اولاد،

فلاں غریب زادی کی کنیز پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں، آپؐ غمزدہ تھے اور حلف الفضول[۱] کا معاہدہ کرتے تھے؛ جواں مردوں کا معاہدہ۔ اگرچہ ایک لمحہ بھی آپ نے شرک نہیں کیا اور بتوں کی تعظیم نہیں کی، اگرچہ ایک لمحہ بھی بدمعاشوں اور بدمستوں کے ساتھ آپؐ کا تعلق نہیں رہا اور اس معاشرے کے اندر ایک جواں مرد کی طرح اپنی زندگی گزاری؛ اس معاشرے کی عام زندگی کی ڈگر پر۔

پیغمبر اکرمؐ، اس معاشرے کے اندر عام انداز سے زندگی بسر کر رہے ہیں، کہ اچانک وحی الٰہی نازل ہوتی ہے۔ آپؐ کے وجود کے اندر اور آپؐ کے باطن کے اندر ایک گہری تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، یہ تبدیلی اتنی عجیب و غریب ہے، اس قدر شدید ہے کہ پیغمبرؐ کے جسمِ اطہر پر بھی اثر ڈالتی ہے، پیغمبرؐ کے اعصاب کو بھی متاثر کرتی ہے۔ کوہِ نور کے اوپر جب پیغمبر اکرمؐ کی روح پر وحی کا پہلا شعلہ اترا، تو آپ کو شعلہ ور کر دیا۔

پیغمبر کے اندر آگ بھڑک اٹھتی ہے، تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مفکر انسان، یہ درست راہ پر چلنے والا انسان، یہ آمادہ انسان، اچانک اس کے اندر ایک انقلابی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے، ایک بیداری۔ اب یہ انسان پہلے والا انسان نہیں ہے۔ محمدؐ، ایک لمحے پہلے والے محمد نہیں تھے، ایک گھنٹے پہلے والے انسان نہیں تھے، ایک بالکل ہی دوسری چیز تھے، ایک مختلف عنصر، ایک مختلف جوہر۔ پہلے، آپؐ کی اپنی ذات کے اندر بعثت وجود میں آئی، آپؐ کے اپنے باطن کے اندر انقلاب اور تبدیلی پیدا ہوئی اور پھر یہی انقلاب آغاز ثابت ہوا کہ دنیا کو انقلاب سے دوچار کردے۔ اگر آپؐ خود تبدیل نہ ہوتے، تو دنیا کو تبدیل نہیں کر سکتے تھے اور یہ نبی کے پیروکاروں کے لیے ایک درس ہے تاکہ جان لیں کہ جب تک خود تبدیل نہیں ہوں گے، دنیا کو بدل نہیں سکتے جان لیں کہ

ذات نایافتہ از ہستی بخش

کی تواند کہ شود ہستی بخش

یعنی جس کی اپنی ہستی میں کچھ نہ ہو وہ دوسرے کی ہستی کو کس طرح سے عطا کر سکتا ہے۔[۲]

تمہیں تو اپنے وجود میں سے کچھ نہیں ملا، تم نے تو خود اس الٰہی جوش و جذبے، پروردگار کے اس فروغِ

---

۱. حلف الفضول یا جواں مردوں کا عہد و پیمان، یہ ایک ایسا معاہدہ تھا جو پیغمبر اکرمؐ نے بیس سال کی عمر میں مکہ کے بعض جوانوں کے ساتھ کیا تھا تاکہ مظلوموں اور شہر میں آنے والے غیر مقامی افراد کی حمایت کریں۔

۲. عبدالرحمٰن جامی

لطف اور نعمتِ نور سے کوئی استفادہ نہیں کیا، تم تو خود بے بہرہ ہو، تم لوگوں کو کیا دے سکتے ہو؟ پہلے خود انگارہ بنو، شعلہ ور ہوجاؤ، تاکہ کوئلوں کو، سرد چیزوں کو، سیاہ چیزوں کو شعلہ ور کر سکو اور جلا سکو۔ پہلا شعلہ خود پیغمبر اکرمؐ کی روح میں جلایا گیا، پہلے ان کا اپنا دل، متحول اور منقلب ہوا، پہلے خود ان کے اپنے باطن میں قیامت اٹھی پھر وہ دنیا کے اندر قیامت اٹھانے کے قابل ہوئے۔ ایک ایسا انسان بنانے کے قابل ہوئے کہ یہ انسان اپنی جان دینے پر تیار ہو جائے، لیکن اپنے نظریے کو نہ چھوڑے؛ یہ کوئی مذاق ہے؟ یہ کوئی آسان بات ہے کہ سیاہ فام بلال حبشی کو لے کر آئیں، زمین پر گرادیں، ماریں، ایسا نہیں کہ تھوڑا سا مارنا، یا تھوڑا زیادہ مار لینا، بلکہ بہت زیادہ مارنا، بہت ہی زیادہ اذیت دینا اور وہ کوڑے کھاتے ہوئے، تشدد سہتے ہوئے، نہ ایک منٹ بعد، نہ ایک گھنٹے بعد، [بلکہ] اسی حالت میں فریاد کرتے جائیں کہ احدٌ، احدٌ، احدٌ، احدٌ! اگر اس کی تعبیر بیان کرنا چاہیں، اس کے مترادف ایک جملہ ڈھونڈیں، تو بنے گا، مردہ باد تم سب لوگ، مردہ باد تم سب لوگ، مردہ باد تم سب لوگ، حضرت بلال کے احدٌ، احدٌ، احدٌ کا مطلب یہ ہے[1]۔ پیغمبرؐ ابتدائے اسلام یا بعثت میں ایسے ہی ابوذر[2] نہیں بنا پائے، بلاوجہ بلالؓ نہیں بنا پائے یا مقدادؓ[3] یا عبد اللہ بن مسعودؓ نہیں بنا پائے، پہلے وہ خود تبدیل ہوئے۔ اب دیکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ پر نازل ہونے والی پہلی وحی نے پیغمبرؐ پر کیا اثرات مرتب کیے اور اس میں کیا نکات ہیں، اس بحث کا ایک حصہ ﴿اِقْرَأْ﴾ ہے۔ ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِى خَلَقَ﴾ (اے رسولؐ) اپنے پروردگار کے نام سے پڑھیے جس نے (سب کائنات کو) پیدا کیا۔ دیکھیے، ایک منظم سلسلے کا آغاز

---

۱. شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، تیسرا خط، غزوہ بدر کا واقعہ

۲. جندب بن جنادہ، کنیت ابوذر کا تعلق قبیلۂ غفار سے ہے اور چوتھے یا پانچویں فرد ہیں، جو مسلمان ہوئے۔ جب انہوں نے نئے پیغمبر کے ظہور کی خبر سنی، تو فوراً مکہ پہنچے اور اسلام لے آئے۔ پھر اپنی قوم میں واپس چلے گئے اور جنگ خندق کے بعد مدینہ ہجرت کی۔ رسول خداؐ کی وفات کے بعد ابوذرؓ، امیرالمومنینؑ کے حامیوں میں سے تھے اور انہوں نے جناب ابوبکر کی بیعت سے گریز کیا۔ جناب عثمان کے دور خلافت میں بنوامیہ کے لیے حکومت کی بخششیں دیکھ کر حضرت ابوذر نے حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا، اسی وجہ سے پہلے شام اور پھر ربذہ کی جانب شہر بدر ہوئے۔ حضرت اابوذرؓ سن ۳۱ یا ۳۲ ہجری میں اسی مقام پر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

۳. آپ ابتدا میں اسلام لانے والوں میں سے ہیں اور اسلامی مورخین نے انہیں ساتواں مسلمان شمار کیا ہے۔ مقدادؓ کا شمار بزرگ اصحاب میں ہوتا ہے جنہوں نے مکہ والوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ پھر مکہ واپس آئے اور پھر مدینہ چلے گئے اور پیغمبر اسلامؐ کی تمام جنگوں میں شرکت کی۔ آپ تیر اندازی میں مشہور تھے۔ رسول خداؐ کی رحلت کے بعد، آپ امیر المومنینؑ کے گنے چنے حامیوں میں شامل تھے۔ جناب عثمان کے ساتھ لوگوں کی بیعت کے موقع پر مقدادؓ نے مخالفت کی۔ آخرکار ۳۳ ہجری میں مدینہ سے ایک فرسخ (تقریباً ۴ کیلو میٹر) کے فاصلے پر آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کو مدینہ لاکر بقیع کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

ہوتا ہے؛ سب سے پہلی جو چیز ایک خدا پرست انسان کے لیے، جیسے ہمارے پیغمبر ہیں، وہ بعثت سے پہلے بھی خدا پرست تھے، مشرک نہیں تھے۔ سب سے پہلی جو چیز ایک خدا پرست انسان کے لیے، خدا کی جانب اس کی توجہ کا محور بنتی ہے، اس کے دل کو خدا کی جانب جذب کرتی ہے، سادہ‌ترین موضوع ہے، وہ خلقت کا موضوع ہے۔ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو، جس نے خلق کیا۔ خلقت اسی کے لیے ہے، خلقت کے یہ عظیم جلوے، سب اسی کے لیے ہیں۔

جب یہ بات ذہن میں اتر جاتی ہے، تو ایک قدم آگے بڑھتا ہے، خلقت سے بڑھ کر ایک اور چیز کو ثابت کرتا ہے۔ ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ انسان کو خلق کیا، وہ بھی علق (جمے ہوئے خون) سے۔ انسانوں اور دوسری مخلوقات کے درمیان کتنا فرق ہے؟ اس کی جانب انسان شروع میں متوجہ نہیں ہوتا۔

انسان پہلے مرحلے میں، انسان کی اہمیت اور انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان جو حیرت انگیز فرق ہے، اسے نہیں سمجھتا، لیکن جب غور کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اوہ، ایسا فرق! انسان اور دوسری مخلوق کے درمیان جو درّہ ہے، بہت گہرا ہے۔ کیسا درّہ؟ کون سا امتیاز ہے انسان کے پاس جو اسے دوسری مخلوق سے اس طرح سے جدا کر دیتا ہے؟ عقل و خرد کی طاقت، کلیات کو پہچاننا، جزئیات سے نتیجہ اخذ کرنا۔ وہ کام جو نہ درخت کرتا ہے، نہ پتھر کرتا ہے، نہ جانور کرتا ہے؛ یعنی جدت طرازی، ایجادات کرنا۔ اور اگر انسان جدت طراز نہ ہوتا تو انسان بھی دوسری مخلوق کی مانند ہمیشہ ایک ہی حد کے اندر رہ جاتا، جیسا کہ گزشتہ نشست میں شہد کی مکھی کی مثال دی تھی۔ ارادے اور فیصلے کی طاقت، اختیار، جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے، دوسری مخلوق کے برخلاف کہ جو اپنی جبلت کی پیروی پر مجبور ہیں۔ جو ان کی جبلت کہتی ہے، اس پر عمل کرتے ہیں، چاہت کا مسئلہ نہیں ہے۔ انسان اپنی طبیعت و جبلت سے بالکل متضاد عمل کر سکتا ہے۔ انسان کی طبیعت یہ ہے کہ وہ کھانا کھائے، انسان کی طبیعت یہ ہے کہ اپنی جنسی شہوت کو پورا کرے، یہی تو ہیں جبلتیں اور خواہشیں؟ آپ ایسے انسان دیکھتے ہیں جو اپنی پوری زندگی میں ایک بار بھی جنسی خواہش پر عمل نہیں کرتے، یہ فطرت کے برخلاف ہے، ریاضت ہے۔ ایک انسان کئی روز تک ایک بادام پر زندگی گزار دیتا ہے۔ یہ کام صرف انسان کر سکتا ہے، انسان اپنی فطرت و جبلت کے برخلاف عمل کر سکتا ہے۔

خلاصہ، انسان کے اندر غور و فکر کی طاقت، اختیار کی طاقت اور جدت طرازی کی طاقت، وہ چیزیں ہیں جس نے انسان کو دوسری مخلوق سے ممتاز کر دیا ہے، ان کے مقابلے میں انسان ایک بالکل ہی الگ چیز ہے۔ البتہ سائنسدان بھی اب اس تک پہنچ گئے ہیں، اور کہنے لگے ہیں کہ انسان ایک حیرت انگیز نوع ہے۔ اگرچہ وہ تفاوت کے قائل نہیں ہیں، لیکن ایک حیرت انگیز نوع ہے۔ اور انسان کے اندر جو یہ تمام ممتاز خوبیاں ہیں، یہ سب اس کے اندر روح الٰہی کے فیضان سے ہیں۔ انسان کے اندر روح الٰہی کی تجلی ﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي﴾[1]

جی ہاں، اچانک پیغمبر اکرمؐ کو خشک اور خالی خلقت سے بڑھ کر ایک اور چیز کی جانب متوجہ کیا جاتا ہے؛ انسان کی تخلیق، عقل کی تخلیق، فہم و ادراک کی طاقت کی تخلیق، وہ بھی کس چیز سے؟ ﴿مِنْ عَلَقٍ﴾ جمے ہوئے خون سے۔ کہاں سے کہاں تک؟ «ما لِلتُّرابِ وَ رَبِّ الأَرْبابِ»؛ کس طرح سے ایک چیز جو بے جان ہے، حرکت کی طاقت نہیں رکھتی، فہم کی قوت نہیں رکھتی، تبدیل ہو جاتی ہے آئن اسٹائن میں! تبدیل ہو جاتی ہے ایک بڑے انسان میں۔

ہمارے نبی کو ابتدائے وحی میں اس بہت اہم نکتے کی جانب متوجہ کیا گیا۔ دیکھیے، چاہتے ہیں کہ ان کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہو جائے، ان کے پیروں میں ایک فولادی جوتا ڈالنا چاہتے ہیں، فولادی عصا ان کے ہاتھ میں دے کر چلانا چاہتے ہیں، اتنا کہ تھکن ان کے لیے بے معنی ہو جائے۔ ان کی ابتدا ان الفاظ سے بناتے ہیں۔

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ پیدا کیا انسان کو علق سے، یعنی جمے ہوئے خون سے، ﴿اقْرَأْ﴾ پڑھیے، خدا اس سے بھی بڑھ کر ہے، ﴿وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ﴾ اس سے بھی زیادہ بزرگوار، سب سے زیادہ کریم اور بخشش کرنے والا ہے، ﴿الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ جس نے تعلیم دی قلم کے ذریعے۔ اللہ، انسان میں تعلیم کے مسئلے کو پیغمبرؐ کے لیے پیش کرتا ہے۔

انسان کے گزشتہ انکشافات اور تجربات کا نتیجہ جو اگلی نسلوں تک پہنچتا ہے۔ وہ کس ذریعے سے اگلی نسلوں تک منتقل ہوتا ہے؟ قلم کے ذریعے سے! تحریر اور کتابت کے وسیلے سے!

تعلیم دی انسان کو قلم کے ذریعے، پس خدا کے لیے خود تخلیق اور پیدائش سے بڑھ کر ایک چیز ہے۔

---

۱. سورہ مبارکہ حجر: آیت ۲۹۔ سورہ مبارکہ ص: آیت ۷۲

﴿اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ﴾ پڑھو اور آپؐ کا پروردگار سب سے زیادہ بزرگوار ہے۔ ﴿اَلَّذِی عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ جس نے تعلیم دی قلم کے ذریعے، ﴿عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ تعلیم دی انسان کو ان چیزوں کی جن کو وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ انسان کے لیے خدا کی نعمتیں ہیں۔ پس انسان کو ان نعمتوں پر شکر ادا کرنا چاہیے، جب خدا نے انسان کو تعلیم دی، جب خدا نے انسان کو راستہ دکھایا، انسان کو قلم دیا، انسان کو عقلمند بنایا اور تعلیم دی، پس انسان کو عروج کی طرف بڑھنا چاہیے، پس انسان کو ایک لمحہ بھی انحطاط کی جانب نہیں جانا چاہیے۔ انسان کو قدم پیچھے نہیں ہٹانا چاہیے، بدبختی کی طرف نہیں پلٹنا چاہیے، کیا ایسا ہی ہے؟ اگلی آیت جواب دیتی ہے، گویا ایک قسم کا سوال پیش آتا ہے کہ اگر خدا انسان کو اس قسم کا بناتا ہے، تربیت کرتا ہے، قلم دیتا ہے، لطف کرتا ہے اور اس کے لیے کرامت سے کام لیتا ہے؛ اگر ایسا ہے، تو اس کو بدبختی، گمراہی، فساد اور ضلالت جیسی چیزوں کا نشانہ نہیں بننا چاہیے، کیا ایسا ہوا ہے؟

﴿كَلَّا﴾ جو تم سمجھ رہے ہو اور کہہ رہے ہو، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ انسان کی حالت کیا ہے؟ ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغَىٰ أَنْ رَآهُ اسْتَغْنَىٰ﴾ رحمان کے مقابلے میں عاجز انسانوں اور طاغوتوں کی طغیانیوں، سرکشیوں اور نافرمانیوں نے، ان کی صف آرائیوں نے بشریت کو بدبخت کر دیا۔ ان شیطانی حرکتوں نے، انسان کو ہدایت تک نہیں پہنچنے دیا۔ ان طغیانیوں، نافرمانیوں اور سرکشیوں نے انسان کو اجازت نہیں دی کہ وہ اپنی الٰہی استعداد سے بھرپور استفادہ کرے اور جس طرح سے خدا چاہتا تھا کہ اس کی تربیت ہو، اس طرح سے پرورش پائے، وہی ہو جو خدا نے اس کے لیے ارادہ کیا تھا، سرکشوں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ جب انہوں نے اپنے آپ کو بے نیاز پایا، تو طغیان پر اتر آئے، سرکشی کر دی، خدائی راستے سے خارج ہو گئے۔ دیکھیے، ایک بار پھر پیغمبرؐ کی تربیت ہو رہی ہے۔ خدا کے لطف کی جانب توجہ، خدا کی بزرگواری کی طرف توجہ، خدا کی تعلیم پر توجہ، اس بات کی جانب توجہ کہ خدا خلق کرنے والا ہے، اس بات کی جانب توجہ کہ خدا تعلیم دینے والا ہے، اس بات کی جانب توجہ کہ خدا سب سے زیادہ کرم کرنے والا ہے اور اس بات کی جانب توجہ کہ انسانیت کو جہاں پہنچنا چاہیے تھا، وہاں نہیں پہنچی ہے؛ ﴿كَلَّا﴾ کے مفہوم کے مطابق نہیں پہنچی ہے اور اس بات کی جانب توجہ کہ سرکشی کرنے والوں کا قصور ہے۔

اور سرکشی بے نیازی کے احساس کی وجہ سے ہے۔ استغناء، غنی ہونا، دولت کا جمع ہونا، خزانوں اور مال و دولت کا ڈھیر لگ جانا گردنوں کو اکڑا دیتا ہے، اور جب گردن اکڑ جائے، جب غیر الٰہی طاقتیں وجود

میں آجائیں اور تشکیل پا جائیں، پھر انسانیت اس منزل تک نہیں پہنچتی۔ دیکھیے، یہ بعثت کے آغاز میں خدائی تعلیمات ہیں، یہ وہی شعلے ہیں جنھوں نے پیغمبرِ خداؐ کے اندر آگ بھڑکا دی، شعلہ ور کر دیا۔ ﴿إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ﴾؛ کیا یہ سرکشی کرنے والے آخرکار کامیاب ہو پائیں گے؟ نہیں! آپؐ کے پروردگار ہی کی جانب لوٹنا ہے، انجام خدا کے لیے ہے، انجام تو خدا اور خدائی محاذ کے ہی حق میں ہے۔ وہی راستہ جو پروردگار عالَم نے معین کیا ہے، آخرکار انسانیت اسی راستے سے اپنی منزل پر پہنچے گی، کوئی شک نہیں ہے، ﴿إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ﴾۔ اور پھر کچھ دوسری باتیں اس سورۂ مبارکہ میں ہیں۔ جی ہاں، دیکھیے ان باتوں میں موجود کون سے حقائق ہمارے پیغمبرؐ کے اندر انقلاب اور تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں اور یہی وہ تبدیلی ہے جو معاشرے کے اندر جلوہ نما ہوتی ہے۔

سورۂ ﴿النَّجْمُ﴾ میں بھی، کہ جس کی آیات کا ایک حصہ یہاں ذکر کیا ہے، اشارہ ہے پیغمبرؐ کے اسی اندرونی تغیّر و تبدل کی جانب، البتہ متعدد دوسری آیات بھی ہیں کہ ضروری نہیں سمجھا کہ سب کو یہاں ذکر کیا جائے، البتہ چونکہ بحث بہت دقیق، ظریف اور دلچسپ ہے، لہٰذا کوشش کی جائے گی کہ اس نکتے کی کچھ زیادہ وضاحت کی جائے کہ اس کا جاننا، عمل کرنے کے لیے بھی مفید ثابت ہو۔

جی ہاں! اس اندرونی اور باطنی بر انگیختگی کے بعد نبی کا راستہ تبدیل ہوتا ہے اور ان کی کوششوں کا انداز بدل جاتا ہے اور پوری کوشش اور مسلسل جہاد میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کوشش کیوں کرتے ہیں؟ تاکہ معاشرے کے اندر اور انسانوں کی زندگی کی گہرائیوں میں ایک بنیادی تبدیلی اور انقلاب برپا کر دیں۔ جب ان کے اپنے اندر تبدیلی پیدا ہو گئی تو اس کے بعد کوشش کرتے ہیں کہ معاشرے کے اندر تبدیلی پیدا کر دیں، اور یہ ہی رسالت کی ذمہ داری ہے اور نبی اسی کام کے لیے ہے۔

نبوت کا پیدا کردہ اجتماعی انقلاب

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ﴾ (سورہ قصص/۵-۶)

بعثت، تغیر و تبدل کا وجود میں آنا یا ابھرنا، نبی کے باطن کے اندر ایک جوش و جذبہ اور جدوجہد کا تلاطم اٹھنا، وحی کے آغاز سے شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی پیغمبر کے دل کے اندر جو خدا کا برگزیدہ بندہ ہے اور خدا نے اس کے اندر موجود گہری اور بھرپور صلاحیتوں کی وجہ سے اسے ایک عظیم ذمہ داری اور کام اور بہت سخت عہد و پیمان کے لیے معین کیا ہے۔ جب ایک ایسے بندے پر وحیِ الٰہی کا عمل انجام پاتا ہے تو اس کی روح اور اس کے باطن کے اندر، ایک جوش اور ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے، ایک انقلاب خود اس نبی کے اندر بپا ہو جاتا ہے۔ اس کی عام زندگی کے اندر، اس کی رفت و آمد کے اندر، اس کے اجتماعی موقف کے اندر، مختصر یہ کہ اس کے پورے وجود کے اندر ایک تلاطم برپا ہوجاتا ہے، ایک انقلاب وجود میں آجاتا ہے۔ وحی کے بعد والا شخص، وہ کل والا یا دو گھنٹے پہلے والا شخص نہیں ہوتا۔
جب ان کے اندر یہ انقلاب پیدا ہوگیا تو اب باری ہے اس بات کی کہ یہی انقلاب بیرونی دنیا کے اندر بھی پیدا ہوجائے۔ یہی تبدیلی جو نبی کی روح کے اندر پیدا ہوئی ہے، یہ ایک خاص شکل اور خاص انداز میں، معاشرے کے اندر بھی پیدا ہو جائے اور یہ وہی بات ہے جس کا نام ہم نے رکھا ہے نبوت کا پیدا کردہ اجتماعی انقلاب۔

تو جس انقلاب کا ہم پیغمبر کے بارے میں تصور رکھتے ہیں، اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ آج دنیا میں لفظ انقلاب کا جو مفہوم جدید تہذیب میں رائج ہے، اس کے مطابق یہ لفظ، ایک مفہومی لفظ ہے، ایک واضح اور بامعنی لفظ ہے۔ بہت واضح ہے کہ لفظ انقلاب سے مراد، ایک تبدیلی اور معاشرے میں ایک گہرا اور بنیادی تغیّر و تبدّل ہے۔

ایک معاشرہ، فرض کر لیجیے کہ پچاس ہزار افراد یا پانچ لاکھ افراد یا پانچ کروڑ کی آبادی پر مشتمل ہو، ایک معاشرہ یعنی کچھ لوگ جو ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں ایک راہِ عمل کے ساتھ، ایک عمومی پروگرام کے تحت، اگرچہ اس میں کچھ فرق بھی ہوتا ہے، لیکن راستہ، بطورِ کلی ایک ہی ہے، اسے کہا جاتا ہے ایک معاشرہ، ایک دوسرے سے وابستہ ایک اجتماعی اکائی یہ معاشرہ جو پچاس ہزار یا پانچ لاکھ یا پچاس لاکھ یا پانچ کروڑ افراد پر مشتمل ہے، اسے ممکنہ طور پر دو طریقوں سے بنایا جا سکتا ہے (خوب غور کیجئے گا) وگرنہ ان دو کے اندر مزید انواع و اقسام بھی ہیں۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ ان پچاس ہزار یا پانچ کروڑ کی آبادی میں جو فلاں مقام پر رہ رہی ہے، لوگوں کا ایک طبقہ، لوگوں میں سے ایک اقلیت، حاکم اور غالب ہو اور ان کے ہاتھ میں باقی تمام لوگوں کے معاملات ہوں۔ لوگوں کا راستہ وہی معین کریں، لوگوں کے لیے قوانین وہی بنائیں، اگر لوگ ان کی مرضی کے خلاف کام کریں، تو سختی کے ساتھ ان سے انتقام لیں، اگر لوگ ان کی کسی بات پر اعتراض کریں، تو سختی کے ساتھ انہیں سزا دیں، اگر اس معاشرے میں کوئی واقعہ پیش آجائے تو اس واقعے کو اپنے مفاد میں لے جائیں، اگرچہ باقی لوگوں کے لیے وہ نقصاندہ ہی کیوں نہ ہو، اگر اس سوسائٹی کے لیے، ان کے لیے کوئی مشکل پیش آجائے، تو لوگوں کو اپنے لیے ڈھال بنا لیں اور خود ایک طرف ہو کر بیٹھ جائیں؛ یہ معاشرے کی ایک قسم ہے۔ ایک معاشرے کی ساخت اور بنیاد یہی ہے، چاہے اس کے اندر طبقاتی اختلاف ہو یا نہ ہو۔

اگر ہم ایک معاشرے کو فرض کریں جس کے اندر طبقاتی اختلاف موجود ہو؛ طبقاتی اختلاف کو بعض لوگ ایک پیچیدہ سا لفظ سمجھتے ہیں، لیکن یہی ہے جو عرض کیا گیا، بہت ہی سادہ ہے، آپ نے دیکھا کہ کس قدر آسان ہے طبقاتی اختلاف کا مطلب؛ طبقاتی اختلاف یعنی معاشرے کے تمام لوگ حقوق کے اعتبار سے برابر نہ ہوں، زندگی کے وسائل اور امکانات میں سب یکساں نہ ہوں، کچھ لوگ زیادہ

امکانات سے بہرہ مند ہوں، زیادہ جا سکیں، بہتر بول سکیں اور بدمعاشی کر سکیں اور جو چاہیں انجام دیں۔ اور ایک بڑی تعداد ان کی چشم و ابرو کے اشارہ کی منتظر ہو، ان کے حکم کی پابند ہو، ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہو، ان کے سامنے سجدہ ریز ہو؛ اگر کوئی معاشرہ اس طرح کا تشکیل پا جائے، تو اسے کہتے ہیں طبقاتی معاشرہ۔ ایسے معاشرے میں اقتصاد بھی طبقاتی اقتصاد ہوتا ہے؛ ایسے معاشرے میں حکومت بھی اونچے طبقات کے فائدے میں ہوتی ہے، طبقاتی ہوتی ہے؛ ایسے معاشرے میں، بنیادی حقوق بھی اونچے طبقات کے فائدے میں ہوتے ہیں۔ یہ بھی معاشرے کی ایک قسم ہے۔

پانچ ہزار سے پانچ کروڑ تک کے لوگوں کا اجتماع کبھی اس انداز کا ہوتا ہے، کبھی اس انداز کا نہیں ہوتا۔ تو کس انداز کا ہوتا ہے؟ ان پانچ کروڑ لوگوں میں سے، جو اس معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں، کوئی کسی کے ساتھ بدمعاشی نہیں کر سکتا، نہ صرف یہ کہ کوئی طبقہ دوسروں سے بالاتر نہیں ہے، بلکہ کوئی بھی! حتیٰ کہ ایک فرد بھی اس پورے معاشرے میں نہیں ملے گا کہ اگر اس سے کہا جائے کہ جناب، آپ نے یہ کام کیوں کیا؟ تو وہ کہے کہ میرا دل چاہ رہا تھا۔ اس معاشرے کے اندر میرا دل چاہ رہا تھا، نہیں ہوتا۔ کسی شخص کو کسی پر بھی تسلط، زمامداری، چوہدراہٹ، بدمعاشی، حق مارنا، چوری اور سینہ زوری کرنا؛ اور اس کے مقابلے میں، کسی شخص کے کسی دوسرے کے سامنے، ذلت، خفت، کمزور اور مظلوم واقع ہونے کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا۔ اس معاشرے کے پانچ ہزار سے پانچ کروڑ اور پچاس کروڑ تک کے تمام افراد، ایک ہی طاقت کے فرمانبردار ہوتے ہیں اور وہ طاقت، انسان اور بشر کی طاقت سے بڑھ کر ہے۔ وہ کون ہے؟ وہ خدا ہے۔ یہ بھی ایک معاشرہ ہے۔

یہ دو قسم کے معاشرے؛ ایک طبقاتی معاشرہ جس میں ظلم ہے، جور ہے، طبقاتی اختلاف ہے، استثمار (دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانا)، بدمعاشی ہے، غنڈہ گردی ہے، بےجا امتیاز ہے؛ اور دوسرا طبقاتی اختلاف سے دور معاشرہ، جس میں عدل ہے، انسانیت ہے، آزادی ہے (ایک اعتبار سے آزادی پر خصوصی زور دے رہا ہوں بعض غیر طبقاتی معاشرے جن کا آج دنیا میں چرچا ہے، اس میں آزادی کے علاوہ سب کچھ ہے، خود ان کے دعویٰ کے مطابق) طبقات کے بغیر معاشرہ جس میں رفاہ ہے اور خصوصاً آزادی ہے، اس میں کوئی کسی کا بندہ نہیں ہے، کوئی کسی کا غلام نہیں ہے، کوئی کسی کی بدمعاشی کو برداشت کرنے پر مجبور نہیں ہے؛ یہ دو قسم کے معاشرے، دونوں تاریخ میں موجود رہے ہیں۔

پہلی قسم کا معاشرہ، جس میں بے جا امتیاز پایا جاتا ہے، یہ وہ معاشرے ہیں جن کو تاریخ کے ظالموں اور جابروں اور دنیا کے قیصروں[1] اور کسراؤں[2] نے وجود دیا ہے۔ اور دوسری قسم کے معاشرے، آباد، آزاد، بے جا امتیازات سے مبرا اور انسانی معاشرے، یہ وہی معاشرے ہیں جنہیں طول تاریخ میں خدا کے انبیائے عظام نے وجود بخشا ہے۔ آپ کہیں گے کہ کیا انبیاؑ نے معاشرے تشکیل دیئے ہیں؟ جواب میں ہم کہیں گے کہ ہاں، انبیاؑ نے معاشرے تشکیل دیئے۔ قرآن میں ان معاشروں کی کئی نشانیاں موجود ہیں جو انبیاؑ نے تشکیل دیئے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کا واقعہ، حضرت طالوتؑ کا واقعہ، حضرت موسیٰؑ اور سرزمین مقدس میں ان کے آنے کا واقعہ، حضرت موسیٰؑ کا بنی اسرائیل کو باہر لے جانے کا تقاضا کرنا، انہیں کہاں لے جانا چاہتے تھے؟ انہیں لے جانا چاہتے تھے تاکہ ایک معاشرہ اور مدینہ فاضلہ (model city) کی تشکیل کریں۔

دو قسم کے معاشرے ہیں، دونوں قسمیں تاریخ میں رہی ہیں۔ اس کی بری قسم، جسے عقل برا سمجھتی ہے اور انسانیت اس کو قبیح قرار دیتی ہے، یہ ہمیشہ دنیا اور تاریخ کی دین مخالف سیاسی طاقتوں کا شاخسانہ رہا ہے؛ اس کی اچھی قسم کو ہمیشہ تاریخ کی الٰہی اور معنوی طاقتوں نے، یعنی انبیاؑ نے وجود دیا ہے۔ کسی معاشرے میں انبیاؑ آئے، تو وہ کس لیے آئے؟ وہ آئے تاکہ اس پہلی قسم کو اس دوسری قسم سے بدل دیں، یہ آج کی بحث کی روح ہے۔

غالباً انبیاؑ کے بارے میں تصور کچھ اور قسم کا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ انبیاؑ جو کسی معاشرے میں ظاہر ہوتے ہیں، وہ ایک عالم و فاضل اور حکیم و دانشمند قسم کے انسان ہوتے ہیں جو معلومات کا ایک پہاڑ ہوتے ہیں، معاشرے میں آتے ہیں، ایک گھر لیتے ہیں، کسی کونے میں بیٹھ جاتے ہیں تاکہ لوگ جوق در جوق آئیں اور ان کے علم و فضل کے خزانے سے استفادہ کریں۔ مثلاً حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ یا حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ، کسی معاشرے میں پہنچے اور ایک گھر لیا، اب وہ چھوٹا ہو یا بڑا اور عزت و آبرو والا، بیٹھ گئے وہاں اور مومنین و غیر مومنین سے ملاقات کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا، اور جو بھی ان کے پاس آئے، اسے امر بہ معروف کرتے ہیں، نہی از منکر کرتے ہیں۔ اے لوگو! خدا سے ڈرو،

---

۱. قیصر کی جمع، رومی بادشاہوں کا لقب

۲. کسریٰ کی جمع، ایرانی ساسانی بادشاہوں کا لقب

اے لوگو! خدا ہے، ان کے سامنے دلیل پیش کرتے ہیں، بحث مباحثہ کرتے ہیں، کچھ لوگوں کو انسان بنا دیتے ہیں، پھر اس دنیا سے تشریف لے جاتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ نبی اس قسم کی کوئی چیز ہے۔ نبی ایسا نہیں ہوتا۔ نبی جب کسی معاشرے میں مبعوث ہوتا ہے، یعنی بر انگیختہ ہوتا ہے اور جیسا کہ میں نے وضاحت کی کہ جب اس کے باطن اور اس کی روح کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے، یہ جب کسی معاشرے میں آتا ہے، تو ایک ایسا آدمی جو سراپا اضطراب ہوتا ہے، ایک ایسا آدمی ہے جسے سکون و قرار نہیں ہے، ایک ایسا انسان ہے جو ایک جلتا ہوا شعلۂ جوالہ بن چکا ہے، معاشرے کے اندر وہ آتا ہے، معاشرے کی حالت پر ایک نظر ڈالتا ہے، دیکھتا ہے، یہ عمارت ایک غلط عمارت ہے، یہ برے طریقے سے بنی ہے، غلط طریقے سے اس کی بنیادیں اٹھائی گئی ہیں، اس کی بنیادیں، دیواریں اور ستون غلط ہیں اور انسانی فطرت کے اسلوبِ معماری کے خلاف ہیں؛ سمجھ جاتا ہے کہ اس عمارت کو ایک اچھی عمارت میں تبدیل ہونا ہے۔ کیا مطلب؟ یعنی وہ سمجھ لیتا ہے کہ اس معاشرے کو، اس طبقاتی معاشرے کو، اس معاشرے کو جس میں بے جا امتیازات ہیں، ظلم ہے، بے نظمی ہے، بزدلی ہے، اسے تبدیل ہو جانا چاہیے ایک توحیدی معاشرے میں۔

توحیدی معاشرہ کونسا ہے جناب؟ توحید کی بحث میں عرض کیا تھا۔ اشارہ کیا تھا کہ توحید طبقات کی نفی ہے۔ توحید الٰہی کا مطلب خدا کی حکومت اور اس کی طاقت ہے؛ توحید الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز، قانون، رسم و رواج، دستور، آداب، تہذیب و ثقافت خدا کی جانب سے الہام شدہ ہونی چاہیے۔ توحیدِ الٰہی یعنی سب لوگ خدا کے بندے ہوں اور بس، کسی اور کے بندے نہ ہوں؛ بندے دوسرے بندوں کی بندگی سے آزاد ہوں۔ جب نبی معاشرے میں وارد ہوتا ہے، تو وہ اس نظریے، اس ہدف، اس سوچ کے ساتھ معاشرے میں وارد ہوتا ہے کہ اس طبقاتی معاشرے کو تبدیل کر دے گا، خاتمہ کر دے گا، تہ و بالا کر دے گا اور ایک توحیدی، طبقاتی امتیاز سے خالی، بے جا امتیازات سے عاری، ظلم سے مبرا اور پروردگارِ عالَم کی حکومت کے ماتحت ایک معاشرہ وجود میں لائے گا۔ نبی اس کام کے لیے آتا ہے۔ پیغمبر جب کسی معاشرے میں وارد ہوئے، جب انہوں نے اپنا انقلابی پیغام دیا؛ یعنی فرعون سے کہا کہ تمہیں وہاں نہیں بیٹھنا چاہیے، بنی اسرائیل پر ظلم و ستم نہیں کرنا چاہیے اور مختلف معاشرتی طبقات نہیں بنانے چاہئیں، جب یہ باتیں فرعون سے کہہ دیں، تو اگر فرعون کہہ دے کہ ٹھیک ہے، میں آپ

کی بات ماننے کے لیے تیار ہوں، یہاں سے نیچے اتر جاتا ہوں، تو پھر پیغمبر اپنے ہنر مند ہاتھوں سے معاشرے کی تعمیر شروع کر دیں اور کوئی بے نظمی پیدا نہیں ہو گی۔ انبیاؑ کے انقلابوں میں جو جنگ و جدال پیش آتا ہے، اس کے لیے خدا قرآن میں کہتا ہے: ﴿وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ﴾[۱] کتنے ہی ایسے پیغمبر ہیں جن کی ہمراہی میں بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی ہے یا اسلام میں جہاد کا حکم آتا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آسائش یافتہ طبقہ، وہ طبقہ کہ انقلاب کے تیروں کا رخ اسی کی طرف ہوتا ہے، توچونکہ اس کے بےجا امتیازات اس کے ہاتھ سے نکل رہے ہوتے ہیں، اس لیے وہ اس انقلاب پر تیار نہیں ہوتا۔ وگرنہ، اگر وہ سدھر جائے، اگر واقعاً حقیقت کو سمجھ لے، تاریخ کے بہت سے سیاسی، اقتصادی اور مالی سورماؤں کی طرح، جو یکایک اپنی روح کے اندر ایک خوبصورت اور حسین تبدیلی کے تحت، ایک عام انسان میں تبدیل ہو گئے، اگر پیغمبروں اور ان کی دعوت کا سامنا کرنے والے تمام لوگ سر تسلیم خم کر دیتے، اس اونچائی سے نیچے اتر آتے، تو پیغمبر بالکل مجبور نہ ہوتے کہ جنگ اور قتل جیسی چیزوں کا رخ کرتے۔

پس پیغمبر جو کسی معاشرے میں آتے ہیں، اس تبدیلی کے لیے آتے ہیں۔ پیغمبر آتے ہیں تا کہ تبدیلی پیدا کر دیں۔

جن معاشروں میں پیغمبر آئے ہیں، سب میں اسی دعوت کے ساتھ آئے ہیں؛ یعنی وہ آئے تا کہ معاشرے کو غلط شکل سے، ایک ناموزوں شکل سے، ایک ایسی شکل سے جو ظلم و ستم کے ساتھ ہے، ایک موزوں شکل میں، ایک خوبصورت اور عادلانہ شکل میں تبدیل کر دیں۔

البتہ بڑے انبیاؑ جنھیں انبیائے اولوالعزم کہا جاتا ہے اور ہم انہیں اسی عنوان سے پہچانتے ہیں، یہ الٰہی انقلابوں کا مرکز ہوتے تھے، اور دوسرے انبیاؑ، ان میں سے بعض آئے اور انہی کے انقلاب کی پیروی کی۔ بعض آئے اور انہی کے کام کی تکمیل کی، بعض آئے اور انہی کے کام کو نتیجے تک پہنچایا، بعض آئے تا کہ انقلاب آنے کے بعد جو رجعت ہوئی اور نتائج تک پہنچنے والے انقلاب جو پیچھے ہٹے ان میں پھر ایک نیا انقلاب بر پا کریں؛ وہی کام جو ہمارے نبی کے اوصیاء، رحلتِ پیغمبرؐ کے بعد انجام دیتے رہے؛ امیر المومنینؑ کا کام، امام حسینؑ کا کام، دوسرے اماموںؑ کے کام، امت مسلمہ کے علما کے کام اور اسی

---

۱. سورہ مبارکہ آل عمران: آیت ۱۴۶

طرح صاحب الزمان، ولی عصر عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف کا کام۔
دوسری بات، اس انقلاب کے حوالے سے جس کی جانب توجہ دینا ضروری ہے، ہم سوال کرتے ہیں کہ جناب، نظامِ جاہلی کے برقرار رہنے میں کیا حرج ہے؟ اس عادلانہ نظام کے برقرار نہ ہونے میں کیا حرج ہے؟ یہ پیغمبر جو آتے ہیں، اتنی تکلیفیں اٹھاتے ہیں، دن رات ایک کر دیتے ہیں تاکہ اس بری حالت کو اچھی اور خوبصورت حالت میں تبدیل کر دیں، کیا حرج ہے کہ یہ کام نہ کریں؟ کیا رکاوٹ ہے کہ اس کو اسی شکل میں رہنے دیں؟ وہ حالت بری کیوں ہے؟ وہ حالت غلط کیوں ہے؟ کونسا حق ہے یہاں پر جسے آپ معیار بنائیں گے، «الحَقُّ لِمَن غَلَبَ»[1]، جس نے غلبہ پا لیا، جس نے طاقت حاصل کر لی، سب اسی کا کھائیں، پئیں، عیش کریں، جو پیچھے رہ گیا، وہ جائے جہنم میں، نہ رہتا پیچھے، نہ جاتا جہنم میں، اب ہے تو جانے دو، جس طرح غارتگری کرنا چاہیں، کریں، پیغمبر کیوں اتنی تکلیف اٹھاتا ہے؟ کیوں؟
ممکن ہے کہ آپ کہیں کہ کوئی یہ سوال نہیں کرتا، جی ہاں! زبان سے کوئی شخص یہ سوال نہیں کرتا، لیکن خرابیوں کے مقابلے میں اکثر لوگ جو نبوی حالت میں نہیں ہوتے، ان کی روحوں کے باطن میں یہ سوال موجود ہے اور اس کا جواب نہیں دیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے، پیغمبر بلاوجہ حرکت نہیں کرتا، پیغمبر بلاسبب جدوجہد نہیں کرتا؛ وہ اپنے موجودہ زمانے کی جو حالت دیکھتا ہے، وہ حالت، باطل اور انسانی و جہانی فطرت کے برخلاف ہے، جو کام وہ کرنا چاہتا ہے، حق کی حالت، یعنی جہانی و انسانی فطرت سے مطابقت رکھنے والی حالت ہے۔
حق و باطل، یہ دو لفظ جنہیں آپ پورے قرآن میں بہت زیادہ دیکھتے ہیں؛ حق و باطل کے درمیان صف آرائی قرآن کی دسیوں آیتوں میں مجسم و مشخص ہے۔ حق و باطل سے کیا مراد ہے؟ یہاں ایک بات جو حق و باطل کی وضاحت ہے کہ جناب، انسان نامی یہ ذات جو اس شکل میں، اس ہیئت کے اندر دنیا میں چل پھر رہی ہے، اسے بعض خصوصیات کے ساتھ بنایا اور ڈھالا گیا ہے۔ انسان کی چند خصوصیات ہیں، اس کے پاس کچھ امکانات ہیں، کچھ اس کی ضروریات ہیں، مختصر یہ کہ ایک ایسی ذات ہے جو چند خصوصیات اور مخصوص وسائل و امکانات کے ساتھ وجود میں آئی ہے۔ اس بات کو یہاں تک رکھیں۔ یہ دنیا جس میں انسان زندگی بسر کرتا ہے، یہ بھی بعض شرائط اور بعض خصوصیات کے ساتھ، ایک

---

۱. حق اس کے لیے ہے جو غالب آجائے۔

حرکت اور ایک خاص سمت میں حرکت کے ساتھ بنائی گئی ہے۔ یہ کائنات جسے آپ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اس کی ہر چیز آپ کو ایک کونے میں پڑی ہوئی نظر آتی ہے؛ اس کے سورج کا فاصلہ فلاں سیارے سے لاکھوں فرسخ کا ہے، بظاہر انسان کا سبزے کے ساتھ، جانوروں کے ساتھ، آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن ایک خدا پرست اور خدا شناس کی نگاہ میں یہ سب چیزیں ایک وحدت لاینفکّ (باہم پیوستہ) ہیں۔ یہ پوری کائنات ایک چیز ہے، اس کائنات کے اجزا ایک پیکر کے اجزا ہیں، جس طرح سے ایک پیکر کے تمام اجزا میں حرکت ایک ہی جیسی ہوتی ہے، اس کائنات میں بھی ایسا ہی ہے۔ ایک انسان کے اندر، معدہ ایک کام کرتا ہے، آنکھ ایک کام کرتی ہے، جگر ایک کام کرتا ہے، مغز و اعصاب ایک کام کرتے ہیں، لیکن ان سب کا حاصل جمع ایک واحد اور مشترک چیز ہے اور وہ کیا ہے؟ وہ اس انسان کا زندہ رہنا، اس انسان کا کوشش کرنا، اس انسان کا زندگی کو جاری رکھنا ہے۔ اس کائنات میں جو حرکات آپ مشاہدہ کر رہے ہیں، اوپر سے نیچے تک اور اِس سیارے سے اُس سیارے تک، ان کا حاصل جمع بھی، ایک ہی چیز بنے گا، ایک ہی حرکت بنے گی۔ انسان کے علاوہ کائنات کی دوسری چیزیں انسان کے علاوہ تمام موجودات، چونکہ بےشعور ہیں، چونکہ بےارادہ و بےاختیار ہیں، نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس راستے پر، اس عمومی حرکت کے ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ انسان ہے جس کے پاس اختیار ہے، انسان ہے جو مخالفت کر سکتا ہے اور اشیائے عالَم کے اس قافلے سے خود کو جدا کر سکتا ہے اور بر عکس حرکت کر سکتا ہے۔ فقط انسان ہے جو کائنات کے اس قافلے کے ساتھ چلنے اور آگے بڑھنے سے انکار کر سکتا ہے، جس قافلے کے لیے ہم نے عرض کیا کہ اس کا ایک ہی رخ ہے۔ فقط انسان ہے۔ باقی چیزیں، جو کبھی اپنے قدرتی راستے سے نکل جاتی ہیں تو ان کو بھی انسان ہی نکالتا ہے۔ اگر یورینیم کو توڑیں اور بجائے اس کے کہ اسے ہزاروں تکلیفوں کے مداوا کے لیے استعمال کریں، ایٹم بم بنائیں اور اسے گرا کر لاکھوں انسان قتل کر دیں تو یہ کام بھی انسان ہی کرتا ہے؛ خود یورینیم کائنات کے اس قدرتی راستے سے کبھی تجاوز نہیں کرتا، وہ اسی عام راستے پر حرکت کرتا رہتا ہے۔

چونکہ انسان اس خصوصیت کا مالک ہے، اختیار رکھتا ہے، ارادہ رکھتا ہے، اپنا راستہ بدل سکتا ہے، چونکہ ایسا ہے، اس لیے ضروری ہے اس کے لیے کوئی قانون معین ہو جائے، اس کے لیے چلنے کا راستہ مشخص ہو جائے، اس سے کہہ دیا جائے کہ جناب آپ کو اس راستے پر چلنا ہے تاکہ آپ اس قافلے کے ساتھ

چل سکیں۔ اگر آپ نے اس راستے سے تجاوز کیا، یہ نقشہ جو آپ کے لیے بنایا گیا ہے،اس سے نکل گئے، تو جان لیجیے کہ آپ اس قافلے کے راستے سے نکل گئے ہیں۔ کیا مطلب؟ یعنی اس انسان کے لیے قانون ضروری ہے۔ وہ قانون جس کے مطابق موجوداتِ عالَم کی اجتماعی حرکت کا راستہ طے ہو رہا ہے، اس قانون کا نام کیا ہے؟ حق۔ یہی حق ہے۔ حق یعنی وہ قانون جو کائنات کی سرشت کے ساتھ مربوط ہے، اور چونکہ کائنات اور عالَم کی سرشت کے ساتھ مربوط ہے، اس لیے انسان کی سرشت کے ساتھ بھی مربوط ہے؛ کیونکہ انسان بھی تو اسی دنیا کا ایک جز ہے۔ کیونکہ انسان بھی اس عظیم پیکر کے اجزاء میں سے ایک جز ہے، چونکہ ایسا ہے، چونکہ یہ قانون انسان اور کائنات کی فطرت کے ساتھ مربوط ہے، لہٰذا یہ اس کی خیر و صلاح کے لیے نتیجہ بخش ہو گا۔

باطل کیا ہے؟ باطل وہ راستہ، وہ قانون، وہ راہ و رسم ہے جو کائنات کی فطرت اور انسان کی سرشت کے برخلاف بنا ہو اور انجام پایا ہو۔ باطل وہ ہے جسے بدمعاشوں نے، شیطانوں نے اور ان لوگوں نے بنایا ہے جو راستے سے منحرف ہو نا چاہتے ہیں۔ انبیاؑ ہمیشہ حق لے کر آتے ہیں تا کہ باطل نابود ہو جائے۔ جو معاشرہ فرعون بناتا ہے، وہ لوگوں کو چند طبقات میں تقسیم کر دیتا ہے، ان میں سے ایک طبقے پر سختیاں کرتا ہے، یا ایک طبقے کو آسائشوں میں رکھتا ہے اور دوسروں پر ظلم و ستم ڈھاتا ہے۔ وہ حالت، وہ نظام، وہ قوانین اور معاشرے کی وہ شکل، ایک باطل شکل ہے۔ انبیاؑ آئے تا کہ اس باطل شکل کو الٹ دیں۔ وہ آئے تا کہ اس کو تتر بتر کر دیں، ختم کر دیں، اس کی جگہ حق کو لے آئیں۔ پس یہ جو نبی دن رات جدوجہد کرتا ہے، یہ حق کی خاطر ہے، کیونکہ حق وہ چیز ہے جو وہ کہتا ہے اور جسے چاہتا ہے، جس کی خاطر وہ اس قدر پریشان رہتا ہے اور مشکلات اٹھاتا ہے۔ باطل کی جگہ حق کو دینے کے لیے ہی انبیاؑ ایک لمحے کے لیے بھی جدوجہد کو ترک نہیں کرتے ہیں، بھلاتے نہیں ہیں، ایک لمحے کے لیے بے کار نہیں بیٹھتے اور آرام نہیں کرتے۔ باطل کی جگہ حق کو رکھنے کے معاملے کی تفسیر اور تحلیل انبیاؑ کا کام ہے۔

سورۂ قصص میں یہی صورتحال بیان ہو رہی ہے۔ فرعونی حکومت اور فرعونی معاشرے کی جاہلی حالت اور اس صورتحال کا بیان جسے حضرت موسیٰؑ اس فرعونی حالت کی جگہ لانا چاہتے تھے۔ ان دو حالتوں کو ایک دوسرے کے سامنے واضح کرنے کے ساتھ ہی، ایک نوید ان لوگوں کو دی جا رہی ہے جو موسوی حالت کی تلاش میں حرکت کر رہے ہیں۔ نوید دی جارہی ہے کہ پروردگار کا ارادہ اسی بات پر ہے کہ

دنیا کے موسوی، دنیا کے توحیدی اور دنیا کے الٰہی لوگ ہی آخرکار کامیاب ہوں گے۔

﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ۔ طسم﴾[۱] یہ سورہ کا پہلا رمز ہے، ابھی ہمیں اس سے کوئی کام نہیں ہے۔ ﴿تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ﴾ یہ کتاب مبین کی آیات ہیں۔ ﴿نَتْلُو عَلَيْكَ مِن نَّبَإِ مُوسَىٰ وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ﴾ ہم اہل ایمان کے فائدہ کے لیے موسیٰ و فرعون کی کچھ خبریں سچائی کے ساتھ آپ کے سامنے پڑھ کر سناتے ہیں۔ اس اہم واقعے کا کچھ حصہ بیان ہوتا ہے۔ قرآن کی روش یہ ہے کہ کسی پیغمبر کے واقعے کا جو حصہ قرآن نقل کرتا ہے، واقعے کے جس پہلو سے وہ اسے دیکھتا ہے، ایک خاص مقصد مدّ ِنظر ہوتا ہے، جس کی خاطر وہ اس واقعے کے ایک خاص حصے کو نقل کرنے کے لیے منتخب کرتا ہے۔یہاں ایک بہت مختصر حصے کو ذکر کرتا ہے، اس لیے کہ ایک خاص مقصد مدِنظر ہے اور وہ باطل پر حق کے غلبے کا مسئلہ ہے۔ البتہ اس واقعے کے ان حصوں کا ذکر آج کی بحث میں نہیں ہوگا۔

موسیٰ اور فرعون کے اہم واقعے کے ایک حصے کو ہم آپ کے سامنے پڑھتے ہیں ﴿بِالْحَقِّ﴾ حق کے مطابق، حقیقت کے مطابق، افسانوی باتوں سے دور، ﴿لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ ایمان لانے والے لوگوں کے فائدے کے لیے، یہ جو ہم تمہیں بتا رہے ہیں اور تلاوت کر رہے ہیں، بےفائدہ اور کم اثر چیز نہیں ہے، بلکہ جو مومنین آپ پر ایمان لائے ہیں، ان کے لیے بہت موثر اور مفید ہے۔ جب وہ اس واقعے کو اس نظریے کے ساتھ سنیں گے اور اس حوالے سے سنتِ الٰہی کو سمجھ لیں گے، تو اپنا راستہ مشخص اور معین کر لیں گے۔ بات کا خلاصہ یہ ہے کہ ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ﴾ بے شک فرعون زمین (مصر) میں سرکش ہو گیا تھا، فرعون نے زمین پر برتری حاصل کی، اپنے لیے بزرگی کا طالب ہوا، عُلُوّ حاصل کیا۔ کیا مطلب عُلُوّ حاصل کیا؟ انسانوں کی اس برابر کی سطح سے یکایک بلند ہو گیا، بیٹھ گیا اس تخت پر، اپنے آپ کو دوسروں سے بالاتر کر لیا۔ سب برابر تھے، سب ایک سطح پر تھے، اس نے دوسرے بندوں پر برتری حاصل کرلی۔

﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ﴾ روئے زمین پر اپنے لیے برتری اور بزرگی کا انتخاب کر لیا، ﴿وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا﴾ اور اس کے باشندوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا، اپنے آپ کو اونچے درجے پر کر لیا اور اہل زمین کی تقسیم بندی کردی، طبقہ بندی کر دی، گروہوں میں بانٹ دیا۔ کچھ لوگوں کو خود

---

۱. سورہ مبارکہ قصص: آیات ۱ سے ٦

سے زیادہ نزدیک کر لیا، ہامانوں کا طبقہ اور اس جیسے دوسرے طبقات، ایک طبقہ اس سے نیچے، ایک اور طبقہ اس سے بھی زیادہ نیچے، اپنے فرعونی معاشرے کے اندر اور خدا کی زمین کے اوپر طبقات بنا دیئے۔ ﴿يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ﴾ اور اس نے ان میں سے ایک گروہ کو کمزور بنا رکھا تھا، معاشرے کو مختلف طبقات اور گروہوں میں بانٹنے کے علاوہ، خصوصی طور پر ایک طبقے کے اوپر زیادہ دباؤ ڈالا، ﴿يَسْتَضْعِفُ﴾ ان میں سے ایک گروہ کو مستضعف بنا دیتا تھا۔

انہیں کمزوری کے جال میں جکڑے رکھا، معاشرے میں ان سے وسائل چھین لیے، ان سے طاقت چھین لی، انہیں کمزور کر دیا اور کمزوری میں اور دباؤ میں رکھا۔

اور اس کا دباؤ یہ تھا کہ ﴿يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ﴾ ان کے جوانوں کو قتل کر دیتا تھا۔ ان کی جوان نسل کو بڑھنے نہیں دیتا تھا، محسوس کرتا تھا کہ معاشرے میں ایک حرکت ایک ہیجان موجود ہے اور جانتا تھا کہ اس حرکت اور اس ہیجان کو جو چیز نتیجے تک پہنچا سکتی ہے، وہ نوجوان نسل ہے۔ چونکہ اُس دور میں اور اس زمانے کے اجتماعی حالات میں، عورتیں ان مسائل میں اور اجتماعی مسائل میں شاید کوئی مداخلت نہیں کرتی تھیں اور یہ بوجھ لڑکوں کے دوش پر ہوتا تھا، اس لیے زیادہ دباؤ لڑکوں پر ہی تھا۔

﴿وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ﴾ اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا، یا اس لیے کہ انہیں فاسد بنا دے، یا اس لیے کہ ان کی نسل کو فحاشی کی طرف لے جائے یا اس لیے کہ ان کے نسب کی پاکیزگی کو ختم کر دے؛ یعنی بظاہر بنی اسرائیل کی لڑکیاں ان کے لڑکوں سے شادیاں نہیں کرتی تھیں، وہ چاہتا تھا کہ کوئی جوان نہ بچے، لڑکیاں ہوں تاکہ نسل مخلوط ہو جائے اور بنی اسرائیل فرعونی معاشرے کے اندر ضم ہو جائیں، مصر کے معاشرے کے اندر ضم ہو جائیں، گھل مل جائیں، ختم ہو جائیں۔ چونکہ بنی اسرائیل نے چار سو سال تک اس خراب اور برے فرعونی معاشرے میں استقامت دکھائی اور اپنے عظیم نظریات کو زندہ رکھا تھا۔

تو ان دو گروہوں کی محاذ آرائی میں، ایک طرف سے فرعون کی یہ حالت ہے کہ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ﴾ بے شک و یقیناً وہ مفسدوں اور فساد پھیلانے والوں میں سے تھا۔ فطرت میں فساد ڈالتا تھا، معاشرے میں فساد پیدا کرتا تھا، دنیا میں فساد ایجاد کرتا تھا۔

اب اس کے مقابلے میں حق کا سلسلہ کیا ہے؟ خدا کا ارادہ اور سنتِ الٰہی کس رخ پر ہوتی ہے؟

﴿وَنُرِيدُ﴾ اور ہم چاہتے ہیں، یعنی ہماری سنت اور ہمارا تکوینی ارادہ یہ ہے، ﴿وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ﴾ یہ نہیں کہتا کہ «وَ أَرَدْنَا» اس وقت ہم نے بنی اسرائیل کے بارے میں یہ ارادہ کیا، نہیں، ہمیشہ کے لیے ہے، تاریخ کے ہر دور کے لیے۔ ہم نے چاہا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں انہی مستضعفین پر، اسی طبقے پر جو پنجۂ قہر اور ضعف و کمزوری کے چنگل میں اسیر ہے، ان پر ہم احسان کرنا چاہتے ہیں اور انہیں اس پستی سے نجات دلانا چاہتے ہیں، استضعاف سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ﴿وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ﴾ زمین کے مستضعفوں پر احسان کریں، ﴿وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً﴾ انہیں معاشرے کے پیچھے پیچھے چلنے اور تابع ہونے سے، سرداری اور متبوع ہونے کے مقام تک پہنچا دیں، زمین کے مستضعفوں کو دنیا پر، ظلم ڈھانے والے طاقتوروں پر غلبہ دے دیں۔ ﴿وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ﴾ اور انہیں زمین کی اچھائیوں کا وارث اور میراث پانے والا قرار دیں؛ یہ بھی ہمارا ارادہ ہے۔

﴿وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ انہیں زمین پر تمکن اور قرار عطا کریں، ﴿وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا﴾ اور فرعون اور ہامان کو دکھا دیں۔ یہ ایک طبقے کے نمائندے ہیں، اگرچہ فرعون اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہے، لیکن چونکہ اونچے طبقے کا برجستہ شخص ہے، اس لیے اس ممتاز طبقے کی ایک مثال ہے کہ ہامان بھی اسی کا ما تحت ہے، اس کا ایجنٹ بنا ہوا ہے۔ اور ہامان، ایک دوسرے طبقے کا سمبل اور نمائندہ ہے، وہ طبقہ جو اپنے تمام وسائل اور طاقت کو فرعون کی خدمت میں دے دیتا ہے، وہی جس کو قرآنی تعبیرات میں گویا مَلا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ﴿وَجُنُودَهُمَا﴾ اور ان کے سپاہی، وہ لوگ جو ان کے لیے کام کرتے ہیں، ان سے کوئی فائدہ اٹھائے بغیر، لیکن بہرحال ان کی خدمت کرتے ہیں۔ دکھا دیں انہیں، ﴿مِنْهُمْ﴾ ان مستضعفوں میں سے، ﴿مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ﴾ وہ چیز جس سے وہ ڈرتے تھے۔ وہی چیز جس سے فرعون ڈرتا تھا، اسی میں اسے مبتلا کردیں۔ یہ ہے ارادۂ پروردگار۔

نبوت کے اہداف و مقاصد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾

(سورہ حدید/۲۵)

نبوت کے حوالے سے بحث کا سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ نبی جو کہ خدا کی جانب سے برانگیختہ اور مبعوث ہوا ہوتا ہے، جب کسی اجتماع میں وارد ہوتا ہے، اس اجتماع کے اندر اپنے باطن کی طرح ایک انقلاب برپا کردیتا ہے۔ معاشرے کے اندر بھی تغیر و تبدل پیدا کر دیتا ہے۔ آج یہ بات سمجھتے ہیں کہ تغیر و تبدل پیدا کرنے سے مراد کیا ہے؟ بطورِ کلی انبیائے الٰہی کی تمام سرگرمیوں کا مقصد کیا ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کو جاننا بعض اعتبار سے مفید بلکہ ضروری ہے کہ پیغمبر کس ہدف کے تعاقب میں ہوتے ہیں؟ کس مقصود اور کس مطلوب کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں؟

پیغمبر کا پہلا ہدف، پیغمبر کا اصلی ہدف ایک چیز ہے، اس ہدف کے درمیان، چند دوسرے اہداف بھی پیغمبر کے سامنے آجاتے ہیں اور ان دوسرے اہداف کے درمیان، ایک ہدف سب سے زیادہ اہم اور پیغمبر کے لیے سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ تو انبیائے الٰہی کا اصلی اور پہلا ہدف، عام طور پر چند الفاظ میں خلاصہ کیے جانے کے قابل ہے؛ انبیاً اس دنیا میں آئے تاکہ انسان کو اس کے تکامل اور بلندی پر پہنچا دیں۔ انسان، جو کہ زبردست صلاحیتوں، قوتوں اور توانائیوں کا مالک ہے، وہ جس مقام پر ہے، کچھ اس سے بڑھ کر، بلند تر مرتبے پر پہنچ سکتا ہے۔

بنیادی طور پر انسان پیدائش کے آغاز سے ہی، اپنی دنیاوی تکوین کے آغاز سے ہی، ہمیشہ کامل ہو رہا ہوتا ہے، ہمیشہ ترقی کرنے اور تکامل پانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ انسان کے ظاہری بدن اور جسم کے اندر آپ اس بات کا بخوبی مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک نومولود بچہ، ایک مکمل انسان کی متعدد خصوصیات سے محروم ہوتا ہے۔ دانتوں سے محروم ہوتا ہے، طاقتور ہاتھوں سے محروم ہوتا ہے، مضبوط جبڑے سے بھی محروم ہوتا ہے، ایسے پاؤں سے بھی محروم ہوتا ہے جن سے وہ دوڑ سکے، اندرونی اعضا جیسے ہاضمے وغیرہ سے محروم ہوتا ہے کہ ایک عام اور بڑے آدمی کی طرح اپنی زندگی کو گزار سکے، مغز اور اعصاب کے طاقتور سسٹم سے محروم ہوتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد، یہ سب اس کے لیے وجود میں آجاتے ہیں۔ طاقتور نہیں تھا، بعد میں طاقتور ہو جاتا ہے، عقلمند نہیں تھا، بعد میں صاحبِ عقل ہو جاتا ہے، با تجربہ نہیں تھا، پھر تجربہ کار بن جاتا ہے، اسی طرح کی اور چیزیں۔

انسان کے ظاہری جسم کے معاملے میں، جیسا کہ آپ اب اچھی طرح متوجہ ہو گئے ہیں اور تصدیق کر رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ انسان ہمیشہ کامل ہو رہا ہے؛ یعنی ان چیزوں کی فراہمی میں اور حصول میں مصروف ہے جو اس کے لیے پہلے سے فراہم اور حاصل نہیں تھیں۔ انسان کے معنوی اور روحانی مسائل میں بھی معاملہ بالکل اسی طرح سے ہے۔ استعداد کی ایک دنیا اس کے اندر پوشیدہ ہے، انسان کو ایک بہت گہری اور بھری ہوئی کان (mine) سے تشبیہ دی جا سکتی ہے کہ جب اس کان کو آپ کھودیں گے تو اس میں بہت سی چیزیں دیکھیں گے، جب تک باہر نہیں نکالیں گے، وہ ایک ایسی چیز اور ایسی زمین ہے جو خشک اور غیر آباد ہے، جس میں زندگی کا کوئی خوبصورت جلوہ نہیں ہے۔

یہی بچہ جسے آپ دیکھ رہے ہیں، ایک بھری ہوئی کان (mine) ہے، اس کے اندر لطافت چھپی ہوئی ہے، خوبصورتی کے جلوے موجود ہیں اور انسان کی صلاحیتیں ہیں؛ وہی جسے قدیم شاعرانہ زبان میں اس طرح کہا گیا ہے:

طیران مرغ دیدی، تو ز پای بند شہوت

بہ در آی تا بینی، طیران آدمیت[1]

وہی چیز جسے شعر، غیر شعر، عارفانہ و دیگر زبانوں میں ہمیں قدیم زمانے سے بتایا گیا ہے اور درست

---

۱. پرندے کی پرواز تو تم نے دیکھ لی، اب تم خواہشات کی قید سے نکلو تو انسان کی پرواز بھی دیکھ لو گے۔ شیخ سعدی

اور صحیح بھی ہے۔ بتایا ہے کہ انسانی جلوے، انسان کو فرشتوں سے زیادہ بلند کر دیتے ہیں، انسان کو خوبیوں، خوبصورتیوں، ظاہری صلاحیتوں اور جالب و جاذب طاقتوں کا جوش مارتا چشمہ بنا دیتے ہیں، یعنی کامل انسان، درست انسان، تکامل اور بلندی پر پہنچا ہوا انسان بنا دیتے ہیں۔ انبیاؑ کا حقیقی ہدف یہی ہے کہ انسانوں کو ایسا بنا دیں، وہی جس کو قرآنی تعبیر میں تزکیہ اور تعلیم کا نام دیا گیا ہے۔ انسانوں کو بری صفات سے پاکیزہ کر دیں، ہوا و ہوس سے دور کر دیں، حیوانوں جیسی درندگی آمیز زندگی سے نجات دلا دیں۔

انبیاؑ انسانوں کو پاکیزہ کرنے کے لیے آتے ہیں۔ آپ انبیاؑ کی دعوت میں درندگی کا اثر ذرہ برابر نہیں دیکھیں گے، نبوت کی زندگی کے سائے میں آپ حیوانی اور وحشیانہ زندگی کا ایک معمولی سا جلوہ بھی مشاہدہ نہیں کریں گے۔ وہاں جو کچھ ہے، خلوص اور انسانیت کا نور ہے اور یہ نبوت کا بڑا معجزہ اور عظیم ہنر ہے۔ لوگ نبوت کا معجزہ دیکھنے کے لیے غیر معمولی کاموں کو دیکھنا چاہتے ہیں، ایسے کام جو عموماً قدرتی و طبیعی طور پر انجام نہیں پاتے، مثلاً فلاں دیوار یا فلاں چیز کا شگافتہ ہو جانا یا درخت کا آجانا، ٹھیک ہے، وہ بھی ہو، کوئی حرج نہیں، لیکن نبوت کا بڑا معجزہ اچھے اور فضائل سے آراستہ انسان بنانا ہے؛ یہ نبوتوں کا سب سے بڑا معجزہ ہے، مذاق نہیں ہے۔

جب انسان نظر ڈالتا ہے تو دیکھتا ہے کہ جن لوگوں کی ذات کے اندر ہر قسم کے ظلم اور برائی کا تقاضا موجود ہے، جب وہ دعوتِ اسلام کی پالش کی مشین کے نیچے آتے ہیں، وہ مشین جسے پیغمبر چلاتے ہیں، جب وہ مشین ان کے اوپر سے گزرتی ہے، یکایک انسان دیکھتا ہے کہ وہی کل کا وحشی، وہی کل کا سنگدل قاتل، وہی کل کا ناتراشیدہ اور جاہل آدمی جسے آپ کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے، وہ ایک بہت عظیم انسان بن جاتا ہے۔

ابوذر ایک ایسے آدمی تھے کہ ان جیسے دس ہزار آپ کے سامنے ہوں، اور وہ دس کے دس ہزار ایک زلزلے میں آپ کے سامنے ہلاک ہو جائیں، تو آپ کے لیے کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ جو آدمی نہ سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے، نہ انسانی لطافت کا کوئی ذرہ بھی اس کے اندر ہے، نیک بننے کی ذرہ برابر خواہش بھی اس کے اندر نہیں ہے، ننگے پیر، گندا، درشت مزاج، جنگل بیابان میں پلنے والا؛ ایک ایسا آدمی آپ کے سامنے آجائے، آپ نہیں، ہر بڑا مصلح، ہر عظیم انسان، اس قسم کے آدمی کے لیے کتنی

ہمدردی دکھائے گا؟ دنیا کے بڑے بڑے مصلح، جو اپنے آپ کو مصلح اور بڑا مُصلِح سمجھتے ہیں، ان سے اچھے آدمیوں پر بھی نالہ و فریاد کرتے ہیں کہ ہماری قدر نہیں پہچانی، ہمیں نہیں پہچانا، ہمیں نہیں سمجھا۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ لوگ ان کے گرد پروانہ وار چکر لگائیں، ان پر صدقہ واری جائیں، کس لیے؟ کہ انہوں نے اپنے انسانی عہد و پیمان اور ذمہ داری کو تھوڑا بہت ادا کیا یا نہیں کیا، کہ یہ بھی ایک سوال ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے سامنے جب اُس قماش کے لوگ آتے ہیں، تو یہ ان کے لیے معمولی سی بھی اہمیت کے قائل نہیں ہوتے۔

پیغمبر اکرمؐ اسی سیاہ پتھر کو، اسی سنگِ ناتراشیدہ کو، جس کا نام ابوذر ہے، اسے لے آتے ہیں وحی و دعوت کی پالش کے نیچے، اسے ایک ایسا انسان بنا دیتے ہیں کہ انسانی فضیلتوں میں سے کوئی فضیلت ایسی نہیں ہے جس کی علامت اس کے اندر نہ پائی جاتی ہو؛ پیغمبر کا عظیم معجزہ یہی ہے۔ اسے ایسا انسان بنا دیتے ہیں جس کی «میں» «وہ» میں تبدیل ہوگئی ہے، «میں» جو عام آدمی کی تمام کوششوں کا محور ہے، اس «میں» کی ہر چیز، ہدف کی راہ میں ضم ہوگئی، تبدیل ہوگئی، فدا ہو گئی، قربان ہوگئی، آپ اس قسم کا آدمی ڈھونڈ سکتے ہیں؟ ہم ہر چیز کو اپنے لیے چاہتے ہیں، یا اس کے لیے جو ہم سے وابستہ ہو؛ اپنی دکان کے لیے، اپنے عہدے و عنوان کے لیے، اپنے بچوں کے لیے، اپنی نیک نامی کے لیے، آخر کار ہماری طرف ہی پلٹے گا۔ ابوذر تمام ان چیزوں کو جو ان سے مربوط ہیں، فدا کر دیتے ہیں خدا کے لیے، ہدف کے لیے، اس سمت میں جس سمت میں وہ چل رہے ہیں۔ اُس قسم کا انسان، تبدیل ہو جاتا ہے اِس قسم کے انسان میں۔ یہ کام کون کر رہا ہے؟ وحیِ نبوت، دعوتِ نبوت، کالے اور سیاہ پتھروں کو ہموار اور چمکتے آئینے بنا دیتی ہے اور یہ نبوت کا ہدف ہے، یعنی انسان بنانا۔

درست ہے کہ صحیح نظام کی تشکیل، درست ہے کہ ایک فلاحی نظام کی تشکیل، ایک آزاد اور آباد نظام، بہت دلکش چیز ہے، لیکن مجھے یہ بتائیں کہ ایک آباد، آزاد اور فلاحی نظام بن گیا، جس میں عدالتِ اجتماعی بھی ہے اور طبقے بھی نہیں ہیں، تمام انسان اس نئے، دلکش اور اچھے معاشرے میں زندگی گزارنے لگے ہیں، کسی لیے؟ اس کے بعد کیا ہو گا؟ پھر کیا کرنا ہے؟ مادی مکاتب نے آئیڈیل معاشرے تک پہنچ جانے کے بعد انسان اور انسانیت کے لیے، کس ہدف کو مدِ نظر رکھا ہے؟ انسانیت کا ہدف کیا ہے؟ انسان قربانی دیں، ایثار کریں، کوشش کریں، جدوجہد کریں تا کہ اس دنیا میں آباد گھر بن جائے،

تو اَب بنا لیا ہے، پھر کیا ہو گا؟

مادی مکتب کہتے ہیں کہ دنیا کو آباد کریں، غربت کا خاتمہ کریں، جہالت کو ختم کریں، عظیم معاشرہ بنائیں، انسانی معاشرہ بنائیں، ایسا معاشرہ جس میں ظلم نہ ہو، طبقات نہ ہوں، استثمار (دوسرے کی محنت سے بے جا فائدہ اٹھانا) نہ ہو، بے جا امتیاز نہ ہو، ٹھیک ہے ایسا معاشرہ بن گیا اب انسان اس معاشرے میں رہ کر کیا کرے گا؟ کوئی جواب نہیں ہے ان کے پاس۔ اس معاشرے میں انسان کہاں پہنچنا چاہتا ہے؟ کوئی جواب نہیں ہے۔ کھائے گا اور پیے گا؟ آرام سے زندگی گزارے گا، بس اتنا ہی؟ انسان صرف آرام بھری زندگی کے لیے، یعنی آرام کے حصول کے لیے، آرام سے کھانے کے لیے محنت کرے اور اس کا ہدف بس یہی ہو؟ یہ وہ مقام ہے جہاں مادی مکتبوں کے ڈھول کا پول کھل جاتا ہے۔

الٰہی مکاتب کہتے ہیں کہ نہیں، ہدف اس کے بعد ہے۔ بلند ہدف، انسان کا آراستہ و پیراستہ ہونا ہے؛ بلند ہدف، بنی آدم کا انسان ہونا ہے۔ بنی آدم انسان سے ہٹ کر ہے، بنی آدم یہی ذات ہے جو دو پیروں پر چلتی ہے، ان سب بلند بانگ دعووں کے ساتھ، یہ بنی آدم ہے، لیکن انسان ہونا یعنی اس کے وجود میں موجود تمام فضائل اور استعداد کے سرچشمے ظہور پذیر ہوجائیں۔ آپ کہیں گے پھر کیا ہو گا؟ میں عرض کروں گا، اس کے بعد پھر کی بات ہی نہیں ہے، انسان لامحدود ہے، قدرت خدا کے برابر لامحدود ہے، پھر کی بات ہی نہیں ہے۔ ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾[1] جب انسان تکامل کی راہ پر گامزن ہوگیا، پھر کوئی اختتام نہیں ہے، یہ ہے خدا پرستوں کا نظریہ اور دنیا کے موحِّدوں اور ادیانِ عالَم کی سوچ۔ اسی طرح سے ترقی جاری ہے، ہمیشہ ترقی ہے، دائماً عروج ہے، دائماً تکامل اور بلندی ہے، کوئی اختتام نہیں ہے اور انبیاؑ اسی لیے آتے ہیں۔

انبیاؑ آئے تاکہ انسانوں کو برائیوں سے، پستیوں سے، جہالتوں سے، اخلاقی رذالتوں سے، اندرونی استعدادوں کے پوشیدہ رہ جانے سے باہر نکالیں، نجات دلائیں، انہیں انسانِ کامل اور متعالی بنائیں، یہ انبیاؑ کا پہلا ہدف ہے۔ اسی لیے قرآن میں چند مقامات پر آیا ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾[2] اللہ نے ہمیشہ اہل ایمان پر یہ بہت بڑا احسان کیا ہے، ﴿إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ﴾ کہ ان میں انہی میں

---

۱. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۱۵۶

۲. سورہ مبارکہ آل عمران: آیت ۱۶۴

سے ایک پیغمبر بھیجا، ﴿يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ جو ان پر خدا کی آیات کی تلاوت کرے اور ان کا تزکیہ کرے، پاک و پاکیزہ بنائے، ﴿وَيُعَلِّمُهُمْ﴾ اور انہیں تعلیم دے۔ پیراستہ کرنا، آراستہ کرنا، رذالتوں سے پاک کرنا، انسانی فضیلتوں سے آراستہ کرنا، یہ انبیاؑ کا ہدف ہے۔ اس لیے آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے نبیؐ نے فرمایا: «بُعِثتُ لِاُتَمِّمَ مَکارِمَ الاخلاق»[1] میں مبعوث ہوا ہوں تاکہ مکارمِ اخلاق کو، اچھے اخلاق کو، خوب صورت اخلاق کو مکمل کروں۔ یہ پہلی بات ہے۔

لیکن اس سے زیادہ اہم دوسری بات ہے۔ پہلی بات، وہ بات ہے جس کا چرچا زیادہ ہے، بعض لوگوں کو بہت پسند ہے کہ یہ بات بار بار دہرائی جائے؛ اس لئے کہ اگر مسئلہ، برائی سے بچاؤ کا ہے، صرف تہذیب و تزکیہ کا ہے، تو ایک صاحب کہیں گے جناب، ہم نے راستہ ڈھونڈ لیا ہے، ہم سمجھ گئے ہیں کہ کہاں جانا ہے، اجتماع کے شور شرابے کو چھوڑ دو اور بہتّر (۷۲) فرقوں کی باتیں رہنے دو[2]، چلے جائیں گے کسی خانقاہ کے اندر، رہبانیت اختیار کر لیں گے، وہاں جا کر نفس کی تہذیب و تزکیہ میں مشغول ہو جائیں گے، اور خود ہی کو نجات دیتے رہیں گے۔ اگر ممکن ہوا، کوئی آگیا، اس قابل بھی ہوا، تو اس کے ساتھ بھی سرگوشی کرلیں گے اور اسے بھی خود سے بےخود کردیں گے، اسے بھی انسان بنادیں گے۔

یہ بات، اسی اعتبار سے کہ، ایک بہانہ بن جائے سستی کا، نارسائی کا، جان بچانے کا، عافیت طلبی کا، آسانیوں کے حصول کا، چونکہ ان صفات کے لیے بہانہ بن سکتا ہے، اس لیے اسے خوب دہرایا جاتا ہے؛ عوام الناس کو بھی اچھا لگتا ہے اور رہنماؤں کو بھی پسند ہے۔ جن لوگوں کے شانوں پر تعلیم و رہنمائی کی ذمہ داریاں ہیں، انہیں یہ بات بہت پسند ہے۔ لوگوں کی [اسی طرح کی] تہذیب کے کام میں مشکلات کم ہیں، اعتراضات نہیں ہوتے، ایسا کام ہے جس میں انسان کی بھیڑ بکریوں تک کو نقصان نہیں پہنچتا، کچھ لوگوں کو انسان جمع کرے، ان کے کانوں میں عاشقانہ سرگوشیاں کرے، انہیں خود سے بےخود کرے، تہذیب کرے، تزکیہ کرے، لوگوں کے لیے بھی آسان ہے، یعنی آسان نظر آتا ہے، البتہ اتنا آسان نہیں ہے۔

لہٰذا یہاں تک کی بات تو مشہور ہے؛ یہاں سے آگے کی باتیں غیر معروف ہیں، یہاں سے آگے

---

۱. بحارالانوار، کتاب الایمان و الکفر، ابواب مکارم الاخلاق، باب حسن الخلق، حدیث ۱

۲. جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چو ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

باتیں بولی نہیں جاتیں، یہاں سے آگے باتیں کیا ہیں؟ یہ ہے سوال: انبیاؑ نے لوگوں کو آراستہ و پیراستہ کرنے کے لیے کس طریقے سے استفادہ کیا؟ کیا کام انجام دیا؟ کیا وہ لوگوں کے پاس آئے، ایک ایک کا کان پکڑا، ایک ایک کا ہاتھ پکڑا، اسے لے گئے گھر کی، مکتب و مدرسہ کی تنہائی میں اور شروع کردی ان کی تعلیم و تربیت؟ کیا انبیاؑ بھی دنیا کے زاہدوں اور عارفوں کی طرح بیٹھ گئے اپنی خانقاہوں میں تاکہ لوگ آئیں، ان کی معنوی حالت کو دیکھیں اور ان کے ساتھ ہم عقیدہ، ہمراہ اور ہم قدم ہوجائیں؟ آیا انبیاؑ نے دنیا کے فلسفیوں کی طرح مدرسہ بنایا، بورڈ لگایا، دعوت دی؛ جو تعلیم حاصل کرنا چاہے، وہ آجائے ہمارے پاس تعلیم حاصل کرلے، کیا ایسے تھے وہ؟ یا نہیں، انبیاؑ اس طرح کے نرم ونازک اور صاف ستھرے کاموں کے معتقد نہیں تھے؛ کہ آپ یہ سمجھتے کہ سقراط اور افلاطون کی طرح، حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ یا موسیٰؑ یا عیسیٰؑ یا ہمارے نبیؐ، مدرسے کے اندر بیٹھ جاتے تھے، لوگ جاتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے، ایسا نہیں ہے، اور انبیاؑ کی طرح اولیا بھی۔

انبیاؑ کے پاس ایک ہی جواب ہے اس سوال کا کہ انسانوں کو کس طرح بنایا جاتا ہے؟ انسانوں کو کس طرح سے صحیح اسلامی تربیت کے معیار پر بنایا جاتا ہے؟ ایک ہی جواب ہے، اور وہ جواب یہ ہے، انبیاؑ کہتے ہیں کہ انسان کو بنانے کے لیے مناسب ماحول، صحیح و سالم ماحول، ایسا ماحول جو اس کی اپنے اندر پرورش کرے، تربیت کرے اور بس۔ انبیاؑ کہتے ہیں کہ فرداً فرداً سانچہ نہیں بنایا جا سکتا، کارخانہ بننا چاہیے۔ انبیاؑ کہتے ہیں کہ اگر ایک ایک انسان کو بنائیں گے تو رات ہو جائے گی اور زندگی گزر جائے گی، معاشرے کی ضرورت ہے، نظام ہونا چاہیے، ایک نظام کے اندر دل پسند شکل میں انسانوں کو ڈھالا جائے اور بس، صرف اتنا ہی اور بس۔

انبیاؑ کہتے ہیں کہ انسان ایک درخت کی مانند ہے، ایک پودے کی مانند ہے۔ کھجور کے ایک درخت کو نظر میں لائیے، موسمی کے ایک پودے کو نظر میں لائیے، اس کی کچھ شرائط ہیں، کچھ خصوصیات ہیں، ان خصوصیات کا تقاضا ہے کہ گرم موسم میں ہوں، متناسب موسم میں ہوں۔ کھجور کے درخت کو ایران کے جنوب میں بوئیے، ایران کے جنوبی علاقوں میں یا طبس میں یا بعض عرب ممالک میں، دیکھیے گا کہ کتنی لذیذ اور اعلیٰ کھجور دے گا، دلچسپ بات ہے نا، کیوں؟

اس لیے کہ اس پودے کو ضرورت ہے فلاں درجۂ حرارت کے موسم کی، ہوا میں فلاں فیصد مقدار میں نمی کی، فلاں انداز کی مٹی کی، دوسری کچھ شرائط کی، دسیوں دوسری شرطوں کی؛ اور یہ ساری شرطیں طبس میں موجود ہیں، یہ ساری شرطیں خوزستان میں موجود ہیں، یہ ساری شرطیں مشہد میں موجود نہیں ہیں۔ اس کا کیا کیا جا سکتا ہے، آپ جائیے خرما کے ہزاروں پودے اکھاڑ کے یہاں (مشہد) لے آئیے، زمین میں بو دیجیے، پانی بھی دیجیے، ہوا بھی فراہم کر دیجیے، کیا کچھ ہو گا؟

آیا عاقلانہ بات یہ نہیں ہے کہ انسان بجائے اس کے کہ کھجور کے ایک ایک درخت پر اتنی محنت کرے، اگر ہو سکے تو ایک مناسب ماحول بنالے؟ اگر ہو سکے تو ایسا ماحول بنا لے کہ یہ ماحول خود ہی کھجور کی پیداوار دیدے۔

البتہ واضح ہے کہ جو زحمت اور جو خونِ دل متناسب ماحول بنانے کے لیے، انسان کو بہانا پڑے گا، وہ اس زحمت سے کہیں زیادہ ہے جو کھجور کے ایک درخت کے لیے، کھجور کے ایک پودے کے لیے انسان کو اٹھانا ہوتی ہے۔ وہ زحمت اس سے کہیں زیادہ ہے، لیکن اس کے فوائد کو دیکھیے، اس کے نتائج کا اندازہ لگائیے۔ یہاں پر آپ زحمت اٹھاتے ہیں ایک فرد پر، ایک انسان بناتے ہیں، وہاں پر ایک معاشرہ بنا دیتے ہیں، ایک نظام بنا ڈالتے ہیں، لاکھوں انسانوں کو، نسلوں کو انسان بنا دیتے ہیں۔ انبیاؑ کا کام یہ تھا۔ جو بات ہم قرآن سے سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اس سوال کے جواب میں کہ کس طرح سے انسانوں کو بنانا چاہیے؟ یعنی آراستہ و پیراستہ کرنا چاہیے؟ اس سوال پر ان کا جواب یہ ہے کہ الٰہی معاشرہ، توحیدی معاشرہ بنانا ہو گا، متناسب ماحول بنانا ہو گا، تاکہ انسان اس متناسب ماحول میں، ایک نہیں، دس نہیں، ہزاروں نہیں بلکہ جوق در جوق خود بخود انسان بنتے چلے جائیں، معارف اسلامی کے روشن کر دینے والے نور کی طبیعی حرارت سے۔

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ ۞ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللهِ أَفْوَاجًا﴾[۱] مکہ کے جاہلی ماحول میں، جب پیغمبر انسان بنانا چاہتے تھے، تو مجبور تھے کہ ایک ایک کر کے بنائیں، کیونکہ اُس قسم کے سسٹم کو

---

۱. سورہ مبارکہ نصر: آیت ۱ اور ۲۔ جب خدا کی مدد اور فتح کی منزل آجائے اور آپ دیکھ لیں کہ لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔

بنانے کے لیے، ایک خاص گروہ کی ضرورت ہوتی ہے، کچھ بنیادی لوگ درکار ہوتے ہیں، یہ لوگ پہلے انفرادی طور پر بنتے ہیں؛ یہ بات انبیاؑ کے کلی منصوبے کے برخلاف نہیں ہے۔ مدنی معاشرہ کی بنیادیں ڈالنے کے لیے پیغمبر اکرمؐ مجبور ہیں کہ مکہ میں انفرادی طور پر افراد سازی کریں، ایک ابوذر، ایک عبداللہ بن مسعود، ایک کوئی اور، ایک کوئی اور، اور اسی طرح سو افراد، زیادہ سے زیادہ دو سو افراد کو انسان بنائیں۔ یہ ہوں گے مستقبل کے مدنی معاشرے، یعنی توحیدی اور اسلامی معاشرے کے لیے سنگ بنیاد۔ پیغمبرؐ وہاں پر اس طرح سے ایک ایک کر کے افراد بناتے ہیں، کتنی محنتوں کے ساتھ، کتنی زحمتوں کے ساتھ، کس خونِ دل کے ساتھ! باپ رکاوٹ بنتے ہیں کہ بچے کچھ نہ سمجھ پائیں، لڑکے دنیا میں دل لگاتے ہیں، پیغمبرؐ کے پاس نہیں آتے کہ کچھ سیکھ لیں، جو کوئی تھوڑا سا بھی مائل ہو جاتا ہے تو مشکلات، سختیاں اور خونِ دل کا سامنا ہے۔ یہ سب کام انجام ہوتے رہے، لیکن جب مدینہ کی باری آتی ہے، وہ الٰہی اور اسلامی معاشرہ مدینہ میں تشکیل پاتا ہے، پیغمبر اکرمؐ اس معاشرہ کے سربراہ ہیں اور خدا کے احکامات کو صادر کرنے والے ہیں۔ وہاں پر، اس وقت خدائے متعال اس طرح سے ارشاد فرماتا ہے: ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ﴾ جب خدا کی مدد اور فتح آجائے، ﴿وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللهِ أَفْوَاجًا﴾ اور تم دیکھ لو کہ لوگ جوق در جوق دین خدا میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ ہے انبیاؑ کے اہداف کے حوالے سے تمام باتوں کا حاصل۔

باتوں کا خلاصہ کروں، خلاصہ یہ ہے کہ: انبیاؑ کے دو ہدف ہیں، دو اہم ہدف۔ ایک بنیادی ہدف ہے، انسان بنانا، انہیں برائیوں سے دور کرنا، نیکیوں، فضیلتوں اور خوبیوں سے آراستہ کرنا۔ مختصر یہ کہ انسان کو انسان بنانا، یہ بڑا ہدف۔ لیکن انبیاؑ کا ایک اور ہدف بھی ہے، جو اس ہدف کے راستے میں آتا ہے، وہ یہ ہے، توحیدی معاشرے کی تشکیل، نظام الٰہی کی تشکیل، حکومتِ خدا کی تشکیل، ایسے نظام کی تشکیل جو خدا کے قوانین و احکامات کے تحت کام کرے، یہ تمام انبیاؑ کا ہدف ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ خدا کے بڑے پیغمبروںؑ کا یہ ہدف نہیں تھا، تو اسے قرآن و حدیث اور تاریخ کا مزید مطالعہ کرنا چاہیے۔ اب یہاں پر دو آیتیں لے کر آتے ہیں، البتہ خدا کی اس عظیم کتاب کے اندر متعدد آیات ہیں جن سے اس بات کا استفادہ ہوتا ہے۔ یہاں پر صرف دو آیتوں کا ذکر کیا ہے، لیکن ان دو آیات میں غور کرنا ضروری ہے، کچھ تفکر و تأمل کرنا لازمی ہے۔

پہلی آیت، جیسا کہ عرض کیا، سورۂ حدید کی آیت ہے۔ آیت کا صرف ترجمہ کیا جائے گا اور مختصر وضاحت پیش کی جائے گی۔ ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا﴾[1] یقیناً ہم نے اپنے رسول بھیجے، ﴿بِالْبَيِّنَاتِ﴾ واضح اور واضح کرنے والے دلائل کے ساتھ۔ انبیاؑ کی باتیں، انبیاؑ کی حجتیں، واضح حجتیں ہیں، ایسا نہیں ہے کہ عقلمند اور متفکر انسان اس کو نہ سمجھ پائے۔ سمجھ لیتے ہیں، انبیاؑ کی باتیں سب سمجھتے ہیں، ﴿وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ﴾ اور انبیاؑ کے ساتھ کتاب نازل کی، کتاب کیا ہے؟ بار بار عرض کیا ہے، کتاب یعنی علوم و احکامات کا ایک مجموعہ کہ اصل دین اسی سے تشکیل پاتا ہے، علوم دینی اور معارف دینی، یہ کتاب ہے، مختصراً دینی آئیڈیالوجی کا مجموعہ۔ کتاب کو عام تعبیر میں، معمولی سے رد و بدل کے ساتھ اس چیز پر منطبق کیا جا سکتا ہے جسے آج کے جدید عملی مکاتب کی زبان میں آئیڈیالوجی کہا جاتا ہے، یعنی مؤثر اصول و معارف، وہ فکری اصول جو عملی میدان میں واضح اثر رکھتے ہوں اور مؤثر ہوں۔

ان کے ساتھ بھیجا کتاب کو، یہ ایک۔ ﴿وَالْمِيزَانَ﴾ ان کے ساتھ ایک میزان بھی بھیجا، میزان یعنی ترازو۔ کیا مطلب ہوا؟ یعنی جو پیغمبر بھی آیا، اس کے ہاتھ میں ایک ترازو تھا، چھوٹا یا بڑا؟ نہیں۔ میزان یعنی وہ چیز جس سے معاشرے کے اندر تعادل و توازن پیدا کیا جائے، یہ ہیں میزان کے معنی۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظر معاشرے پر ہے، اگر طے یہ تھا کہ پیغمبر کسی معاشرے کا سربراہ نہ ہو اور کوئی معاشرہ تشکیل نہ دے، تو میزان کی کیا ضرورت تھی؟ جس چیز سے معاشرے میں تعادل و توازن پیدا ہو، اس کی اسے کیا ضرورت تھی؟ پیغمبر کے ساتھ ایک ایسا وسیلہ بھیجا ہے جس سے وہ معاشرے میں تعادل و توازن پیدا کرے، وہ وسیلہ کیا ہے؟ خدائی فیصلوں کا ادارہ، یہ ایک ہے، قضاوت کے قوانین، یہ بھی ایک ہے، قانون کا نفاذ کرنے والا، نفاذ کا ضامن، میزان اس پر بھی منطبق ہو سکتا ہے۔ قوانین ہیں اور نفاذ کا ضامن اور قوانین کے نفاذ کا گواہ۔ وہی جسے آج ڈیموکریٹک ممالک کی زبان میں، قوۂ مجریہ (نافذ کرنے کی طاقت) کہا جاتا ہے جو اصطلاح میں یہی حکومت ہے۔ جن ممالک میں حکومت ہے، پارلیمنٹ ہے، قوانین بنائے جاتے ہیں، نفاذ کرنے والا ہے، قوۂ مجریہ وہ چیز ہے جو معاشرے کے اندر قوانین کے نفاذ کی نگرانی کرتی ہے، ممکن ہے کہ قوۂ مجریہ ہی میزان ہو۔ میں نے اسی آیت کے ذیل میں وارد ہونے والی احادیث کی طرف رجوع کیا، تو دیکھا کہ جن چیزوں

---

۱. سورہ مبارکہ حدید: آیت ۲۵

سے میزان کا معنی کیا گیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ فرمایا: «اَلمِیزَانُ الإِمَامُ»[1] اور دیکھا کہ بالکل درست ہے، تطبیق کی جا رہی ہے، ہم اس حدیث سے استفادہ کر رہے ہیں۔ میزان امام ہے، امام وہ ہے جسے معاشرے کے اندر حق کو باطل سے جدا کرنا ہے، جسے صفوں کو واضح کرنا ہے، جسے معاشرے کے اندر تعادل و توازن پیدا کرنا ہے، کیوں؟ کیونکہ وہ معاشرے کا حکمران ہے۔ البتہ اس جملے اور اس حدیث سے کچھ لوگ عامیانہ اور غلط مفہوم بھی نکال لیں گے، ہمیں ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں ہے، جیسا کہ عرض کیا اسی بات پر اعتقاد ہے کہ امام میزان ہے، معیار ہے، برائیوں اور خوبیوں کو اسی سے پرکھا جاتا ہے، راستوں کو اسی پر منطبق کیا جاتا ہے، اور اس کے علاوہ وہی ہے جو معاشرے میں اس بات کو دیکھتا ہے کہ لوگ تعادل و توازن سے باہر نہ نکل جائیں، وہ قوانین کی نگرانی کرتا ہے، روایت بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے۔ پس میزان یعنی وہ وسیلہ جس سے معاشرے میں تعادل و توازن برقرار ہو، اسے بھی ہم نے پیغمبر کے ساتھ بھیجا۔

ہم نے یہ کام کیوں انجام دیئے؟ پیغمبر کو کتاب سے کیا کام تھا؟ بلکہ خود پیغمبر ہی کی کیا ضرورت تھی؟ میزان کا اسے کیا کرنا تھا؟ کتاب کا اسے کیا کرنا تھا؟ اس کا سبب یہ ہے: ﴿لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾۔ اس ﴿لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ کو ترجمے کے لحاظ سے دو طرح سے معنی کیا جا سکتا ہے، البتہ دونوں انداز کا مطلب ایک ہی ہے۔ ﴿لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ تاکہ انسان عادلانہ زندگی قائم کریں۔ یہ ایک معنی؛ دوسرا معنی یہ ہے تاکہ انسان قائم ہو جائیں انصاف کی بنیاد پر، زندگی گزاریں برابری کی بنیاد پر۔

﴿لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ اس کے معنی کا حاصل یہ ہے کہ انسان ایک عادلانہ ماحول میں زندگی گزاریں، ایک عادلانہ معاشرے اور عادلانہ نظام کے اندر زندگی بسر کریں، انبیاً آئے ہی اسی لیے ہیں۔ پس پیغمبر کس لیے آئے ہیں؟ عادلانہ نظام اور عادلانہ ماحول تشکیل دینے کے لیے۔ وہ آئے ہیں تاکہ دنیا کو عدل و انصاف کی دنیا بنا دیں، وہ آئے ہیں تاکہ عادلانہ نظام اور معاشرہ وجود میں لے آئیں، پیغمبر اسی لیے آئے ہیں، اور عادلانہ نظام ہی ہے جس کے اندر انسانوں کو یہ موقع ملتا ہے کہ کمال اور بلندی تک پہنچ جائیں؛ ﴿لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ﴾ لوہا بھی نازل کیا۔ جی ہاں! لوہا بھی بھیجا، صرف باتیں

۱۔ تفسیر نور الثقلین ذیل سورہ مبارکہ حدید آیت ۲۵

کرنے سے، صرف وعظ کرنے سے؛ لوگو! آؤ عادلانہ نظام بناؤ، کیا صرف اتنا ہی کافی ہے؟ بالفرض عادلانہ نظام بنا لیا، شیاطین، بھیڑیے، ڈاکو، درندے، کیا وہ اس عادلانہ نظام کو باقی رہنے دیں گے؟ اسی لیے ہم نے لوہا بھی بھیج دیا، کس لیے بھیجا؟ اس لیے کہ لوہے کہ ذریعے سے سچی اقدار کا دفاع کیا جائے۔ یہاں پر بھی ہم نے احادیث کی کتب کی جانب رجوع کیا، ہم نے دیکھا کہ جب آیت کا معنیٰ امام علیہ السلام کرتے ہیں اور ﴿وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ﴾ تک پہنچتے ہیں، فرماتے ہیں: «السِّلَاح»[1]۔ تلوار، نیزہ، اسلحہ جو کہ لوہے سے بنتا ہے۔ خدائے متعال دعوتِ نبوت کے ساتھ اسلحے کا تذکرہ کرتا ہے۔ وعظ و نصیحت کے ساتھ ساتھ، جس کو انبیاؑ کے لیے فرض کیا جاتا ہے، توحیدی اور الٰہی نظام کی تشکیل کے ساتھ ساتھ، پروردگار عالَم اسلحے اور طاقت کا بھی تذکرہ کرتا ہے، ﴿وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ﴾ اور بھیجا لوہے کو، اور امامؑ کے بقول اسلحے کو۔ ﴿فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ﴾ جس میں بڑی قوت ہے (اور شدید ہیبت ہے) ﴿وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں۔ لوگوں کے لیے بڑا فائدہ ہے، ﴿وَلِيَعْلَمَ اللهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ﴾ تاکہ معلوم ہو جائے، خدا جان لے (حالانکہ وہ تو جانتا ہے) کا معنیٰ یہ ہے کہ حقیقت میں معین ہو جائے، ﴿مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ﴾ وہ لوگ جو غیب کے ساتھ اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں، غیب پر ایمان کے ساتھ، غیب پر یا نادیدہ ایمان رکھتے ہوئے، خدا کو تو نہیں دیکھا ہے، بعض لوگوں نے پیغمبر کو بھی نہیں دیکھا ہے؛ اس پر ایمان لے آئیں اور اس کی مدد کریں۔ ﴿إِنَّ اللهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ بے شک خدا قوی اور ناقابلِ شکست ہے۔

اور اب سورۂ اعراف کی آیت؛ پچھلی آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ ہمیں ان مقدمات سے کوئی مطلب نہیں ہے جن کے بعد یہ آیت آئی ہے، چونکہ اس آیت کا مطلب بیان ہو رہا ہے، اس لیے پچھلی ایک آیت بھی لے لی تاکہ بات واضح ہو جائے۔

ذکر اس مومن یا ان مومنین کا ہے جو خدا کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں، کیا کہہ رہے ہیں؟ اب غور کیجیے گا، آیت کو سنیے یہاں تک کہ اس مقام تک پہنچ جائیں جو ہمارے مدّ نظر ہے۔ کہتے ہیں: ﴿وَاكْتُبْ لَنَا﴾[2] لکھ دے ہمارے لیے اے ہمارے پروردگار، ﴿فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ﴾ اِس دنیا میں

---

۱. تفسیر نور الثقلین ذیل سورہ مبارکہ حدید آیت ۲۵

۲. سورہ مبارکہ اعراف: آیت ۱۵۶ اور ۱۵۷

اور اُس دنیا میں نیکی کو، ﴿إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ﴾ ہم نے تیری طرف ہدایت پائی ہے ﴿قَالَ﴾ خدا نے ان کے جواب میں فرمایا: ﴿عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ﴾ میں اپنا عذاب پہنچاؤں گا جس کو چاہوں اور ارادہ کروں۔ البتہ خدا کا ارادہ فضول اور بلاوجہ نہیں ہوتا، کسی کو اس کا دل چاہے کہ عذاب کرے، کسی کے لیے نہ چاہے، نہیں، پروردگار کا ارادہ بھی ان معیارات کے تابع ہے جن کو خود اس نے مقرر کیا ہے۔ برے اور بدکار انسان کو خدائے متعال عذاب دینا چاہتا ہے۔ ﴿أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ﴾ تکلیف پہنچاؤں گا؛ ایسا نہیں ہے کہ ﴿أُصِيبُ﴾ کا مطلب ہی تکلیف ہے، نہیں، ﴿أُصِيبُ﴾ یعنی پہنچاؤں گا، پھر تعبیر کے طور پر ہم نے لفظ تکلیف استعمال کیا ہے؛ تکلیف پہنچاؤں گا اپنے اس عذاب سے جس کسی کے لیے میں ارادہ کروں گا، ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیرا ہوا ہے اور ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، ﴿فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ﴾ اپنی رحمت کو میں لکھ دوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، ﴿وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ﴾ زکوٰۃ دیتے ہیں، ﴿وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ﴾ اور وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں۔ کون لوگ؟ ﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ﴾ وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں باخبر اُمی پیغمبر کی۔

وہ نبی اُمی، ﴿الَّذِي يَجِدُونَهُ﴾ جس کو وہ پاتے ہیں، ﴿مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ﴾ اپنے پاس لکھا ہوا، ﴿فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ﴾ توریت اور انجیل میں، کہ ان دو کتابوں نے پیغمبر کے آنے کی بشارت دی ہے۔ اس پیغمبر کی خصوصیت کیا ہے؟ یہاں سے غور کیجیے گا۔ ﴿يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ انہیں حکم دیتا ہے نیکیوں کا، عقل اور فطرت کے لیے جانی پہچانی فضیلتوں کا، ﴿وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ روکتا ہے انہیں منکرات سے، عقل و فطرتِ انسانی کی نسبت اجنبی چیزوں سے، ﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ﴾ ان کے لیے طیبات اور اچھی چیزوں کو حلال کرتا ہے، ممکن بناتا ہے، جائز کرتا ہے، ہر اچھی چیز دین میں ہے، ﴿وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ﴾ اور گندی اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے، یعنی انہیں محروم کرتا ہے، ان کو بری چیزوں سے روک لیتا ہے، اسلامی معاشرہ ایسا ہوتا ہے۔

جو چیزیں انسان کے لیے، اس کی فکر کے لیے، اس کے دل کے لیے، اس کی روح کے لیے، اس کے جسم کے لیے اچھی ہوتی ہیں، وہ اسلامی معاشرے کے اندر تمام لوگوں کی دسترس میں ہوتی ہیں۔ علم، دانش، تقویٰ، دولت، جو چیز بھی انسان کے لیے اچھی اور مفید ہے، وہ سب کی دسترس میں ہے۔ جو

چیز بھی انسان کے لیے بری ہے، وہ کسی کے بھی اختیار میں نہیں ہے۔ ﴿وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ﴾ یا ان کی دسترس میں ہی نہیں ہے، یا لازمی قانون کے طور پر ان کی دسترس سے خارج کر دی گئی ہے۔ ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ﴾ ان کے بھاری وزن کو ان کے شانوں پر سے اٹھالیتا ہے۔پیغمبر کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ بھاری وزن کو ہٹا دیتا ہے، جہالتوں کے بھاری وزن کو، غلط رسم و رواج کے بھاری وزن کو، خبیث اور غیر انسانی نظاموں کے بھاری وزن کو، آمریت، استبداد، زور زبردستی اور استثمار کے بھاری وزن کو، ہر بھاری وزن کو ان کے شانوں سے ہٹا دیتا ہے۔ ﴿وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ جو زنجیریں ان کے پاؤں میں ہیں انہیں کھول دیتا ہے۔ کونسی زنجیریں اور بیڑیاں تھیں؟ کیا ایسا ہے کہ نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے تو مکہ والوں کے پیروں میں زنجیریں پڑی تھیں؟ کیا ہر کوئی ایک زنجیر میں بندھا تھا؟ کیا ان کی گردن میں طوق تھے؟ کیا سب لوگ قید خانے میں تھے؟ واضح بات ہے کہ آہنی زنجیریں نہیں تھیں۔ زنجیر اور طوق نہیں تھے، کون سے طوق اور زنجیریں؟ خود سوچو اور سمجھو۔ ان لوگوں کے ہاتھوں، پیروں اور گلے میں کونسی زنجیریں تھیں؟ اسیری کی زنجیریں، زبردستی کسی کے آگے سر جھکانے کی زنجیریں، انسانی رسم و رواج اور قوانین و ضوابط کی زنجیریں؛ پیغمبر آتے ہیں ان کو کھول دیتے ہیں۔ یہ سوائے ایک انسانی اور توحیدی نظام کے اور کیا ہے۔ ﴿فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ﴾ پس جو لوگ پیغمبر پر ایمان لے آئیں اور اس کی جانب مائل ہو جائیں، ﴿وَعَزَّرُوهُ﴾ اس کی عزت و توقیر کریں، ﴿وَنَصَرُوهُ﴾ اور اس کی مدد کریں، ﴿وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ﴾ اور اس نور (روشنی) کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، یعنی یہ قرآن، اس کی پیروی کریں، اس کے پیچھے چلیں، ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ یہی لوگ ہیں کامیاب ہونے والے، وہی ہیں فلاح پانے والے اور ہدف اور مقصد تک پہنچنے والے۔

اٹھارہویں نشست

۱۹ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری

دعوت کے ابتدائی شعار اور نعرے

۶-۱۰-۱۹۷۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾ (سورہ نحل/۳۶)

گذشتہ چند دنوں کی بحثوں کے نتیجے میں یہ واضح ہوگیا کہ انبیاؑ کا اس دنیا میں کیا کام ہے؟ کس مقصد کے لیے آئے ہیں؟ کس طرح اپنے کام کو آگے بڑھاتے ہیں؟ اپنے مقصد تک کس راستے سے پہنچتے ہیں؟ آج کی بحث یہ ہے کہ جو کام انبیائے عظامِ الٰہی انجام دینا چاہتے ہیں؛ یعنی توحیدی حکومت، معاشرے اور نظام کو قائم کرنا اور جاہلی اور شرک آمیز نظام کو اکھاڑ پھینکنا اور معاشرے کے اندر عظیم انقلاب برپا کرنا، انبیا علیہم السلام یہ کام (جو کہ ان کا ہدف ہے) کہاں سے شروع کرتے ہیں؟ نقطۂ آغاز کا مسئلہ بہت اہم مسئلہ ہے۔

اگر نقطۂ آغاز کا انتخاب درست اور بجا طور پر ہوگیا، تو اس کام کے، اس منصوبے اور اس پروگرام کے نتیجے تک پہنچنے کی امید بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ اگر نقطۂ آغاز برے طور پر منتخب ہو، ایسا نہیں ہے کہ منزلِ مقصود حاصل نہیں ہوگی اور وہ کام نہیں ہوگا، نہیں، ممکن ہے ہوجائے، ممکن ہے وہ سواری منزل تک پہنچ جائے، لیکن مشکل سے پہنچے گی۔ نقطۂ آغاز اس اعتبار سے بہت اہم ہے جو کافی حد تک بلکہ اکثر اوقات اس کام کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے جسے اس نقطہ سے شروع ہونا ہے۔

انبیاؑ کے کام کے حوالے سے، اولاً تو یہ کہ ان کے کام کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ نقطۂ

آغاز کو جان لیں۔ انبیاؑ کے کام کی ایک کامل معرفت کے حصول کے لیے، کس قدر اچھا ہے کہ اس مسئلے کو بھی جان لیں کہ یہ حضرات کہاں سے کام کا آغاز کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ ایک درس بھی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو تمام انبیاؑ نے ایک خاص انداز سے اور معین طریقے سے عمل انجام دیا ہے یہ ایک درس ہو سکتا ہے، کیونکہ ہم انبیاؑ اور ان کے مکتب کے پیروکار اور ان کی راہ پر چلنے والے ہیں۔ بنابریں چند اعتبار سے مفید ہے کہ اس مسئلے پر بحث کریں۔

انبیائے عظام الٰہیؑ کے کام کا نقطۂ آغاز اپنے مکتب کی روح کو، بنیاد کو، نچوڑ کو اور حقیقت کو بیان کرنا تھا۔ انبیاؑ نے اپنے اجتماعی اور عقیدتی انقلاب کے آغاز میں لوگوں کے ساتھ ہرگز چرب زبانی سے کام نہیں لیا۔ ایسا نہیں تھا کہ ایک مدت تک لوگوں کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں سرگرداں رکھیں، کچھ دوسرے نعروں میں الجھائیں، اور جب کچھ کامیابی مل جائے، تو پھر اصلی نعرے کو ظاہر کریں، نہیں، ابتدا ہی سے سچائی، صداقت اور درست کاری کے ساتھ، اپنے اس واقعی اور آخری ہدف کو بیان کردیا اور وہ کیا تھا؟ وہ ہدف تھا توحید۔

جیسا کہ گزشتہ ابحاث میں وضاحت کی کہ مکتبِ انبیاؑ کا سب کچھ توحید ہے۔ توحید اور خدا کی معرفت انسان کے تکامل اور اس کی روح کے عروج کا سبب بھی ہے، اور یہی انبیاؑ کا اعلیٰ اور آخری ہدف ہے، اور توحید کو پیش کرنے کا مطلب ایک الٰہی ماحول، ایک الٰہی نظام اور معاشرہ، ایک عادلانہ نظام، ایک غیر طبقاتی نظام، ایک استثمار سے خالی نظام، ایک ظلم سے عاری نظام کی ایجاد، اس قسم کے ایک نظام کی تشکیل ہے اور یہ وہی متناسب ماحول ہے جو گزشتہ بحث میں بیان کیا تھا کہ ایک انسانی وجود کی تربیت اور پرورش کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔

توحید مکتبِ انبیا کا سب کچھ ہے۔ توحید، وجودِ خدا اور وحدانیتِ خدا پر اعتقاد انبیاؑ کے آخری اور اصلی ہدف کو بَر لانے والی چیز بھی ہے، اور یہ بھی کہ جس ماحول کو انسان سازی کے لیے وہ ضروری سمجھتے ہیں، انسان سازی کا کارخانہ بنانے کا عمل، اس کے لیے بھی توحید بہترین اور واضح‌ترین نعرہ ہے۔ اس لیے کہ توحیدی معاشرہ یعنی ایسا معاشرہ جس کے اندر، صرف خدا ہی خدائی اور سرداری کرتا ہے۔ خدا کے علاوہ کوئی بھی اس میں خدائی نہیں کرتا۔ توحیدی معاشرے میں کوئی شخص بھی دوسرں کے لیے ذمہ داریوں کا تعین اور قانون بنانے والا نہیں ہوتا۔ توحیدی معاشرے میں کوئی شخص بھی دوسرے

لوگوں کو اپنی اطاعت کی دعوت نہیں دیتا، حتی کہ پیغمبر بھی جو کہ خدا کا نمائندہ ہے۔

﴿وَإِذْ قَالَ اللهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَـٰهَيْنِ مِن دُونِ اللهِ﴾[1] خدائے متعال حضرت عیسیٰؑ سے خطاب کرتا ہے؛ کیا تم نے یہ سکھایا ہے، یہ تعلیم دی ہے کہ وہ تمہیں اور تمہاری والدہ کو خدا اور معبود سمجھیں؟ [عیسیٰؑ کہیں گے] ﴿قَالَ سُبْحَانَكَ﴾ اے پروردگار! تو منزہ ہے، میں ایسی کوئی غلط اور بُری تعلیم نہیں دیتا، ہرگز نہیں۔ میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ جو بات حق نہیں ہے اور درست نہیں ہے، وہ لوگوں کو سکھاؤں: ﴿إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي﴾[2] سے آیت کے آخر تک۔

اس حوالے سے ایک اور آیت بھی ہے جو اس سے زیادہ مناسب ہے، وہ یہ کہ کسی پیغمبر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ ﴿كُونُوا عِبَادًا لِي﴾[3]۔

اے لوگو! تم میرے غلام اور نوکر بن جاؤ۔ البتہ واضح ہے کہ پیغمبر صراحت کے ساتھ لوگوں سے نہیں کہیں گے کہ اے لوگو میرے غلام بن جاؤ، مقصد یہ ہے کہ کسی پیغمبر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی قید و شرط کے بغیر لوگوں کو اپنے احکامات کی طرف دعوت دے، یعنی یہ صرف خدا کا حق ہے۔ جب پیغمبر ایسے ہیں، جب خدا کے برگزیدہ بندے کو بھی حق نہیں ہے کہ وہ خدا کی حکومت اور ملکیت کے اندر کوئی تصرف کرے، جب پروردگار کی وحی لے کر آنے والا شخص بھی لوگوں کو خدا سے قطعِ نظر، اپنی اطاعت کی جانب بلا نہیں سکتا، تو دوسروں کا معاملہ تو بالکل واضح ہے۔ سیاسی طاقتیں، تاریخ کے منہ زور لوگ، انسان کی طویل تاریخ میں آنے والے غنڈے اور بدمعاش، اس طویل مدت کے دوران، لوگوں پر زبردستی کرتے تھے، حکم چلاتے تھے، ان کے شانوں پر ذمے داریاں ڈال دیتے تھے، یہ سب کام انہوں نے توحید کے برخلاف انجام دیا ہے، عقیدۂ توحید ان سب کی نفی کرتا ہے۔ یہ ہے توحید کا مطلب۔

پیغمبر جب معاشرے میں وارد ہوتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے، ان

---

۱. سورہ مبارکہ مائدہ: آیت ۱۱۶
۲. اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی تو وہ تیرے علم میں ہوتی۔ جو کچھ میرے نفس کے اندر ہے، تو اسے جانتا ہے۔
۳. سورہ مبارکہ آل عمران: آیت ۷۹

کی پہلی بات، یہی بات ہے، جیسے ہی وہ یہ بات کہتے ہیں، ان کے مقابلے میں صف آرائی، مخالفت اور ضدیت شروع کردیتے ہیں، حتی کہ قتل بھی، بعض موارد میں معاملہ قتل تک پہنچتا تھا۔

دعوتِ انبیاؑ کا پہلا نغمہ اور ان کے کام کا آغاز توحید کا اعلان ہے، آخری بات کا اعلان، آخری بات کو پہلے ہی بیان کر دیتے ہیں۔ دنیا میں سیاسی مکاتب اور سیاسی جماعتیں، جن کا خدا اور دین سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، ان کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ مدتوں عوام الناس کو بےمقصد پھراتے رہیں، مدتوں انہیں خالی خولی نعروں سے سرگرم رکھیں، برسوں تک عوام الناس کو بےکار امیدوں پر خوش رکھیں؛ آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے ہی سے ان کا مقصد یہ سب نہیں تھا، لیکن انبیاؑ ایسے نہیں ہیں، وہ پہلے ہی سے بالکل صاف اور واضح بات کرتے ہیں۔ ابتدا ہی میں لوگوں سے کہہ دیتے ہیں اور اس نچلے طبقے سے بھی۔ پہلے ہی سے کہہ دیتے ہیں کہ بھئی! ہم چاہتے ہیں کہ ان اوپر والوں کو نیچے لے آئیں، نیچے والوں کو اوپر لے جائیں، دونوں کو برابر کردیں؛ پہلے ہی سے یہ کہہ دیتے ہیں۔

اس طرح کہنے کا فائدہ کیا ہے؟ کیا حرج ہے کہ انبیاؑ پہلے لوگوں کو چکر دیتے رہیں؟ ان کو سرگرداں رکھیں، کچھ عرصہ بےکار باتیں بناتے رہیں، جو کچھ وہ نہیں چاہتے، کچھ مدت تک لوگوں کو بتاتے رہیں کہ ہم یہ چاہتے ہیں، آخر میں اپنا مقصد پالیں؛ کیا رکاوٹ ہے؟

رکاوٹ یہ ہے کہ دین آگہی اور بصیرت کے ساتھ ہے۔ اندھا اور جاہلانہ دینی ایمان فضول ہوتا ہے۔ دین چاہتا ہے کہ جو بھی اس کی طرف مائل ہو، جو بھی اس کے علاقے اور سرحد کے اندر وارد ہو، وہ پہلے سے جان لے کہ کہاں جا رہا ہے اور کیا کرنے جا رہا ہے۔ وہ بدّو اور ہر چیز سے جاہل اعرابی بھی، جب پیغمبر اکرمؐ کے پاس آکر مسلمان ہونا چاہتا ہے، تو پہلے ہی لمحے سے جان لیتا ہے کہ کیا چاہتا ہے، کسی مطلق مجہول چیز کے پیچھے نہیں ہے، سمجھتا ہے کہ کیا چاہتا ہے؛ اسی لیے وہ اس قدر برداشت اور صبر سے کام لیتا ہے۔ اسی وجہ سے ان سب سختیوں، تکلیفوں اور اذیتوں کو سہہ لیتا ہے، کیونکہ جانتا ہے کہ کیا کر رہا ہے اور ہمیشہ تمام تحریکوں، تمام مقابلوں اور تمام جدوجہدوں میں، تاریخ میں ہمیشہ اور ہر مقام پر ایسا ہی ہوا کہ جو شخص قدم اٹھا رہا ہے، اگر وہ نہ جانتا ہو، آگاہ نہ ہو کہ کیا چاہتا ہے، اگر نہ جانتا ہو کہ کس مقصود اور کس معشوق کے پیچھے دوڑ رہا ہے، تو ابتدائی لمحات میں ہی تھک جاتا ہے اور یہ ایک طبیعی چیز ہے۔ مگر یہ کہ وہ آگاہ ہو، مگر یہ کہ وہ بصیرت سے چلا ہو۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نوجوان ہر اس چیز سے روگرداں ہو جاتا ہے جو کسی نوجوان کے لیے قیمتی اور اہمیت کی حامل ہوتی ہے، یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آسودہ حال انسان ہر اس چیز کو ٹھکرا دیتا ہے جو اس کے لیے آسودگی اور آسائش کا ذریعہ تھی اور اسے افسوس بھی نہیں ہوتا، یاسر اور سمیہ، یہ دو میاں بیوی، یہ دو ماں باپ، یہ دو مثالی مسلمان، ٹھکرا دیتے ہیں زندگی کی تمام خوبصورتیوں کو اور جان دے دیتے ہیں (عمار کے والدین) یہ زندگیاں کتنی شاندار ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ان میں بصیرت تھی۔پہلے بیوی ایمان لاتی ہے، پھر اپنے شوہر کو مومن بناتی ہیں، عجیب حال ہے، عجیب ماجرا ہے۔ پس اگر ایمان بصیرت کے ساتھ نہ ہو تو برداشت نہیں کریں گے۔

اس بات کا سبب کہ ادیان، ابتدا ہی میں آخری بات بیان کر دیتے ہیں اور ابتدا ہی میں کہہ دیتے ہیں کہ ہم کس لیے آئے ہیں، پردہ پوشی نہیں کرتے،یہی ہے کہ مائل ہونے والے اور دین سے وابستہ افراد، آگہی کے ساتھ، بصیرت کے ساتھ، بغیر اس کے کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں، دین میں داخل ہوں۔

دین بنیادی طور پر آگہی اور بصیرت کے ساتھ ہے۔ کسی سے بھی نہیں کہا جاتا کہ تم فی الحال اسے قبول کر لو، پھر آگے چلو گے، تحقیق کر لو گے، ہرگز نہیں، دین کی دنیا میں ایسی بات نہیں ہے۔اگر تم نے دین قبول کر بھی لیا ہے، تو دین نے تمہیں قبول نہیں کیا ہے، جب تک کہ بصیرت و آگہی کے ساتھ نہ ہو۔ اس لیے کہ دین آگہی کے لیے اہمیت کا قائل ہے، بصیرت کے لئے اہمیت کا قائل ہے، با بصیرت انسان کے لیے، برتر اور بالاتر مقام کا قائل ہے۔ اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ، خدا کی جانب آغاز میں ہی متوجہ رہیں۔ اس مقصد کی خاطر انبیاؑ ابتدا ہی میں اپنا مقصد اور اپنا آخری ہدف بیان کر دیتے ہیں۔

اس بحث کے نتیجے میں دو تین باتیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں؛ ایک بات تو یہی تھی جو ابھی میں نے عرض کی کہ دین آگہی اور بصیرت کو بنیادی حیثیت دیتا ہے اور ناآگاہ مسلمان اس کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انبیاؑ کے پیروکار، وہ لوگ جو اپنے آپ کو وارثِ انبیا سمجھتے ہیں، نہ صرف علما، البتہ علما وارثِ انبیاؑ ہیں، لیکن دنیا کے تمام الٰہی فکر رکھنے والے ایک اعتبار سے وارثِ انبیاؑ شمار ہوتے ہیں، جو شخص بھی راہ توحید پر گامزن ہو اور توحید کو ایک قرارداد کے طور پر قبول کرتا ہو، یہ شخص

حضرت ابراہیمؑ کا، حضرت موسیٰؑ کا، حضرت عیسیٰؑ کا اور خدا کے تمام عزیز اور بزرگ انبیاؑ کا پیروکار ہے۔ انبیاؑ کے پیروکار کس راستے سے وارد ہونا چاہتے ہیں؟ ایسی کونسی جگہ سے شروع کرنا چاہتے ہیں، جو اس سے زیادہ بہتر، زیادہ یقینی اور زیادہ نتیجہ بخش ہو، جہاں سے انبیاؑ نے شروع کیا تھا؟

آج جب دین کی بات ہوتی ہے تو ہم سب سے پہلے توحید کی بات کیوں نہیں کرتے؟ کیوں؟ یہ ایک سوال ہے جو ہونا چاہیے؟ کیا ایسا نہیں ہے؟ جہاں دین کی بات ہوتی ہے، وہاں کتنے فیصد توحید کا ذکر ہوتا ہے؟ ہم اپنے لوگوں کو اپنے معاشرے کو، اپنی دنیا کو دیندار بنانے کے لیے اس جگہ سے شروع نہیں کرتے جہاں سے انبیاؑ نے آغاز کیا تھا؟ ہم چاہتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں کو دینِ اسلام کا معتقد بنا دیں لیکن اُس راستے سے وارد ہوتے ہیں جو انبیاؑ کے راستے سے مختلف ہے۔ ہمیں توحید کو پیش کرنا چاہیے، اسی توحید کو جسے انبیاؑ نے پیش کیا۔ اگر ہم پوری دنیا کی سطح پر، عالمی سطح پر، اس انقلاب کو برپا نہیں کر سکتے، اور یہ کام اتنا آسان ہے بھی نہیں؛ لیکن کم از کم عالمی اور پوری دنیا کی سطح پر یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ انبیاؑ کا مقصد و ہدف ایسا انقلاب برپا کرنا تھا، یہ بات تو کر سکتے ہیں نا۔ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ دینی گفتگو کرنے والے بجائے اس کے کہ فکری اور عملی طور پر توحید سے آغاز کریں، فرعی اور دوسرے اور تیسرے درجے کے مسائل میں کیوں پڑ جاتے ہیں؟

وہ اس بات پر گھنٹوں گفتگو کے لیے تیار ہیں کہ جب منکر و نکیر قبر میں آئیں گے، تو کس طرح آئیں گے؟ دائیں جانب کھڑے ہوں گے یا بائیں جانب یا سامنے کھڑے ہوں گے؟ یا یہ کہ وہ کون ہیں؟ یعنی ایسا مسئلہ کہ جس کو جان لینا یا نہ جاننا انسان کے مسلمان ہونے پر، ہماری اسلامی ذمہ داریوں کی انجام دہی پر کوئی اثر نہیں ڈالتا، اور اس قسم کے مسائل بہت زیادہ ہیں۔ انہیں ضروریاتِ دین میں بھی شمار کرتے ہیں، دین کے بنیادی‌ترین مسائل کی طرح انہیں پیش کرتے ہیں، لیکن اس بات پر سوچنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتے کہ توحید، توحید کا اصول، معاشرے کی شکل و صورت کے لیے، نظام اجتماعی کے لیے کیا تجاویز پیش کرتا ہے۔ آیا کوئی تجویز پیش کرتا بھی ہے یا نہیں؟ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ باتیں پہلے مرحلے پر ہونی چاہئیں۔

انبیاؑ کے کام اور دعوتِ انبیاؑ کے نقطۂ آغاز میں جو درس ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے کام کا نقطۂ آغاز اسی کو قرار دیں جو انبیاؑ کا نقطۂ آغاز تھا۔ اگر انبیاؑ کے انقلاب کو برپا نہیں کر سکتے، کم از کم یہ

تو کہہ سکتے ہیں کہ انبیاؑ کا انقلاب یہ ہے، انبیاؑ کا ہدف یہ ہے، ان کا راستہ یہ ہے، اس کی تشریح کریں، یہ تو کر سکتے ہیں۔

اب وہ دن نہیں رہے کہ عالَم اسلام ان معاملات میں تاخیر کو برداشت کر سکے۔ اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، اب ہمارے پاس وہ فرصت نہیں ہے، آج ہمارا بیمار بستر مرگ پر ہے، موت سے نزدیک ہے۔ جو باتیں زیادہ ضروری ہیں، آج سامنے لے آئیں؛ جس کی ضرورت کچھ کم ہو، اسے تھوڑا پیچھے کر دیں۔ آج کا ایک ایک لمحہ، ہمارے لیے بہت زیادہ معتبر اور بہت زیادہ اہم ہے۔

بنابریں، دعوتِ انبیاؑ کا نقطۂ آغاز توحید ہے۔ قرآن کریم سے جو ثبوت ہم نے آپ کے لیے ذکر کیے ہیں، ان میں سے ایک سورۂ نحل ہے اور اس کی آیت یہ ہے: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا﴾[1] اور یقیناً ہم نے ہر ایک امت میں کوئی نہ کوئی رسول (یہ پیغام دے کر) ضرور بھیجا ہے۔ اس پیغمبر اور رسول کا کہنا کیا تھا؟ ان کی بات اور ان کا پیغام یہ تھا: ﴿أَنِ اعْبُدُوا اللهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت (کی بندگی) سے بچو۔ یہ پیغمبر کا پہلا پیغام ہے۔ آتے ہی ان کا پیغام یہ ہوتا ہے: ﴿أَنِ اعْبُدُوا اللهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾

طاغوت خدا کا رقیب ہے، طاغوت وہ ہے جو خدا کے سامنے، اس کے حکم کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے، جو بھی ہو۔ کبھی یہ طاغوت تم خود ہی ہو؛ «أَعْدیٰ عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ»[2] کبھی یہ طاغوت تمہارا اپنا خرافات میں پڑا دل ہے۔ کبھی یہ طاغوت تمہاری دن رات کی ہوس بازی ہے۔ کبھی کسی کی جاہ طلبی اس کا طاغوت ہے، کسی انسان کا تکبر اس کا طاغوت ہے۔ کبھی انسان کے وجود سے باہر کی طاقتیں طاغوت ہیں۔ وہ طاقتیں جو اسی طرح دائرے کی صورت میں وسیع سے وسیع تر ہوتی رہتی ہیں اور اوپر جاتی رہتی ہیں۔ بہر حال انبیاؑ جب آئے تو کہا، خدا نہ کہ طاغوت۔ سب سے پہلا جملہ جو کہا وہ یہ تھا کہ عبادت کرو، بندگی کرو خدا کی اور اجتناب کرو، دوری اختیار کرو، بے اعتنا ہو جاؤ، طاغوت سے۔

﴿فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللهُ﴾ پس ان (امتوں) میں سے بعض کو اللہ نے ہدایت دی، ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ﴾ ان میں سے کچھ ایسے تھے جن پر ضلالت و گمراہی ٹھہر گئی، ﴿فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ پس تم زمین

---

۱. سورہ مبارکہ نحل: آیت ۳۶

۲. بحارالانوار، کتاب الایمان و الکفر، ابواب مکارم الاخلاق، باب مراتب النفس، ح ۱

میں سیر کرو، ﴿فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾ اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟ دیکھو کہ جن لوگوں پر گمراہی ٹھہر گئی، جنھوں نے پیغمبر کی تکذیب کی اور ان کی ہدایت کو قبول نہ کیا، ان کا انجام کیا ہوا۔ دیکھیے تباہ ہوجانے والے تمدنوں کو، دیکھیے ویران شدہ ملکوں اور شہروں کو، دیکھیے نابود شدہ بابل، آشور اور کلدہ کو[۱]، تاریخ میں جن کے نام کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں رہا۔ دیکھیے مصر کے فرعونوں کی طاقت کو کہ مصری معاشرے کو ایک طومار کی طرح لپیٹ دیا گیا۔ یہ چیزیں قرآن بتا رہا ہے، دیکھیے ان امتوں اور ملکوں کو جنھوں نے نبی کی باتوں کو نظر انداز کیا، ان کا انجام کیا ہوا، زوال ان کا مقدر ہے۔ بات معجزے کی بھی نہیں ہے۔ البتہ قدیم زمانے میں معجزات بھی ہوتے تھے، کیونکہ انہیں جلد تباہ ہونا تھا، اس لیے انہیں چھوڑا نہیں جا سکتا تھا کہ مثلاً طویل زمانہ گزرے پھر جا کے قومِ عاد جہنم واصل ہو۔ وہاں ان پر عذاب نازل ہو جاتا تھا، کوئی آندھی، کوئی زلزلہ، کوئی طوفان یا کوئی اور چیز انہیں تباہ کر دیتی تھی۔

بہر حال بطور کلی آخر تک دنیا یہی ہے۔ ہر معاشرہ، ہر امت جو دین کے راستے پر حرکت نہ کرے اور دین کے مطابق نہ چلے، وہ نابود ہو جائے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کے تمام لوگ مر جائیں گے، نہیں، امت کے نابود ہونے کا مطلب، ان کے قومی نظام کا نابود ہونا ہے، وہ جذب ہو جائیں گے، دوسری ملتوں کا جزو بن جائیں گے ان کی قومی پہچان بالکل ہی مٹ جائے گی۔ اب آپ کلدانیوں ہی کو تلاش کیجیے، کہاں ہیں؛ آشوریوں کو تلاش کیجیے کہاں ہیں؛ بابلیوں کو تلاش کیجیے، کہاں ہیں۔ تاریخ کے یہ عظیم تمدن، انسانیت کی ابتدائی تہذیبیں یہی تھیں، اب کہاں ہیں یہ؟ کہاں ہیں؟ کوئی خبر ہے ان کی؟ ﴿فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾ یہ سورۂ نحل میں تھا اور اب سورۂ اعراف۔

سورۂ نحل میں بطور کلی ارشاد ہوا: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا﴾ ہر امت میں ہم نے پیغمبر کو بھیجا، لیکن سورۂ اعراف میں، انفرادی طور پر انبیاؑ کا ذکر ہوتا ہے۔ حضرت نوحؑ سے بات شروع ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ﴾[۲] ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف (رسول بنا کر) بھیجا۔ ﴿فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ﴾ دیکھیے ان کی پہلی بات یہ ہے، اے میری قوم! ﴿اعْبُدُوا اللَّهَ﴾ خدا کی بندگی

۱. بابل اور آشور قبل از مسیح کے دو قدیم تمدن ہیں جن کا علاقہ بین النہرین کا ہے۔ بابلی تمدن کے زوال کے بعد کلدانی تمدن نے اس کی جگہ لی۔
۲. اعراف۔ آیت ۵۹

کرو، ﴿مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ﴾ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے؛ یعنی معبودِ حقیقی۔ ﴿إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ یقیناً مجھے تمہاری نسبت ایک بڑے سخت دن (قیامت) کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ پھر ان کی قوم نے ان کو جواب دیا کہ ہم قبول نہیں کرتے و غیرہ و غیرہ اور پھر طوفان کا ماجرا۔ اس کا ہماری بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہاں تک کہ بات پہنچتی ہے قوم عاد تک۔

ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا﴾[1] اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے (قومی) بھائی ہود کو بھیجا۔ قوم عاد کا تعلق قدیم‌ترین اقوام سے ہے، شاید ماقبل تاریخ کی اقوام سے، درست طور پر معلوم نہیں ہو سکا ہے، واضح نہیں ہے کہ یہ کون لوگ تھے اور کس زمانے میں تھے، طوفان نوحؑ کے بعد ہیں، بہت زیادہ قدیم ہیں۔ ﴿وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ﴾[2] بظاہر اسی قوم عاد کے لیے ہے، یہ لوگ پہاڑوں کے درمیان گھر بناتے تھے، بعید نہیں ہے کہ ان کا تعلق پتھر کے دور کے آخر سے ہو، جسے بعد میں سائنسدانوں نے بھی ذکر کیا ہے اور اس کی تصویر کشی کی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بہت قدیم دور کے ہیں۔ انہی کے ایک پیغمبر تھے جن کا نام حضرت ہودؑ تھا، وہ بھی ان سے یہی کہتے تھے، ﴿قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ﴾ انہوں نے کہا! اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اسی کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الہ نہیں ہے۔

﴿أَفَلَا تَتَّقُونَ﴾ اے میری قوم! آخر تم پرہیزگاری اختیار کیوں نہیں کرتے؟ اس طرح سے توحید کو قبول کروانا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ اب یہاں پر میں نے حضرت ہودؑ کی ان کی قوم کے ساتھ گفتگو اور مذاکرے کو پیش کیا ہے۔ قرآن سے ترجمے کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ ﴿قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ﴾ ان کی قوم کے برجستہ اور سر برآوردہ کافر ان سے کہتے تھے: ﴿إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ﴾ ہم تمہیں نادانی اور حماقت میں دیکھ رہے ہیں، ﴿وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ﴾ اور ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ یہ ان الزامات اور جھوٹے گمانوں میں سے ہے جو ہر دور میں داعیانِ حق کی نسبت روا رکھے گئے ہیں۔ نبوت کے بارے میں ایک بحث کا موضوع یہی ہے، شاید آخری فصل ہو، جو تہمتیں پیغمبروں پر لگائی گئیں، وہ کس قسم کی تھیں اور کیا تھیں، البتہ یہ فرعی اور ضمنی بحث ہے۔ کہتے تھے کہ تم احمق آدمی ہو، ان

---

۱. سورہ مبارکہ اعراف: آیات ۶۵ سے ۷۱

۲. سورہ مبارکہٗ شعراء: آیت ۱۴۹۔ اور تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے ہوئے (یا مہارت سے) مکانات بناتے ہو۔

پر نادانی کی تہمت لگاتے تھے۔

﴿قَالَ يَا قَوْمِ﴾ حضرت ہودؑ نے کہا: اے میری قوم! ﴿لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ﴾ میرے اندر حماقت نہیں ہے، ﴿وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ بلکہ میں تو سارے جہانوں کے پروردگار کا رسول ہوں۔ ان کی تہمت کے اور ان کی بیہودہ باتوں کے مقابلے میں اپنے کلامِ حق کو دہراتے ہیں، ﴿أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي﴾ کہ میں تمہارے پروردگار کے پیغامات پہنچاتا ہوں، ﴿وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ﴾ اور تمہارا امانتدار ناصح ہوں۔ تمہارا خیر خواہ ہوں، تمہاری بہتری چاہتا ہوں، تمہاری ترقی چاہتا ہوں، تمہاری پیش روی چاہتا ہوں کہ تمہیں خدا اور توحید کی دعوت دوں۔ ﴿أَوَعَجِبْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ﴾ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری اپنی قوم کے ایک شخص کے پاس وعظ و نصیحت کا پیغام آیا ہے تاکہ وہ تمہیں (خدا کے عذاب سے) ڈرائے؟ یعنی تمہیں اس بات سے تعجب ہوتا ہے کہ ایک انسان انہی عام انسانوں میں سے، تم جیسے حلیے میں، تمہارے جیسے لباس میں، مقامِ نبوت تک پہنچ جائے؟ ﴿وَاذْكُرُوا﴾ پھر ان کی توجہ ایک تاریخی مسئلے کی جانب دلاتے ہیں: ﴿وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ﴾ اور یاد کرو (خدا کے اس احسان کو) کہ اس نے تمہیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا۔ اس گناہ گار قوم کے بعد، جانشین بنایا، ﴿وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً﴾ تم لوگوں کو تخلیق میں، جسمانی خلقت میں، زیادہ طاقت اور قوت عطا کی، ﴿فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللهِ﴾ خدا کی نعمتوں کو یاد کرو، ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ شاید کامیابی اور فلاح و رستگاری تک پہنچ جاؤ۔

﴿قَالُوا أَجِئْتَنَا﴾ دیکھیے، دشمن بھی فوراً سمجھ جاتا ہے کہ صرف خدا کی عبادت کا کیا مطلب ہے۔ ﴿قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللهَ وَحْدَهُ﴾ انہوں نے کہا: اے ہود! کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم صرف ایک خدا کی عبادت اور بندگی کریں؟ ﴿وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا﴾ اور ان (معبودوں) کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کو ایک طرف رکھ دیں؟ بے جا اور جان دار دونوں بتوں کو۔ ﴿فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا﴾ ہمارے پاس لاؤ وہ (عذاب) جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو، ﴿إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ﴾ اگر تم سچے ہو تو۔

﴿قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ﴾ ہودؑ نے کہا (سمجھ لو کہ) تمہارے اوپر پلیدی اور غضب واقع ہوگیا ہے۔ تمہارے اپنے اندر کی رجس و پلیدی اور تمہارے پروردگار کی طرف سے عذاب اور غیظ

و غضب نے تمہیں اپنی پیٹ میں لے لیا ہے؛ بدبخت ہو تم۔ ﴿أَتُجَادِلُونَنِي﴾ کیا تم میرے ساتھ جھگڑا کرتے ہو؟ ﴿فِي أَسْمَاءٍ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ﴾ ایسے ناموں کے بارے میں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے (از خود) رکھ لیے ہیں۔ ان چیزوں پر جنہیں تم نے خود بنایا ہے اور طاقت دی ہے، ان کے لیے مجھ سے بحث و تکرار کرتے ہو؟ ﴿مَا نَزَّلَ اللهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ﴾ جن کے متعلق اللہ نے کوئی سلطانی یعنی قدرت نازل نہیں کی، یا کوئی حجت؛ حجت یعنی دلیل اور برہان۔ سلطان طاقت کے معنی میں بھی آتا ہے اور حجت، یعنی دلیل و برہان کے معنی میں بھی۔یہاں دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے خداؤں اور خداوندگاروں کی سچائی، صداقت اور استواری کے لیے کوئی حجت اور کوئی دلیل نہیں بھیجی۔ دوسری بات یہ کہ ہم کہیں کہ خدا نے انہیں کوئی طاقت نہیں دی ہے اور یہ پست، عاجز اور کمزور چیزیں جن کو خدا نے کوئی طاقت نہیں دی ہے، انہیں تم خدا کے ساتھ قرار دیتے ہو۔ ﴿فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ﴾ اچھا تو پھر تم (خدا کے عذاب کا) انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ یہ سب کہا، پھر خدا کا عذاب نازل ہوا۔

انیسویں نشست

مخالفین کے گروہ

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ۞ وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُم مُّقْتَرِفُونَ﴾

(سورہ انعام/ ۱۱۲-۱۱۳)

ہم نے کہا کہ نبوت ایک اجتماعی قیام ہے اور یہ بھی کہا کہ اس قیام کے اصولوں میں سے ایک اصول اجتماعی طبقات کی نفی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ پیغمبر خداؐ کی نبوت کے بنائے ہوئے ماحول میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ایک طرف کمزور، محروم، غریب اور غلام عوام کے طبقات ہوں اور دوسری طرف طاقتور اور منہ زور اشرافیہ کا طبقہ۔

جیسا کہ اسلام کے بارے میں ہمیں معلوم ہے البتہ تمام آسمانی ادیان اسی طرح ہی ہیں، بنیادی طور پر اسلام میں اس چیز کا کوئی فرض نہیں ہے، کوئی تصور نہیں ہے کہ ایک شخص محض کمزور ہونے اور طاقتور نہ ہونے کی وجہ سے اپنا جائز حق نہ لے سکے۔ اسلامی حکومت اور الٰہی و توحیدی نظام میں ایسا تصور ہی محال ہے۔ لہٰذا معصوم فرماتے ہیں کہ «لَنْ تُقَدَّسَ أُمَّةٌ لا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيفِ فِيهَا حَقُّهُ مِنَ الْقَوِيِّ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ»[1] یعنی اگر آپ ایک معاشرے میں دیکھیں کہ ایک کمزور انسان جو کہ کسی حکومتی منصب پر فائز نہیں ہے، کوئی سیاسی اور اجتماعی و معاشرتی عہدہ اس کے پاس نہیں ہے، ایسا آدمی، ایسا معمولی انسان منت سماجت کیے بغیر اپنا حق نہیں لے سکتا تو جان لیں کہ ایسا معاشرہ کامیاب اور مثالی معاشرہ نہیں ہے۔

---

۱. تحف العقول، باب ما روی عن امیر المؤمنین، عھدہ الی الاشتر

ایک معاشرے میں جیسا کہ اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسی طرح عمل بھی کرے، صورتحال اس طرح سے ہے کہ سب لوگ ایک ماحول کے فرزند اور ایک جسم کے اعضا ہیں کسی بھی قسم کے فرق اور امتیاز کے بغیر؛ یعنی اسلامی حکمران جیسے امیر المومنینؑ بھی ایک اسلامی معاشرے میں اسی حد تک حق رکھتا ہے جس حد تک رعایا کا ایک عام آدمی حق رکھتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں بڑے سے بڑا عہدیدار بھی ایک عام اور معمولی انسان پر اپنا رعب نہیں جما سکتا یہاں تک کہ اس سے سخت کلامی بھی نہیں کر سکتا۔

پس یہ اسلامی معاشرہ ہے۔ یہ جو کچھ کہا ہے ایک مقصد کے تحت کہا ہے، اس لیے کہا ہے تاکہ آج کی بحث اور گفتگو سے میں نتیجہ نہ نکالوں بلکہ آپ خود نتیجہ نکالیں۔ جو کچھ اس بحث میں میں کہنا چاہتا ہوں اور کہوں گا، میرے کہنے سے پہلے آپ خود اسی نتیجے تک پہنچ جائیں، یہ وہ معاشرہ ہے جو اسلام چاہتا ہے اور دنیا کے تمام توحیدی ادیان بھی اسلام ہی کی طرح ہیں۔ ایسا معاشرہ کہ جس میں دھونس دھاندلی نہ ہو، غریب طبقوں کی غربت و محرومیت کے ساتھ دولت و ثروت کی جمع آوری نہ ہو۔ اسی مکتب اور اسی دین کے امیر المومنینؑ فرماتے ہیں: «ما رَاَیتُ نِعمَةً مَوفورَةً اِلّا وَ بِجانِبِها حَقٌّ مُضَیَّع»[1] میں نے کہیں بھی دولت و ثروت کے انبار نہیں دیکھے مگر یہ کہ ان کے ساتھ ایک ضائع اور پامال حق کو بھی دیکھا ہے۔ اگر طے یہ ہو کہ دولت و ثروت کو افراد پر تقسیم کیا جائے تو پھر مسٹر راک فلر[2] کو اتنا زیادہ مال نہیں ملے گا۔

توحیدی ادیان کی منطق میں اسلامی معاشرہ اور مثالی معاشرہ ایک اس قسم کا معاشرہ ہے: اس میں دھونس دھاندلی نہیں ہے، اس میں طاقت کی زبان میں بات کرنے والا کوئی نہیں ہے، کوئی رعب نہیں جما تا اگر رعب جمانا بھی چاہے تو کوئی اسے رعب جمانے نہیں دیتا۔ اگر کوئی اسلامی نظام کے بنائے ہوئے معاشرے میں طبقاتی اختلاف کو رائج کرنا بھی چاہے تو کوئی اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا؛ کیوں؟ اس لیے کہ نظام ایسا نظام تھا جسے پیغمبر اکرمؐ نے تشکیل دیا تھا۔ آپ نے ان ماہر درزیوں کو

---

۱. الامام علی صوت العدالة الانسانیة، علی ہامة التاریخ

۲. جان راک فلر امریکہ کا ایک بہت بڑا سرمایہ دار تھا۔ اس نے اپنے نام سے جو سینٹر بنایا تھا اس نے بعد میں صہیونی لابیوں کے نفوذ اور اثر و رسوخ کی وجہ سے دنیا کے سیاسی حادثات و واقعات میں موثر کردار ادا کیا۔ مثال کے طور پر محمد رضا شاہ کے اس مرکز کے ساتھ قریبی رابطے کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

دیکھا ہو گا کہ جب ایک لباس سیتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لباس پارہ پارہ ہو جائے، لباس کے تمام حصے سوراخ سوراخ ہو جائیں لیکن اس کی سلائی باقی رہتی ہے اور لباس کا ناپ اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے۔ اسلامی معاشرے کو (دشمنوں نے) سوراخ سوراخ کر دیا تھا لیکن معاشرے کا ڈھانچہ ابھی اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ اس معاشرے کے درزی پیغمبر خداؐ ہیں، اس کے معمار اور صانع رسول اللہؐ ہیں۔ خدا اور پیغمبر خداؐ کا بنایا ہوا نظام اس طرح کا نظام ہے۔ اس میں زبر دستی نہیں ہے، دھونس دھاندلی نہیں ہے، استثمار نہیں ہے، استبداد نہیں ہے، ایک انسان یا چند انسانوں کی دوسرے انسانوں پر قانون سے ماورا حکومت نہیں ہے۔ اس طرح کا ایک معاشرہ کہ جس میں خدا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان اس طرح اکٹھے رہیں، ایسے معاشرے میں جہالت نہیں ہے، لاعلمی نہیں ہے، خرافات پرستی نہیں ہے۔ اس معاشرے میں تمام لوگ مجبور اور پابند ہیں کہ فکر کریں۔ ضروری ہے کہ سب اپنا راستہ تلاش کریں، اور جب راستہ ڈھونڈ لیں تو پھر ضروری ہے کہ اسے طے کریں، اس پر چلیں۔

اس معاشرے میں سب اس چیز کے پابند اور ذمہ دار ہیں کہ کمزوروں، محروموں اور مظلوموں کے حقوق کا دفاع کریں۔ اس معاشرے میں کوئی یہ کہنے کا حق نہیں رکھتا کہ میرے اپنے کام بہت زیادہ ہیں، میرے اپنے دردسر بہت زیادہ ہیں، میری اپنی مشکلات کافی ساری ہیں، دوسروں کے مسائل حل کرنے کا میرے پاس وقت نہیں ہے؛ اس لیے کہ سب اکٹھے ہیں، سب ایک پیکر کے اجزا اور ایک جسم کے اعضا ہیں، تو کیا ایسا کہنے کا حق رکھتے ہیں؟ اس معاشرے میں سستی نہیں ہے، اس معاشرے میں اختلاف و افتراق نہیں ہے، اس معاشرے میں بغیر سوچے سمجھے آنکھیں بند کر کے زید، عَمرو اور بکر کے پیچھے چلنے کی گنجائش نہیں ہے؛ اللہ کے نبی اس طرح کا ایک معاشرہ بنانا چاہتے ہیں؛ غور فرمائیں اور اس معاشرے کی خصوصیات کو یاد رکھیں جسے پیغمبر خداؐ وحی الٰہی اور خدائی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مقدس اور طاقتور ہاتھوں سے بنانا چاہتے ہیں۔ علم و دانش، بصیرت و آگاہی، عدل و انصاف، مساوات، معاشرتی طبقات کی نفی، استثمار کی نفی، دولت و ثروت کے ارتکاز کی نفی، استبداد اور قانون سے ماورا حکومت کی نفی، باطل کی طرفداری کی نفی اور حق و حقیقت کی حمایت و طرفداری کی پابندی اس معاشرے کی عظیم اور نمایاں خصوصیات ہیں۔

میری گفتگو کا مرکزی نقطہ یہاں پر ہے جو کہ میری آج کی بحث سے بھی مربوط ہے۔ اگر ایک پیغمبر ایک جاہل معاشرے میں آئیں، اپنی بات بھی کریں، اپنا ہدف اور مقصد بھی بنائیں اور یہ بتائیں کہ وہ کس قسم کا معاشرہ بنانا اور کس طرح کی دنیا بسانا چاہتے ہیں، یہ بتائیں کہ وہ معاشرتی نظام کو کس نہج پر چلانا چاہتے ہیں، اگر پیغمبر یہ باتیں کریں تو اس جاہل معاشرے میں کون ان کے مقابلے میں کھڑے ہوں گے؟

روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ سب سے پہلے وہ لوگ پیغمبر کی مخالفت کریں گے جو طبقاتی اختلاف کی وجہ سے زندہ ہیں۔ وہ زندہ ہیں کیونکہ کچھ لوگوں کو بےوقوف بنا سکتے ہیں، چند بے گناہ انسانوں کی توانائیوں سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اگر طے یہ ہو کہ وہ ان انسانوں کے ساتھ ایک ہی صف میں، ایک ہی طبقے میں کھڑے ہوں تو پھر کس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے؟ اس کے بعد کن کو بےوقوف بنائیں گے اور کن کا استحصال کریں گے؟ یہ لوگ مخالفت کریں گے۔ ان کے علاوہ اس نبی کی دعوت اور اس قسم کے معاشرے اور نظام کے قیام کی مخالفت کرنے والوں میں سرفہرست وہ لوگ ہوں گے جو مال و دولت و ثروت جمع کرنے والے ہیں۔ وہ لوگ جو ہمیشہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر اپنی تجوریاں بھرنے والے ہیں۔

اگر طے یہ ہو کہ اس طرح کے ایک معاشرے میں (کہ جس میں دولت و ثروت اور ثروت اندوزی ہی کچھ لوگوں کا «شریفانہ» مشغلہ ہو کہ کھاتے پیتے ہوں اور بڑائی دکھاتے ہوں) ایک رسول آئے، ایک مصلح آئے اور کہے کہ جناب ثروت اندوزی ممنوع ہے؛ تو ظاہر ہے کہ یہ شخص اس پیغمبر کی مخالفت کرے گا۔ یہ ایک طبیعی چیز ہے۔ پس یہ بھی ایک گروہ۔

ایک گروہ دولت و ثروت اکٹھی کرنے والوں کا ہے جو اس نبوی دعوت اور الٰہی رسالت کی مخالفت کرے گا؛ اس لیے کہ جونہی ایک معاشرے میں حقیقی معنوں میں «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ» داخل ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فرعون اس معاشرے سے رختِ سفر باندھ گیا، باہر چلا گیا، یا پھر اس معاشرے کا ایک عام فرد بن گیا، «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ» کا معنی یہی ہے۔ اگر طے یہ ہوا کہ «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ» اپنی حقیقی صورت میں ایک معاشرے کی تعمیر کا منشأ اور بنیاد قرار پائے تو پھر جو معاشرہ «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ» کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے،

اس میں خدا سپریم پاور ہوتا ہے نہ کہ فرعون۔ خدا ہوتا ہے نہ کہ فرعون و ہامان، نہ نمرود نہ شداد[۱] نہ معاویہ؛ پس انتہائی واضح ہے کہ فرعون و نمرود اور تاریخ کے دوسرے مستبد اور ڈکٹیٹر حکمران انبیاؑ کی اس قسم کا معاشرہ تشکیل دینے کی دعوت کی سختی سے مخالفت کریں۔ نبوتوں اور رسالتوں کے مخالفین و معاندین کا ایک طبقہ یہ بھی ہے۔

ایک اور طبقہ احبار اور راہبوں (علما اور مذہبی پیشواؤں) کا ہے، کہ جن کا سروکار عام لوگوں کی فکر اور ان کے دل و دماغ سے ہے، اور وہ لوگوں کو تعلیم دینے کی وجہ سے مجبور ہیں کہ اپنے اجتماعی و معاشرتی مقام و مرتبے کو محفوظ رکھیں۔ اب اگر یہ تعلیم ایک صحیح تعلیم ہو، ایک زندگی ساز، ایک بصیرت افروز، ایک آگہی بخش تعلیم ہو تو اس طبقے کے لیے بھی اپنی عزت و حیثیت، معنوی مقام و منزلت اور مادی و منصبی فوائد و ثمرات کا باقی رکھنا ممکن نہیں رہے گا؛ لہٰذا احبار اور راہبوں کا طبقہ ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ لوگوں کو جہالت و لاعلمی کے اندھیرے میں رکھے۔ حضرت عیسیٰؑ کا جہاد احبار اور راہبوں کے مدمقابل تھا اس سے پہلے کہ بادشاہ روم تک پہنچیں؛ البتہ اپنے زمانے میں نہ پہنچ سکے تھے۔ وہ کون تھے جو اس دور کے پست یہودی معاشرے میں مسیحی دعوت کے خلاف تھے؟ یہودیوں کے احبار تھے، یہودیوں کے علما تھے، حالانکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو اچھی طرح جانتے تھے۔

ظہور اسلام کے زمانے میں وہ کون لوگ تھے جو نبوی تحریک، محمدیؐ تحریک اور اسلامی بعثت کے مضبوط ہونے اور معاشرے میں جڑیں پکڑنے کے حق میں نہیں تھے؟ وہی لوگ مخالف تھے کہ اگر پیغمبر خداؐ آتے، وہ حقیقی تعلیمات آتیں، اسلام کی لذت بخش اور معنوی تشنگی کو برطرف کرنے والی دعوت آتی، خوابیدہ ذہنوں کو بیدار کرتی، حقیقت کو واضح کرتی، ابہامات و اشکالات اور جہالتوں کو دور کرتی تو ان کی زندگی اور سرداری خطرے میں پڑ جاتی۔ ظاہر ہے کہ جہاں پر اسلام ہو وہاں پر کعب الاحبار[۲] اور عبداللہ

---

۱. عاد کا بیٹا تھا جو باپ کے مرنے کے بعد قوم عاد کا فرمانروا بن گیا۔ حضرت ہودؑ نے اس کے سامنے بہشت کی جو توصیف و تعریف کی تو اس نے طے کیا کہ حضرت ہودؑ کے خدا کی بہشت سے بہتر ایک بہشت بنائے۔ ایک عظیم محل تعمیر کروایا جس کی ایک اینٹ سونے کی تو دوسری چاندی کی تھی اور مختلف پھلدار درختوں پر مشتمل باغ لگوایا جس میں شہد، دودھ اور لولو و مرجان کی نہریں تھیں۔ جب محل اور باغ کی تعمیر مکمل ہو گئی تو وہ سیر کے لیے وہاں آیا۔ جب گھوڑے سے اترنے لگا تو ابھی پاؤں زمین پر نہیں لگے تھے کہ حضرت عزرائیلؑ نے اس کی روح قبض کرلی۔

۲. ابو اسحاق کعب بن ماتع حمیری یمن کا رہنے والا یہودی عالم تھا جو پیغمبر خداؐ کی رحلت کے بعد دوسرے خلیفہ کی خلافت کے اوائل میں اسلام لے آیا تھا اور مدینہ میں رہنے لگا تھا۔ اس نے صحابہ سے قرآن سیکھا۔ یہودی علما کی کتابوں سے آشنائی و آگہی کی وجہ سے کعب الاحبار کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے بہت زیادہ جھوٹی روایات اس دعوے کے ساتھ بیان کیں کہ یہ تورات سے منقول ہیں جو کہ اسرائیلیات کے نام سے معروف ہیں۔

بن سلّام[۱] کی من گھڑت باتیں نہیں چلیں گی۔ واضح ہے کہ جب انسانوں کے ذہنوں اور افکار و خیالات پر حق و حقیقت کا سورج اپنی نورانی کرنیں بکھیرے گا تو ان میں پائی جانے والی خرافات اور ظلمات خود بخود زائل اور ختم ہو جائیں گی؛ لہٰذا جونہی نبیؐ آتے ہیں، نبوی معاشرہ علم و آگہی کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، الٰہی اور توحیدی معاشرہ، علم و دانش، بصیرت و آگہی اور آزاد فکری و روشن فکری کی اساس پر تشکیل پاتا ہے، جونہی اس قسم کے معاشرے کے قیام کی بات ہوتی ہے تو جو گروہ سب سے پہلے خطرہ محسوس کرتے ہیں ان میں سے ایک احبار اور راہبوں کا طبقہ بھی ہے؛ وہی طبقہ کہ عوام کی آگہی جس کے نقصان میں ہے، لوگوں کی بصیرت جس طبقے اور اس کی حامی طاقتوں کے نقصان میں ہے، اس طبقے کے لوگ خود بھی نقصان اٹھاتے ہیں اور وہ طاقتیں بھی جو ان کی حامی اور اتحادی ہیں۔ اگرچہ وہ مذہبی طاقتیں نہیں ہیں، سیاسی طاقتیں ہیں، وہ بھی نقصان اٹھاتی ہیں؛ وہ بھی خطرہ محسوس کرتی ہیں۔

جب ایک معاشرے میں ایک نئی فکر سامنے آتی ہے اور طے یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے افکار زیادہ ادراک اور شعور و آگہی کی طرف حرکت کریں تو اس چیز اور انسانی طبیعت کا تقاضا یہ ہے کہ پیر و جوان سبھی اس جدید فکری تحریک کے پیچھے چل پڑیں۔ انسان نئی بات اور نئی فکر کو زیادہ پسند کرتے ہیں؛ جو چیز ان کے ذہنوں کے لیے زیادہ قابل قبول ہو اسے زیادہ اور جلدی قبول کرتے ہیں؛ مزید یہ کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ خرافات جھوٹ ہیں، مذہبی تحریفات اور تغیرات و تبدّلات جھوٹ ہیں۔ لہٰذا اگر ایک روشن کلام اور ایک استدلالی ذہن ان خرافات کو، ان کے بے بنیاد ہونے کو اور ان کے موہوم ہونے کو ثابت کرے تو لوگ آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن تاریخ میں یہی احبار اور راہب تھے کہ جنہوں نے انبیا کے کلام و بیان کے روشن اور واضح ہونے کے باوجود لوگوں کو ان کی پیروی اور ان کا گرویدہ ہونے سے روکا۔ اس کے باوجود کہ انبیائے کرامؑ واضح دلائل، روشن براہین اور آشکار حجت کے ساتھ آئے، ہر جگہ نور ان کے پاس تھا، ہر جگہ انہوں نے انسانوں کے ذہنوں کو صاف کیا، انہوں نے کبھی بھی پیچیدہ اور مبہم باتیں نہیں کیں، کبھی بھی لوگوں کو فلسفی اصطلاحات کے چکر میں نہیں ڈالا،

۱۔ عبداللہ بن سلّام بن الحارث اسرائیلی، بنی قینقاع کے یہودیوں کے بزرگوں اور علما میں سے تھا جو کہ ایک قول کے مطابق ہجرت کے پہلے سال اسلام لایا تھا۔ تیسرے خلیفہ کے دور میں وہ اور کعب الاحبار خلیفہ کے قریبی افراد اور مشیروں میں سے تھے اور یہی چیز اسلامی معاشرے کی حکومت میں بہت زیادہ انحرافات کا باعث بنی تھی۔ عبداللہ بن سلّام معاویہ کے دور میں بھی اس کے خاص درباریوں میں سے تھا اور اس نے حضرت علیؑ کی بیعت نہیں کی تھی۔

لوگوں کے سامنے فلسفہ بافی نہیں کی، لوگوں کے ساتھ صریح، واضح اور کھری باتیں کیں؛ اب چاہیے تو یہ تھا کہ لوگ جلدی قبول کر لیتے، انبیائے الٰہی کے کلام کی پختگی اور صحت و درستی کو بہت جلد درک کر لیتے۔ کیا وجہ ہے کہ اس حد تک دشمنی، تعصب اور ہٹ دھرمی دکھائی جاتی تھی اور انبیاؑ کی دعوت کو جلد اور آسانی کے ساتھ قبول نہیں کیا جاتا تھا؟ کیوں؟ یہی کاہن، احبار اور راہب اور وہی طبقہ کہ قرآن کریم جسے «احبار و رہبان» کے نام سے یاد کرتا ہے، یہ رکاوٹ بنتے تھے، لوگوں کو غلط فکری روشوں اور موروثی خرافاتی افکار و خیالات کی زیادہ سے زیادہ پابندی پر ابھارتے تھے۔ یہ بھی پیغمبر کے آنے سے خائف رہتے تھے چونکہ جانتے تھے کہ اگر پیغمبرؐ آئے، اگر نبی مبعوث ہو، اگر وہ معاشرہ تشکیل پا جائے کہ جس معاشرے میں علم و آگہی ہے، جس معاشرے میں نور اور روشنی ہے، جس معاشرے میں فکری رشد و ارتقا ہے، جس معاشرے میں سب لوگ یا عالم ہیں یا طالب علم، تو ایسے معاشرے میں پھر اَن پڑھوں، جاہلوں، خود پسندوں اور ان لوگوں کی کوئی جگہ نہیں رہتی جو انسانوں کو جہالت و نادانی اور خرافات کی تاریکیوں میں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے بھی پورے شدّ و مد کے ساتھ انبیائے کرام، الٰہی دعوتوں اور تاریخی بعثتوں کی مخالفت کی۔ تو یہ ہو گئے چار طبقے۔

اتفاقاً یہ چار طبقے جنہیں ہم نے ذہنی تجزیہ و تحلیل کے ذریعے آپ کے لیے مشخص و معین کیا، قرآن میں ان کا نام آیا ہے۔ البتہ مختلف نظاموں اور حکومتوں میں جو افراد بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر فائز رہے ہیں، سربراہ رہے ہیں، کلیدی عہدوں پر براجمان رہے ہیں، قرآن کریم میں انہیں «مَلَأ» کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے اور ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ﴿قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ﴾[1] «مَلَأ» وہ لوگ ہیں جو آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں؛ «یَملَئونَ العَین» وہ شان و شوکت و جاہ و حشمت والے لوگ، وہ لوگ کہ جب چلتے ہیں تو ان کا زرق و برق، ان کا کروفر اور ان کے آگے پیچھے چلنے والی نوکروں چاکروں اور محافظوں کی فوج ظفر موج ہر انسان کو ان کے سامنے خضوع و خشوع اور تعظیم و تکریم پر مجبور کر دیتی ہے۔ «مَلَأ» وہ آنکھوں کو خیرہ کرنے والے، انبیاؑ کے مخالفین کا ایک طبقہ یہ ہے۔ کس کی طرح؟ فرعونی جاہلانہ معاشرے میں ہامان کی طرح۔ ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا هَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا﴾[2] ہامان

---

۱. سورہ مبارکہ اعراف: آیت ۶۶۔ اس کی قوم کے سرداروں نے جو کہ کافر تھے، کہا۔

۲. سورہ مبارکہ غافر: آیت ۳۶۔ اور فرعون نے کہا کہ اے ہامان! میرے لیے ایک بلند و بالا محل بنا۔

فرعون کے سامنے جی حضوریاں کرنے والا ہے اور فرعون کی اس نوکری اور جی حضوری کے صدقے میں وہ فرعون کے بعد تمام لوگوں کا سردار اور ان کے سیاہ و سفید کا مالک ہے، بقول شاعر «مگسی را کہ تو پرواز دھی شاہین است»[۱] جس مکھی کو تو اڑائے اور پرواز کرنا سکھائے، وہ مکھی نہیں بلکہ شاہین ہے۔ ہامان وہی مکھی ہے کہ جس کی فرعون نے تربیت کی ہے اور شاہین کا کام کرتی ہے۔ ہامان ایک کمزور شخص ہے، بد بخت ہے، اکیلا ہے، ایک عام آدمی اسے آسانی سے تہہ تیغ کر سکتا ہے لیکن فرعون کی آشیر باد اور پشت پناہی کی وجہ سے سب کچھ ہے؛ لہٰذا جب راستے میں آرہا ہوتا ہے اگر آپ دیکھیں تو یہ سمجھیں گے گویا نور اور روشنیوں کے ہالے میں ایسے چلا آرہا ہے کہ انسان کے اندر اس کی طرف نگاہ کرنے کی طاقت و ہمت بھی نہیں ہے۔ ہٹو، رستہ چھوڑ دو، دور چلے جاؤ، آگے آجاؤ، کون ہے؟ ہامان آرہا ہے۔

یا معاویہ کے بنائے ہوئے جاہلانہ نظام میں مغیرہ بن شعبہ[۲] اور زیاد بن ابیہ[۳] جیسے لوگ، یہ وہی «مَلَأ» ہیں۔ معاویہ کے تخت حکومت کو اس طرح محکم اور مضبوط کر کے رکھتے ہیں کہ معاویہ جس طرف بھی دیکھے دوست دیکھے، مشیر دیکھے، خیر خواہ دیکھے۔ قرآن میں اس طبقے کو «مَلَأ» سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اشرافیہ کے طبقے کو قرآن میں «مُتْرَفِین» کے نام سے یاد کیا گیا ہے، وہ لوگ جو «تُرَف» میں مبتلا ہیں یعنی دولت و ثروت کے انبار لگانے میں مصروف ہیں، انتہائی زیادہ دولت و ثروت جو ان کی بد بختی، ظلم و جور اور دوسروں کی حق تلفی کا سبب ہے؛ «تُرَف»۔ وہ آیت جس کی ابھی تلاوت کریں گے، اسی چیز کو

---

۱. بندہ خویشتنم خوان کہ بہ شاھی برسم　　　مگسی را کہ تو پرواز دھی شاہین است (سعدی شیرازی)
ترجمہ: مجھے اپنا نوکر اور غلام کہہ کر خطاب کر تا کہ میں بھی بادشاہت تک پہنچ جاؤں اس لیے کہ جس مکھی کو تو اڑائے اور پرواز کرنا سکھائے وہ مکھی نہیں بلکہ شاہین ہے۔

۲. مغیرہ بن شعبہ طائف کا رہنے والا تھا جو ہجرت کے پانچویں سال مدینہ آیا اور اسلام قبول کیا۔ پیغمبر خداؐ کی رحلت کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں ہونے والے اجتماع کے کرتا دھرتا افراد میں سے تھا۔ امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد معاویہ کے دربار میں چلا آیا۔ یزید کی ولی عہدی کی تجویز مغیرہ ہی نے دی تھی۔

۳. زیاد بن ابیہ صدر اسلام کے ظالموں میں سے ایک تھا۔ اس کی ماں کا نام توسمیہ تھا لیکن باپ کا نام معلوم نہیں تھا اسی وجہ سے اسے زیاد بن ابیہ (اپنے باپ کا بیٹا) کہتے تھے۔ دوسرے خلیفہ کے زمانے میں ابوسفیان نے اسے اپنی طرف منسوب کیا لیکن امام علیؑ نے اس کام پر اس کی سرزنش کی۔ زیاد نے بعد میں امام علیؑ کی بیعت کی اور جنگ جمل کے بعد کچھ عرصہ امامؑ کی طرف سے بصرہ کا گورنر بھی رہا۔ لیکن معاویہ نے حیلے کے ساتھ اسے اپنا بھائی قرار دیا اور اسے امام علیؑ سے جدا کر دیا اور صلح امام حسنؑ کے بعد بصرہ اور کوفہ کی حکومت اسے دے دی۔ اس کے بیٹے عبیداللہ نے کربلا میں امام حسینؑ کو شہید کیا۔

بیان کر رہی ہے؛ آیت کہتی ہے ہر امت میں جب ہم نے پیغمبر کو بھیجا تو اس امت کے مترفین، اس امت کی اشرافیہ، اس امت کے دولتمند و ثروتمند افراد نے سب سے پہلے مخالفت کی؛ وہ سب سے پہلے لوگ تھے جنہوں نے مخالفت کے جھنڈے اٹھائے۔ یہ بھی ایک طبقہ ہے۔

فکری رہنماؤں کے طبقے کو قرآن کریم «احبار و رہبان» کے نام سے ہی یاد کرتا ہے ﴿إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ﴾[1] اور ان استبدادی طاقتوں کے طبقے کو میرے خیال میں (یہاں خیال و گمان کہہ رہا ہوں) میرے گمان میں «طاغوت» کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔ اگر چہ طاغوت ایک عام لفظ ہے لیکن چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں ہر جگہ طاغوت اللہ کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے اور قرآن طاغوتوں کو انتہائی اہم منصوبوں اور عہدوں کا مالک بتاتا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ طاغوت ایک جاہلانہ نظام کا اعلیٰ‌ترین عہدہ اور منصب شمار ہوتا ہے۔ قرآن ایک مقام پر فرماتا ہے: ﴿الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ﴾[2] مومن خدا کے راستے میں اور کافر طاغوت کے راستے میں (طاغوت خدا کے مقابلے میں ہے) جنگ اور جدوجہد کرتا ہے۔ ایک اور مقام پر فرماتا ہے: ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ﴾[3] میرے خیال میں قرآن میں ابتدا سے انتہا تک تقریبا آٹھ بار طاغوت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ استعمال اور تعبیر کا انداز ایسا ہے کہ جب انسان دیکھتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ طاغوت سے مراد معاشرے پر حاکم وہی استبدادی طاقتیں اور قوتیں ہیں۔

اچھا تو یہ چار طبقے انبیاؑ کے مخالف و معاند ہیں؛ نہ صرف حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں، نہ صرف حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں، نہ صرف حضرت محمد مصطفیٰؐ کے دور میں بلکہ تاریخ کے ہر دور میں۔ جہاں بھی حق کی آواز بلند ہوئی، جس جگہ بھی انبیائے الٰہی اور آسمانی کتابوں کی پیروی کی دعوت دی گئی ان چار طبقوں نے مخالفت پر کمر کَس لی؛ یا ایک ہی وقت میں یا یکے بعد دیگرے۔ یہ ایک قاعدۂ کلیہ ہے اور یہاں پر ان آیات کریمہ کا یہ سبق آموز نکتہ ہے۔ آپ کی اجازت سے میں آیات کو پڑھتا ہوں کیونکہ ہمارا وقت ختم ہو رہا ہے۔

---

۱. سورہ مبارکہ توبہ: آیت ۳۴

۲. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۷۶

۳. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۲۵۷

سب سے پہلے، پہلی آیت کے ابتدائی حصے میں خدا فرماتا ہے کہ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا﴾[1]، ﴿كَذٰلِكَ﴾ یعنی اسی طرح۔ اسی طرح یعنی کیا؟ یعنی تیری طرح۔ اے میرے نبی جس طرح تو اپنے بارے میں دیکھ رہا ہے، اسی طرح ﴿جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ﴾ ہم نے ہر نبی کے لیے قرار دیئے ہیں ﴿عَدُوًّا﴾ دشمن، مخالف ﴿شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ کہ یہ دشمن جنی و انسی شیطان ہیں۔ ﴿عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ﴾ یہ شیطان جو کہ پیغمبر کے دشمن ہیں، ان میں سے بعض، بعض دوسروں کو الہام کرتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں۔ بعض اوقات احبار اور راہبوں کا طبقہ ملأ کے طبقے کو درس دیتا ہے، بعض اوقات ملأ کا طبقہ احبار اور راہبوں کو درس دیتا ہے، بعض اوقات مترفین دونوں طبقوں کو درس دیتے ہیں اور غالباً تینوں طبقے طاغوت سے سیکھتے ہیں۔ ﴿يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ﴾ ان دشمنوں میں سے بعض، بعض دوسروں کو الہام کرتے اور تعلیم دیتے ہیں، سکھاتے ہیں، ﴿زُخْرُفَ الْقَوْلِ﴾ دل موہ لینے والی، دلفریب اور چکنی چپڑی باتیں، بظاہر انتہائی پُرکشش باتیں، جیسا کہ فرعون کہتا ہے کہ ﴿ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَى﴾[2] مجھے اس موسیٰ کو قتل کرنے دو، کس لیے؟ کیوں قتل کرنے دو؟ ﴿إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ﴾ اس لیے کہ مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں موسیٰ تمہارا دین تبدیل نہ کر دے۔ یہ فرعون کی بات ہے۔ فرعون اس چیز سے ڈرتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ آئیں اور لوگوں کا دین تبدیل نہ کردیں، اس طرح کی دلفریب باتیں، ﴿زُخْرُفَ الْقَوْلِ﴾ بظاہر پُرکشش باتیں، ﴿غُرُورًا﴾ لوگوں کو دھوکہ دینے اور انہیں جہالت و نادانی کی تاریکیوں میں رکھنے کے لیے، پس یہ لوگوں کو اور ایک دوسرے کو دھوکے میں رکھتے ہیں۔

﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ﴾ اگر خدا چاہتا اور ارادہ کرتا تو یہ لوگ یہ کام نہیں کر سکتے تھے، اس کام کے وسائل ہی ان کے لیے فراہم نہ ہوتے۔ اگر خدا چاہتا تو یہ تمام مخالف و معاند طبقے ایک لمحے میں خاکستر ہو جاتے، تباہ و برباد ہو جاتے، خدا یہ کر سکتا تھا؛ لیکن سنتِ الٰہی اس پر نہیں ہے، خدا کا قانون اس پر نہیں ہے۔ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ وہ اپنی دشمنی کریں تاکہ مومن و غیر مومن کا فرق واضح ہو۔ رستہ تھوڑا سا ناہموار ہو تاکہ جن کی رانیں، جن کی پنڈلیاں مضبوط ہیں، دوڑ سکتے ہیں، جا سکتے ہیں، یہ پہچانے جا سکیں۔ ہموار اور پختہ راستے پر تو سبھی چند قدم چل سکتے ہیں۔ ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ﴾ اگر

---

۱. سورہ مبارکہ انعام: آیت ۱۱۲

۲. سورہ مبارکہ مومن: آیت ۲۶

تیرا پروردگار چاہتا، تیرا خدا ارادہ کرتا تو یہ اس طرح کی دشمنی نہ کر سکتے لیکن خداوندِ متعال اس سنت اور قانون کے خلاف ہرگز عمل نہیں کرتا جو اس نے خود دنیا میں بنایا ہے۔ ﴿فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ﴾ انہیں اپنے افترا، تہمت اور جھوٹ کے ساتھ ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ اپنے حال پر چھوڑنے سے کیا مراد ہے؟ یعنی ان کی باتوں کی وجہ سے پریشان نہ ہوں، غمگین نہ ہوں، دلگیر نہ ہوں، سست نہ ہوں، اپنا رستہ نہ چھوڑیں۔

﴿وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ﴾[۱] ان بظاہر پرکشش اور دلفریب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ جو دل آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ ان دلفریب اور جھوٹی باتوں اور پروپیگنڈے سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ انبیاؑ کی دعوت کے خلاف جو پروپیگنڈہ ہوتا ہے، حق و حقیقت اور توحید کی سچی باتوں کے خلاف جو زہریلا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، یہ جھوٹا اور زہریلا پروپیگنڈہ، یہ بظاہر پرکشش اور دلفریب پروپیگنڈہ دلوں کو دھوکہ دیتا ہے، اپنی طرف کھینچتا ہے، لیکن کن کے دلوں کو؟ ﴿وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ﴾ ان کے دلوں کو جو آخرت پر ایمان اور یقین نہیں رکھتے؛ لہٰذا جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اتنی آسانی سے ان جھوٹے پروپیگنڈوں کا شکار نہیں ہوتے اور دھوکہ نہیں کھاتے۔ ﴿وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ﴾ تاکہ اسے غور سے سنیں ان کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ﴿وَلِيَرْضَوْهُ﴾ اور تاکہ یہ دل ان باتوں سے خوشحال ہو جائیں ﴿وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُم مُّقْتَرِفُونَ﴾ اور تاکہ انجام دیں، مرتکب ہوں اس کے جس کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دیکھیں اس آیت میں خدا نے اجمالی طور پر اس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تمام انبیاؑ کے دشمن ہیں، جنی و انسی دشمن، کھلم کھلا اور خفیہ دشمن، اور یہ دشمن ایک دوسرے کو الہام کرتے ہیں، درس دیتے ہیں، ایک دوسرے کو سکھاتے ہیں۔ ان آیات میں صرف یہی ہے۔

ان آیات کے بعد سورۂ مومن کی چند آیات پڑھتے ہیں ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا﴾[۲] بتحقیق ہم نے بھیجا موسیٰؑ کو اپنی آیات کے ساتھ، اپنی نشانیوں کے ساتھ ﴿وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ﴾ اور واضح و آشکار حجت و دلیل یا قدرت کے ساتھ۔ وہ آشکار قدرت، واضح حجت یا روشن دلیل کیا تھی؟ حضرت موسیٰؑ کی قوی

---

۱. سورہ مبارکہ انعام: آیت ۱۱۳

۲. سورہ مبارکہ غافر: آیات ۲۳ سے ۲۵

منطق، آپ کی برحق گفتگو، آپ کا عصا، آپ کا ید بیضا۔ ہم نے ان چیزوں کے ساتھ موسیٰؑ کو بھیجا کہ جن کی وجہ سے ہر خاص و عام ان کی بات کو قبول کر لے۔ کن کی طرف بھیجا؟ کن کے مقابلے پر بھیجا؟ اس معاشرے میں حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں کون تھے؟ اگر آیات کو تھوڑے تدبر و تفکر کے ساتھ پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ بات کتنی واضح اور روشن ہے؛ اتنے اہم اجتماعی و معاشرتی مسائل، محکم آیات کے اندر، آیات کے ظواہر کے اندر، اتنی وضاحت کے ساتھ۔ کن کے مقابلے پر؟ کن کی طرف؟ ﴿إِلَىٰ فِرْعَوْنَ﴾ فرعون کی طرف، اور کس کی طرف؟ ﴿وَهَامَانَ﴾ ہامان کی طرف، فرعون کا وزیر، فرعون کی سلطنت کے بڑے عہدیداروں میں سے ایک، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی اشرافیہ میں سے ایک فرد، وہی ملأ۔ اور کون؟ ﴿و قارون﴾ قارون کون ہے؟ قارون ایک ثروتمند ہے، قارون ایک مالدار ہے، قارون سربراہ تو نہیں ہے، قارون معاشرے کا بادشاہ اور سلطان تو نہیں تھا، فرعون تو نہیں تھا، اصولاً قارون تھا بھی بعد میں، لیکن پھر بھی خدا فرما رہا ہے کہ اس کی طرف بھی بھیجا، اس کے مقابلے پر بھی بھیجا۔ یعنی حضرت موسیٰؑ کے لیے فرعون اور قارون برابر ہیں۔ جس طرح وہ فرعون کے خلاف جنگ کرتے ہیں، جس طرح ہامان کے خلاف جنگ کرتے ہیں اسی طرح قارون کے خلاف بھی جنگ کرتے ہیں۔

قارون کا جرم یہ ہے کہ اس نے دولت و ثروت کو ذخیرہ کر رکھا ہے، لوگوں کے اموال کو اپنے لیے جمع کر رکھا ہے اسی لیے حضرت موسیٰؑ اس کے خلاف بھی جنگ کرتے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ فرعون سربراہ مملکت ہے وہ ایک طبقہ ہے؛ ہامان جو اس کے ساتھ ہے وہ دوسرا طبقہ ہے؛ قارون کہ جس کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، دولتمند ہے۔ خزانہ دار ہے وہ ایک اور طبقہ ہے؛ باوجود اس کے کہ تین طبقے ہیں تینوں کا جواب ایک ہے، حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں تینوں ایک جیسا موقف اپناتے ہیں، ایک ہی بات کرتے ہیں، کیا کہتے ہیں؟ ﴿فَقَالُوا سَاحِرٌ كَذَّابٌ﴾ سب نے کہا موسیٰؑ جھوٹے جادوگر ہیں۔ ﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا﴾ جب موسیٰؑ ہماری طرف سے حق لے کر ان مخالفین کے پاس آئے، حق کو بیان کیا تو انہوں نے کیا کہا؟ کیا خاموش رہے؟ کیا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہے کہ موسیٰؑ آئیں اور ان کی جڑیں کاٹ دیں، ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیں؟ ہرگز نہیں؛ جس طرح کہ حضرت موسیٰؑ کا مجوزہ نظام ان کی زندگی کے لیے خطرے

کی گھنٹی بجا رہا تھا وہ بھی پوری طاقت کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے مقابلے پر نکل آئے، کیا کہا؟ ﴿قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ﴾ قتل کر دو ان لوگوں کے جوان بیٹوں کو جو موسیٰ[1] کے ساتھ ایمان لے آئے ہیں اور موسیٰ کے ساتھ مل چکے ہیں۔ جو لوگ اس نو وارد نبی کی فکر، اس جدید، روشن اور زندگی ساز فکر پر ایمان لے آئے ہیں ان کے بیٹوں کو قتل کر دو۔ قتل کرو تاکہ یہ کل ہمیں دھمکا نہ سکیں، قتل کرو تاکہ کل ان کے شعلے ہمیں جلا کر راکھ نہ کردیں، ان کے جوانوں کو قتل کر دو۔

﴿وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ﴾ اور زندہ رکھو ان کی بیٹیوں کو۔ بیٹیوں کو کیوں زندہ رکھو؟ یہ ایک مفصل بحث ہے۔ اس لیے کہ ان کی نسل مخلوط ہو جائے، اس لیے کہ اخلاقی بے راہروی کا شکار ہو جائیں، اس لیے کہ خواہشات کی اسیر ہو جائیں، اس لیے کہ ان کی عزتِ نفس مجروح ہو جائے؛ اس سلسلے میں مختلف وجوہات بیان کی گئی ہیں۔

لیکن اس کے بعد فرماتا ہے کہ ﴿وَمَا كَيْدُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ﴾ انہوں نے یہ سازشیں کیں، یہ چالیں چلیں، لیکن کافروں کی چالیں اور سازشیں ضلالت میں ہیں؛ یعنی گمراہ ہیں، نتیجہ خیز نہیں ہیں۔ اس تیر کی طرح ہیں جسے آپ ایک دشمن، ایک شخص یا ایک ہدف کی طرف پھینکیں لیکن ہوا اسے اس راستے سے موڑ دے۔ وہ تیر چلاتے ہیں لیکن سنتِ الٰہی کی ہوائیں آتی ہیں اور ان تیروں کو اس ہدف اور نشانے سے دور کر دیتی ہیں، انہیں موسیٰؑ کے خلاف سازشیں کرنے دو، چالیں چلنے دو۔ یہاں بھی آپ نے دیکھا کہ اس آیت میں تین طبقوں کا نام لیا گیا ہے: فرعون کا طبقہ، ہامان کا طبقہ، قارون کا طبقہ؛ یہاں پر ان تینوں طبقوں کا اکٹھا ذکر کیا گیا تھا۔

لیکن ایک اور آیت جو کہ سورۂ توبہ میں ہے وہ احبار و راہبان کے طبقے سے مربوط ہے۔ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾[1] اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو، ﴿إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ﴾ بتحقیق بہت سے عالم اور زاہد ﴿لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ﴾ کھاتے ہیں لوگوں کا مال ناحق، ﴿وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ﴾ ان کا مال بھی کھاتے ہیں اور انہیں خدا کے راستے سے بھی روکتے ہیں، ﴿وَالَّذِينَ﴾ دوبارہ مترفین، مال جمع کرنے والوں، ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کے طبقے کو ذکر کرتا ہے: ﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ﴾ جو لوگ ذخیرہ کرتے ہیں سونے اور چاندی کو، ﴿وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللهِ﴾ اور خدا کی راہ میں انفاق نہیں کرتے

---

۱. سورہ مبارکہ توبہ: آیت ۳۴

ہیں، ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ انہیں دردناک اور المناک عذاب کی بشارت دے دیں۔
بنابریں ہم ان چند آیات اور قرآن کی دسیوں دوسری آیات میں ان چار طبقوں اور ان کی دشمنیوں اور عداوتوں کو واضح طور پر دیکھتے ہیں۔

بیسویں نشست

نبوت کا انجام (۱)

۲۱ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری ۸-۱۰-۱۹۷۴

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللهُ الْأَمْثَالَ﴾ (سورہ رعد/۱۷)

انسان کی آگہی اور علمی و سائنسی ترقی کے دور یعنی بیسویں صدی کے ثقافتی معیاروں کے اعتبار سے اعلیٰ ترین ہدف؛ یعنی انسانوں کو مساوی اور ایک طبقہ کرنے اور جہالت و غربت و ظلم و ستم و استثمار اور طبقاتی اختلاف کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا ہدف؛ اس انتہائی قیمتی، اعلیٰ اور عظیم ہدف کے ساتھ انبیاؑ مبعوث ہوئے اور معاشرے میں قدم رکھا۔ سعی و کوشش، جدوجہد، فعالیت اور جہاد کا ایک سلسلہ انبیاؑ کی زندگی کا ماحصل ہے۔

بعثت کے آغاز سے ہی چین سے نہ سونا، بستر استراحت پر آرام نہ کرنا، خوشیوں اور آسائشوں کا منہ نہ دیکھنا اور مسلسل جہاد کرنا؛ یہ انبیائے الٰہی کی زندگی کا خلاصہ ہے۔ زندگی کے آخری حصے میں بھی جیسا کہ مذہبی آثار اور کتب سے پتا چلتا ہے، بعض کا زمانے کے ظالموں، جابروں اور طاغوتوں کی ایماء پر سر تن سے جدا کر دیا گیا، بعض کو درخت کے تنے میں رکھ کر آرے سے دو ٹکڑے کر دیا گیا، بعض عالمِ غربت میں دنیا سے چلے گئے۔ کسی نے تھوڑی سی دولت و ثروت بھی اکٹھی نہ کی؛ کسی نے بھی اپنی آخری زندگی میں دنیوی اور دنیادار رہنماؤں کی طرح محلّات، زمینیں اور مال و دولت کے ڈھیر نہیں چھوڑے؛ یہ انبیائے الٰہی اور خدائی سفیروں، نمائندوں اور رسولوں کی زندگی کا خلاصہ ہے؛ یہ ہم نے جان لیا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہمارے ذہن میں ہے اور نبوتوں اور رسالتوں کی تاریخ میں ہم پڑھتے ہیں کہ تمام انبیا نے اپنی زندگیاں جہد مسلسل اور جہاد میں گزاریں اور اکثر نے جامِ شہادت بھی نوش کیا تو کیا ان کا کام بےفائدہ اور بے نتیجہ تھا؟ کیا انبیاؑ تاریخ میں شکست سے دوچار ہوئے ہیں؟ جیسا کہ اس وقت بھی دنیا کے سادہ لوح لوگوں کے ذہنوں میں ہے اور انبیاؑ کی مخالف طاقتیں بھی چاہتی ہیں کہ یہ چیز عام لوگوں کے ذہنوں میں باقی رہے، کیا واقعاً انبیاؑ نے اپنی جدوجہد سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں کیا؟ اور پوری تاریخ میں ظلم و ستم، جبر و استبداد اور کفر و شرک کی حکمرانی رہی ہے؟ کیا ایسا ہی ہے؟ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے یہ معزز و مکرم نمائندے کہ جن کا سلسلہ حضرت آدمؑ، نوحؑ اور ابراہیمؑ سے شروع ہوا اور اس سلسلے میں خدا کی برگزیدہ ہستیاں یکے بعد دیگرے تشریف لائیں، انہوں نے نہ صرف یہ کہ شکست نہیں کھائی، نہ صرف یہ کہ ناکام نہیں ہوئے، نہ صرف یہ کہ جو کچھ کہا اور جو کچھ چاہا اسے دنیا میں، تاریخ میں اور معاشرے میں شکست نہیں ہوئی بلکہ پوری بشریت میں اور ان تمام لوگوں کے درمیان جنہوں نے ایک ہدف اور مقصد کے لیے کوشش اور جدوجہد کی، کسی کو انبیاؑ کی طرح کامیابی نہیں ملی؛ یہ ہمارا عقیدہ ہے، یہ ہمارا نظریہ ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نبوت کا انجام اور انبیاؑ کے کام کا اختتام ماضی میں بھی ان کی مرضی کے مطابق ہوا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا؛ اور ہم اسے ثابت کریں گے۔

دو مطلب ہیں یہاں پر، ایک یہ کہ یہ سلسلہ جو کہ نبوت و رسالت کے نام سے معروف ہے، یعنی آدمؑ سے لے کر خاتمؐ تک انبیاؑ کا کارواں، ان انبیاؑ نے کون سا کام کیا ہے؟ سب نے مل کر مجموعی طور پر کیا عمل انجام دیا ہے؟ کیا انہوں نے کام کو آگے بڑھایا ہے یا شکست کھائی ہے؟ یہ ایک مطلب ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ کیا خدا کے ان عظیم انبیاؑ میں سے انفرادی طور پر ہر نبی اپنے زمانے میں کامیاب ہوا ہے یا اس نے شکست کھائی ہے؟ دو مسئلے ہیں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ یہ سلسلہ کہ جس کا نام انبیاؑ کا سلسلہ ہے، اس سلسلے نے شروع سے لے کر آخر تک انسانیت و آدمیت کی کیا خدمت کی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاؑ آئے اور ایک ایسی ذات کو جو ایک حیوان کی حد تک بھی اپنا نفع و نقصان نہیں سمجھتی تھی، ایک ایسی ذات کو جس میں طبیعت و جبلت بھی اتنی طاقتور اور کارساز نہیں تھی، اس ذات کو ایک ایسی سطح پر لے آئے کہ آسمان کے فرشتے بھی

آکر اس سے کچھ سیکھیں۔ انبیاؑ بشر کو جہالت و حیوانیت کی پستی سے نکال کر ایک متمدن انسان کی سطح پر لے آئے کہ اگر چاہے کہ ان کی تعلیمات پر عمل کرے تو خلقت کے اعلیٰ ترین، حسین ترین اور جذّاب ترین جلوے اس کی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔ انبیاؑ نے انسانوں کی اس طرح تربیت کی ہے جس طرح ایک معلم مدرسے میں ایک شاگرد کی تربیت کرتا ہے۔ استاد ایک شاگرد پر جو کچھ بھی نہیں جانتا یہاں تک کہ الف، ب بھی نہیں جانتا، ایک سال تک محنت کرتا ہے اور شاگرد دوسری کلاس میں پہنچ جاتا ہے، لیکن اسی عرصے میں جب شاگرد دوسری کلاس میں پہنچتا ہے، استاد دنیا سے چلا جاتا ہے۔ ایک اور استاد اس شاگرد پر محنت کرتا ہے اور اسے تیسری کلاس میں پہنچا دیتا ہے لیکن جو استاد اسے تیسری کلاس میں پہنچاتا ہے وہ اسی دوران اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ایک اور استاد اس شاگرد پر ایک سال محنت کرتا ہے اور اسے چوتھی کلاس میں پہنچا دیتا ہے لیکن وہ شفیق استاد، وہ مہربان باپ اور دلسوز راہنما بھی شاگرد کو چوتھی کلاس میں پہنچا کر دنیا سے چلا جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ کلاس بہ کلاس، قدم بہ قدم اور مرحلہ بہ مرحلہ اس چھوٹے بچے کو اوپر لے کر آتے ہیں، اوپر لے کر آتے ہیں؛ اور اب آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے علم و دانش اور فکر و نظر کی سطح پچھلے مراحل سے بہت زیادہ بلند ہے اور وہ فہم و ادراک اور فکر و نظر کے نقطۂ عروج پر ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اساتذہ نہیں ہیں، اساتذہ کہاں ہیں؟ ایک پہلی کلاس کے دوران جب اس کند ذہن شاگرد کو اوپر کی طرف لا رہا تھا، دنیا سے چل بسا۔ اس دوسرے کو انھی شاگردوں نے سال کے آخر میں جب اس سے کچھ سیکھ رہے تھے کسی مسئلے پر اختلاف کی وجہ سے جان سے مار ڈالا۔ تیسری کلاس کے استاد کو ایک اور طرح سے، چوتھی کلاس کے استاد کو کسی اور طریقے سے مار ڈالا۔ اب اساتذہ نہیں ہیں، ہر استاد نے اپنی ذمہ داری انجام دی اور بظاہر ناکامی کی حالت میں مر گیا، لیکن کیا واقعاً ناکام ہوا؟ اچھی طرح سوچیں، دیکھیں کہ کیا واقعاً وہ استاد ناکام ہوا؟ استاد کا ہدف اور مقصد کیا تھا؟ کیا وہ مہربان اور شفیق استاد یہی کچھ نہیں چاہتا تھا؟ وہ یہ چاہتا تھا کہ اس شاگرد کو جہالت و نادانی کی پستیوں سے نکال کر علم و دانش اور معرفت و بصیرت کی بلندیوں تک پہنچا دے، کیا اب ایسا نہیں ہوا؟ پس اساتذہ ناکام نہیں مرے۔ یہ صحیح ہے کہ مر گئے ہیں، یہ درست ہے کہ دنیا کی پر تعیّش زندگی انہیں نصیب نہیں ہوئی، یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اس نونہال کو پھلدار اور سایہ دار درخت میں تبدیل ہوتے نہیں دیکھا،

لیکن کیا وہ ناکام ہوئے ہیں؟ ہرگز نہیں، ناکام نہیں ہوئے۔
ان کا ہدف اور مقصد یہی تھا کہ یہ کہ انسان اس پہلی اور دوسری کلاس کو طے کرے، یہ نادان اور ناسمجھ طالب علم اس راستے پر سختی کے ساتھ، محنت و مشقت کے ساتھ، زحمت کے ساتھ اوپر جائے یہاں تک کہ اوپر چوٹی تک پہنچ جائے اور اب پہنچ گیا ہے۔
انبیاؑ اسی طرح تھے؛ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور تاریخ انسانی میں دوسرے ہزاروں انبیاؑ کا کام یہی تھا کہ اس انسان کو بلندی کی طرف لے جائیں، اسے علم و دانش اور بصیرت و معرفت سکھائیں، اسے آخرت کی زندگی کے لیے تیار کریں، اسے ضروری معلومات اور سرمایہ دیں اور یہ کام ہوا ہے؛ اگرچہ اس راستے میں چند انبیاؑ انتہائی دردناک طریقے سے قتل کیے گئے، دنیا سے چلے گئے اور انھوں نے نتیجہ نہ دیکھا لیکن بشریّت مزید آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔
آج دنیا ہزاروں سال پہلے سے زیادہ اسلام کی حقانیت کی باتوں کو سننے کے لیے تیار ہے؛ آج انسانیت ہزار سال، بارہ سو سال اور تیرہ سو سال سے زیادہ بہتر انداز میں الٰہی حکومت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے اور ایک ہزار سال بعد آج سے زیادہ آمادہ ہوگی۔ جس دن ہمارے امام زمانہ (عج) نظروں سے غائب ہوئے ہیں اور ایک امام ہونے کے ناطے لوگوں کے درمیان مسند امامت و خلافت پر جلوہ افروز نہیں ہوئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت انسان ایک شمشیر بکف انقلابی اور مصلح امام کو قبول کرنے اور ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اور اگر وہ امام اس وقت قیام کرنا چاہتے، انقلاب برپا کرنا چاہتے اور معاشرے میں تبدیلی لانا چاہتے تو یقیناً اس زمانے کے ناسازگار حالات کی وجہ سے اپنا مطلوبہ معاشرہ نہیں بنا سکتے تھے۔

اہل بیت پیغمبرؐ اور آئمہ اطہارؑ اس نتیجے تک پہنچ چکے تھے کہ یہ معاشرہ اتنا بگڑ چکا ہے، بنوامیہ اور بنوعباس کی طاغوتی اور ظالم و جابر و فاسق و فاجر حکومتوں نے معاشرے کے اس باغ کی اتنے برے طریقے سے باغبانی کی ہے، اس میں اتنا زہر پھیلا دیا ہے، اسے اتنا خراب کر دیا ہے کہ اب اس میں کسی صحیح و سالم پودے کا اگنا اور نشو و نما پانا ممکن نہیں رہا ہے؛ لہٰذا امامؑ نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ جس دن آئیں گے اس وقت کیا صورتحال ہوگی؟ جس دن آپ (عج) ظہور فرمائیں گے البتہ ہمیں

نہیں معلوم کہ دس سال بعد ہو گا یا دس ہزار سال بعد، کچھ معلوم نہیں ہے، جس دن امام (ع) ظہور فرمائیں گے اس وقت بشریت اسلام کی حق بات کو سننے اور ماننے کے لیے تیار ہو چکی ہو گی۔ تیار ہو چکی ہو گی کہ عظیم اسلامی معاشرے کی ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اٹھائے۔ اس دن انسانیت قرآن کی حاکمیت کے لیے تیار ہو گی۔ لیکن امام زمانہ (ع) کے اپنے دور میں تیار نہیں تھی، یہ کام کس نے کیا ہے؟ انبیاؑ کی تعلیمات نے کیا ہے اور آئمہ اطہارؑ، انبیاؑ کے مشن کو آگے بڑھانے والے ہیں۔

بنابریں تاریخ میں انبیاؑ ناکام نہیں رہے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ بشریت روز بروز عروج و کمال سے ایک قدم نزدیک تر ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ہم کیا چاہتے ہیں؟ انبیاؑ کیا چاہتے ہیں؟ پروردگارِ عالَم چاہتا ہے کہ اس خام اور ناپختہ مخلوق (انسان) کو طبیعی حرکت کے ساتھ، اس کی طبیعی اور فطری منزل یعنی عروج و کمال تک پہنچائے۔ یہ خداوند متعال کا ارادہ ہے اور یقیناً بشریت اس کمال کی اوج تک پہنچے گی۔ یہ اسلامی اصولوں میں سے ایک اصول ہے، اسلامی آئیڈیالوجی میں یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انسان کا انجام اچھائی پر ہے۔ کیوں؟ کیونکہ خدا نے زمین اور آسمان کو بر حق خلق فرمایا ہے؛ انسان کو بھی حق کی متلاشی فطرت پر خلق فرمایا ہے، چونکہ انسان قوت ارادی رکھتا ہے لہٰذا اسے اس راستے پر چلنا چاہیے جو اس کی فطرت کے مطابق ہے تاکہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ یہ راستہ کون اسے دکھا سکتا ہے اور کون اسے یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ کام کرے گا تو تم نے فطرت کے مطابق عمل کیا؟ انبیاؑ؛ انبیاؑ اسی لیے آتے ہیں۔ وہ آتے ہیں تاکہ انسان کو فطرت کا راستہ دکھائیں؛ یعنی نیک انجام کی طرف اس کی حرکت میں تیزی لائیں، اسے آسان بنائیں۔ بنابریں انسان آگے بڑھ رہے ہیں، انسانیت و بشریت روز بروز سعادت و خوشبختی اور اپنی منزلِ مقصود سے نزدیک تر ہو رہی ہے اور یہ اس حرکت کی برکت سے ہے جو انبیاؑ نے اسے دی ہے۔ انبیاؑ نے اسے حرکت دی ہے؛ اگر تاریخ کے اواسط میں، تاریخ کے کسی بھی مرحلے میں تھوڑی تاخیر ہوئی ہے تو وہ انبیاؑ کی تعلیمات سے کسی حد تک دور ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے لیکن بہرحال انسان یہ تکاملی حرکت کرتے رہے ہیں۔ یہ ایک مطلب ہے بطور کلی۔

اس پہلے مسئلے میں ہم اس طرح نتیجہ نکالتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ خدا کے عظیم انبیاؑ اگرچہ انفرادی طور پر محرومیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہوئے ہیں لیکن مجموعی طور پر بشریت ترقی و کمال کی طرف بڑھتی رہی ہے اور اس کا سبب انبیاؑ تھے۔ یہ انبیاؑ ہی تھے کہ جنہوں نے انسان کو اس کی منزلِ مقصود

اور روشن انسانی مستقبل کی طرف چلایا ہے، اس راستے پر چلنے میں اس کی مدد کی ہے؛ یہ پہلا مسئلہ۔
اب دوسرا مسئلہ؛ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جب ایک نبی دنیا میں ایک تحریک چلاتا ہے، ایک انقلاب لاتا ہے، عمومی بیداری پیدا کرتا ہے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس انقلاب کا انجام اچھا ہوگا یا نہیں؟ کیا یہ امید رکھی جاسکتی ہے کہ اس کام کا انجام نیک ہوگا؟ یا امید نہیں رکھی جا سکتی؟ یہاں پر قاعدہ کلی اور ضابطہ کیا ہے؟

بعض یہ کہتے ہیں کہ ہم جس حد تک نظر دوڑاتے ہیں یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں بھی کسی زبان سے حق کی بات نکلی ہے، جہاں بھی پیغامِ حق کانوں تک پہنچا ہے، آخرکار وہ صدائے حق خاموش ہوگئی ہے اور کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی۔ اس سے انہوں نے ایک نتیجہ نکالا ہے، ایک قاعدہ بنا لیا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ تاریخ انسانی نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ انبیاؑ ناکام رہے ہیں، اب اگرچہ آپ یہ کہتے رہیں کہ وہ مجموعی طور پر کامیاب رہے ہیں لیکن بہرحال جو انقلاب وہ لائے تھے اسے ثمر آور نہیں کر سکے۔ کسی ایک جگہ پر بھی وہ حق کی حکومت قائم نہیں کر سکے اور باطل کو نیست و نابود نہیں کر سکے۔ پس بنابریں ہم کیا کریں؟ اس کے بعد ہم بھی اس سلسلے میں کوئی کوشش نہ کریں، جدوجہد نہ کریں، انبیاؑ کے راستے پر نہ چلیں؛ جب خدا کے عظیم انبیاؑ اپنے زمانے میں خود کوئی کام نہیں کرسکے اور ہمیشہ باطل (اگرچہ وقتی طور پر اور کسی مرحلے کی حد تک) حق پر غالب رہا ہے پس دنیا جہان کے حق کے متلاشیوں اور حق گو مجاہدین کو چاہیے کہ وہ اپنی تلواریں نیام میں رکھیں اور اس سلسلے میں کوئی بھی کوشش نہ کریں۔ دنیا کے ظالم و جابر حکمرانوں کی ہمیشہ یہی آرزو رہی ہے۔

دنیا کے ظالم و جابر حکمران دونوں جہانوں کے خدا سے (جس خدا کو وہ مانتے ہیں) یہ چاہتے ہیں کہ لوگ یہ سمجھیں کہ نبوّتیں و رسالتیں اور خدا کے عظیم انبیاؑ و مرسلین اور حق و حقیقت کے سفیر اور نمائندے ہمیشہ شکست ہی کھاتے رہے ہیں۔ وہ خدا سے یہ چاہتے ہیں کہ لوگ یہی تصور کریں کہ اس دنیا میں حق کا پرچم کبھی بھی بلند نہ ہو سکے گا اور اہلِ حق کبھی بھی فتح و نصرت کا منہ نہیں دیکھ پائیں گے۔ وہ خدا سے یہ چاہتے ہیں کہ لوگ اس چیز سے مایوس اور ناامید رہیں کہ باطل کے مقابلے میں کسی بھی قسم کی کوئی تحریک کامیاب اور نتیجہ خیز ہو سکے گی اور شکست نہیں کھائے گی؛ لیکن کیا حقیقت اسی طرح ہے؟ چونکہ دشمن کے پروپیگنڈے سے متاثر چند نادان لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے، چونکہ لوگوں

نے یہ گمان کر لیا ہے کہ انبیاؑ، ان کے پیروکار اور ائمہ اطہارؑ ہمیشہ شکست کھاتے رہے ہیں اور دنیا میں ہر تحریک شکست سے دوچار ہوگی، تو کیا ہم بھی اسے تسلیم کرنے اور ماننے پر مجبور ہیں؟ کیا ہم قرآن سے قطع نظر کر لیں؟ کیا ہم قرآن کی بات نہ سنیں جو اس منطق کے بالکل برعکس ہے اور باطل نظریات کو سنتے رہیں؟ نہیں؛ ہم یہ کام نہیں کریں گے۔ ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں، قرآن سے درس لیتے ہیں کہ نبوتوں کا انجام کیا ہے اور انبیائے کرامؑ اور ان کے پیروکاروں کی انقلابی تحریک کا اثر کیا ہو سکتا ہے؟ اس چیز کو قرآن سے سیکھیں اور پھر تاریخ کی طرف پلٹیں تو دیکھیں گے کہ تاریخ بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔

قرآن مثال بیان کرتا ہے انہی آیات میں جن کی میں نے تلاوت کی اور اب دوبارہ بھی ان کا ترجمہ بیان کرتا ہوں؛ قرآن ہمیں کہتا ہے کہ نہیں! دنیا میں حق بھی ہے اور باطل بھی، حق باقی رہے گا اور باطل مٹ جائے گا۔ پہاڑوں کی بلندیوں سے دریاؤں میں پانی تیزی سے بہہ کر آتا ہے، پانی کی سطح پر جھاگ بن جاتا ہے، یہ جھاگ ختم ہو جاتا ہے جبکہ پانی باقی رہ جاتا ہے، باطل وہی جھاگ ہے جو ختم ہو جائے گا، مٹ جائے گا اور حق وہی پانی ہے جو باقی رہے گا۔

جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے اور تاریخی حقائق بھی اس چیز کی تصدیق کرتے ہیں کہ انبیاؑ مجموعی طور پر جہاں انسان کو ایک قدم آگے کی طرف لے کر گئے ہیں وہاں خود ان کے لیے بھی کامیابی کا امکان تھا۔ انبیاؑ کے لیے ہر جگہ کامیابی کا امکان رہا ہے، انبیاؑ کے پیروکاروں کے لیے بھی ہر جگہ پر کامیابی کا امکان ہے، یقیناً کامیاب بھی ہوں گے لیکن دو شرطوں کے ساتھ، اس کامیابی کی دو شرطیں ہیں (یہاں پر آئندہ کی تاریخ رقم کرنے میں انسانی ارادے کا عمل دخل ہے) اگر یہ دو شرطیں ہوں تو دین اور قرآنی و اسلامی فکر کی بنیاد پر چلنے والی ماضی و مستقبل کی تمام تحریکیں ہمیشہ کے لیے کامیاب و کامران ہوں گی؛ معجزے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ معجزہ ہو تاکہ دین کے پیروکار اور حامی کامیاب و کامران ہوں، نہیں؛ معجزے کے بغیر بھی اگر یہ دو شرطیں ہوں تو اسلام، قرآن، دین اور قرآنی افکار کے لیے کامیابی کا امکان ہوگا؛ وہ دو شرطیں کونسی ہیں؟

ان دو شرطوں میں سے پہلی شرط ایمان ہے، علم و آگہی کے نتیجے میں بننے والا عقیدہ، احساس ذمہ داری کے ساتھ حاصل ہونے والا اعتقاد، سعی و کوشش اور جدوجہد کے ساتھ ماننا اور قبول کرنا؛ یہ پہلی شرط۔

دوسری شرط ہے صبر، صبر سے کیا مراد ہے؟ یعنی استقامت و پائیداری، میدان سے نہ بھاگنا، حساس اور خطرناک لمحات میں کام کو ترک نہ کرنا۔
آپ نبوتوں کی تاریخ میں جہاں بھی دیکھتے ہیں کہ ایک نبی نے زمانے کے طاغوت سے شکست کھائی ہے تو اسی کی وجہ یہی تھی کہ اس نبی کے پیروکاروں میں یا ایمان کی کمزوری تھی یا صبر کی کمی۔ اور جہاں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ حق نے فتح حاصل کی ہے، پیشرفت کی ہے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ اہل حق میں ایمان اور صبر کی کمزوری اور کمی نہیں تھی۔ کیا اس پر قرآن سے کوئی شاہد اور دلیل بھی ہے؟ جی ہاں؛ قرآن میں چند شواہد ہیں:
﴿ اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾[۱] صبر کے ہتھیار سے دشمن پر کامیابی حاصل کرو، صبر کے ذریعے اپنے اہداف کو آگے بڑھاؤ، یہ صبر کا اعجاز ہے، وہ ہاتھ جسے آستین سے باہر آکر کام کرنا چاہیے وہ انسانی صبر کا ہاتھ ہے؛ صبر۔ ہم صبر کا معنی بھی صحیح نہیں کرتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صبر یہ ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں اور دیکھیں کہ کیا ہوگا۔ میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ کیا ہوگا۔ بیٹھنے اور تماشا دیکھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اگر سعی و کوشش کے بغیر، فعالیت و جدوجہد کے بغیر بیٹھیں گے تو انجام بدبختی ہوگا، ذلت و خواری ہوگا، بے دینی ہوگا، بے دنیائی ہوگا۔ ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ﴾[۲] لیکن اگر صبر کے ساتھ آگے بڑھے تو دین بھی رہے گا اور دنیا بھی نصیب ہوگی۔
یہ وہ انجام اور نتیجہ ہے جو قرآن ہمیں بتا رہا ہے۔ یہ سورۂ اعراف کی آیات ہیں۔ میں نے ساری آیات نہیں لکھیں آپ خود جاکر دیکھیں ان میں غور و فکر کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں آپ اس پر مذہبی طرز تفکر کے طور پر عمل کریں، واقعاً دقت سے کام لیں، اگر آپ دیکھیں کہ اسلامی معیاروں کے ساتھ سازگار اور مطابق ہے تو اسے ایک طرز تفکر کے طور پر قبول کریں۔ یہ قرآن ہے، سورۂ اعراف میں آیت نمبر ۱۲۰ سے آگے، میرے مدِنظر اس وقت آیت نمبر ۱۲۶ اور ۱۲۷ ہے۔ بات کا آغاز فرعون اور حضرت موسیٰؑ کے قصے سے ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ آتے ہیں اور خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں، فرعون قبول نہیں کرتا، تسلیم نہیں کرتا، نہ صرف یہ کہ قبول

---

۱. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۱۵۳
۲. سورہ مبارکہ حج: آیت ۱۱

نہیں کرتا بلکہ حضرت موسیٰؑ کو دھمکی بھی دیتا ہے۔ ان ساری باتوں کے بعد فرعونی جادوگر آتے ہیں، حضرت موسیٰؑ کے معجزے کے سامنے ان کا جادو کچھ نہیں کر سکتا اور آخرکار وہ خود ایمان لے آتے ہیں۔ فرعون انہیں دھمکی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمہیں قتل کردوں گا، موسیٰؑ پر ایمان کیوں لائے ہو؟ ان سب واقعات کے بعد، فرعونی جادوگروں اور حضرت موسیٰؑ سے ان کی شکست کے قصے کے بعد قرآن فرماتا ہے: ﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ﴾[۱] ملأ یعنی فرعون کی قوم کے بڑوں، سرداروں اور بزرگوں نے فرعون سے یہ کہا ﴿أَتَذَرُ مُوسَى وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ﴾ کیا تو موسیٰؑ اور اس کی قوم کو، اس پر ایمان لانے والوں کو، اس کے گروہ کو، اس کے لوگوں کو چھوڑ دے گا کہ وہ زمین پر فساد پھیلائیں؟ بدنظمی پھیلائیں؟ کیا تو انہیں آزاد چھوڑ دے گا؟ فرعون سے کہتے تھے ﴿وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ﴾ اور وہ تجھے اور تیرے خداؤں کو چھوڑ دیں؟ کیا ایسا ہے؟

﴿قَالَ﴾ فرعون نے کہا نہیں؛ موسیٰ کو راستے سے ہٹا دوں گا۔ حضرت موسیٰؑ کے خلاف ایک سخت حملے کا منصوبہ بنایا، مصر میں موسویوں (حضرت موسیٰؑ کے پیروکاروں) کے گروہ کو دبانے اور کچلنے کے لیے ایک نیا منصوبہ بنایا، وہ کیا تھا؟ ﴿قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ﴾ فرعون نے کہا ﴿سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ﴾ میں موسیٰ کو تو چھوڑوں گا نہیں، اسے اپنی من مانی کرنے کی اجازت نہیں دوں گا بلکہ ان کے لڑکوں کو قتل کر دوں گا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھوں گا، یہ نیا منصوبہ ہے۔ فرعون حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں تمام حربے آزمانے کے بعد اور انہیں راستے سے ہٹانے سے مایوس ہونے کے بعد اب اس نتیجے پر پہنچا کہ نہیں، یہاں تک کہ اب تو ساحر اور جادوگر بھی ان پر ایمان لا چکے ہیں لہٰذا سختی سے کام لینا چاہیے، سختی سے نمٹنا چاہیے، پس کیا کرنا چاہیے؟ ان تمام جوانوں کو قتل کر دیں گے جو موسیٰؑ پر ایمان لا چکے ہیں، ان کی عورتوں کو اپنی تحویل میں لے لیں گے۔ ﴿نَسْتَحْيِي﴾ زندہ پکڑنا، زندہ رکھنا، یقیناً فحاشی کے لیے یا اس لیے کہ ان کی نسل کو خراب کریں یا اس قسم کے کسی اور مذموم مقصد کے لیے۔ پس صورت حال انتہائی گھمبیر ہو گئی، حضرت موسیٰؑ اور ان کے پیروکار فرعونی حکومت کے اس سخت رویے کے سامنے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر انسان کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، بڑے بڑوں کے دل لرز جاتے ہیں، مذاق نہیں! فرعون جیسا شخص یہ کہے کہ میں ان کی نسل ختم کر

---

۱. سورہ مبارکہ اعراف: آیت ۱۲۷

دوں گا، ایسا خطرناک منصوبہ میرے پاس ہے کہ ان کا کوئی ایک جوان بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ﴿سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ﴾ ان کے جوانوں کو قتل کر دوں گا۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر موسویوں (حضرت موسیٰؑ کے پیروکاروں) کو چاہیے کہ اپنا مورال بلند رکھیں، مایوسی کا شکار نہ ہوں، اس حساس اور خطرناک مقام پر شکست کا احساس نہ کریں۔

بنی اسرائیل جب دیکھتے ہیں کہ ان کی شکست یقینی ہے کیونکہ فرعون ان کے تمام جوانوں کو قتل کرنے کا رادہ کر چکا ہے تو فرعون کے اس نئے منصوبے کے مقابلے میں حضرت موسیٰؑ بھی اپنا نیا منصوبہ سامنے لاتے ہیں، کیا کہتے ہیں؟ جب اس صورتحال کا سامنا کرتے ہیں، جب دیکھتے ہیں کہ فرعون اس طرح کہہ رہا ہے تو حضرت موسیٰؑ کہتے ہیں: ﴿قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ﴾[1] حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے اس اعلان کے مقابلے میں اپنی قوم سے کہا ﴿اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا﴾ خدا سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ آگے بڑھو، صبر و استقامت سے کام لو، اپنی جدوجہد کو ادھورا نہ چھوڑو (انھیں امید دلاتے ہیں)۔ کیوں؟ ﴿إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ﴾ زمین خدا کی ہے، ﴿يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اسے دے دیتا ہے۔ یعنی خدا کے بندے ہم ہیں، حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل سے کہتے ہیں تم خدا کے بندے ہو، فرعون کے بندوں کی چالیں کامیاب نہیں ہوں گی۔ زمین خدا کے بندوں کی ہے ﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ اور نیک انجام متقی لوگوں کا ہے۔

یہ قرآن ہے، تاریخی حقائق بھی ہمیں یہی بتاتے ہیں۔ ہمارے پیغمبرؐ جو کہ مکہ میں اس حد تک دباؤ کا شکار تھے، تیرہ سال تک انہیں سخت ترین حالات اور شکنجوں میں رکھا گیا، اس کے بعد تشریف لاتے ہیں مدینہ اور وہاں پر حکومت بناتے ہیں، معاشرہ تشکیل دیتے ہیں، ایک نظام بناتے ہیں اور انسانوں کو کمال کی طرف لے کر جاتے ہیں اور اپنے اصلی اور جانی دشمنوں کو شکست دیتے ہیں، انہیں نابود کرتے ہیں، لیکن کس کے سائے میں؟ ایمان اور صبر کے سائے میں۔ جب بھی ایمان ہو اور صبر ہو ﴿بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا﴾[2] اگر عمل اور صبر کے ساتھ ایمان ہو اور تقویٰ بھی ہو تو اس وقت کامیابی حاصل ہوتی

---

۱. سورہ مبارکہ اعراف: آیت ۱۲۸

۲. سورہ مبارکہ آل عمران: آیت ۱۲۵۔ جی ہاں اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے اور دشمن فی الفور تم تک آجائیں گے تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جن پر بہادری کے نشان لگے ہوں گے۔

ہے۔ اور یہ کائنات بس اللہ کی سنتوں میں سے ایک سنت اور آفاقی قوانین میں سے ایک قانون ہے، یہ تاریخ میں خدائی سنت اور قانون ہے۔ کل بھی اسی طرح تھا آج بھی ایسا ہی ہے اور آنے والا کل بھی ایسا ہی ہوگا۔ تمام دینی طاقتیں اگر ایک طاقت کی شکل میں دنیا میں ابھری ہیں یا باقی رہی ہیں تو ایمان اور صبر کے سائے میں۔ آج بھی جو لوگ چاہتے ہیں کہ دنیا میں انسانوں کی زندگی کی باگ ڈور قرآن، اسلام، توحید، نبوت اور اسلام کے مقدس اصولوں کے ہاتھوں میں ہو، جو یہ چاہتے ہیں کہ خدا کو دنیا پر حاکم دیکھیں تو انہیں چاہیے کہ اپنے اندر ان دو صفات کو راسخ کریں؛ ایمان اور صبر۔ اگر ایمان اور صبر ہمارے اندر راسخ ہو جائیں، مضبوط ہو جائیں تو پھر ﴿إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ لیکن ایمان اور صبر کے بغیر یہ نہیں ہو سکتا۔

ان دو سوالوں کے سلسلے میں یہ ہمارا جواب ہے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ کیا انبیائے الٰہی مجموعی طور پر کامیاب رہے ہیں یا ناکام؟ ہم کہتے ہیں کہ مجموعی طور پر تمام انبیاؑ کامیاب رہے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ انسان کو اوپر لانا چاہتے تھے اور اوپر لے آئے ہیں پس مجموعی طور پر انبیاؑ کامیاب ہوئے ہیں ناکام نہیں ہوئے۔ لیکن کیا انفرادی طور پر ہر نبی یعنی الٰہی و توحیدی انقلابی تحریکوں میں سے ہر ایک تحریک کامیاب ہوئی ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ہم کہتے ہیں کہ یہاں ایک عمومی اور کلی قاعدہ پایا جاتا ہے۔ وہ قاعدۂ کلی یہ ہے کہ جس الٰہی انقلابی تحریک کے کارکنوں میں بھی کافی حد تک ایمان اور صبر تھا وہ کامیاب ہوئی ہے اور جس کے کارکنوں میں بھی مطلوبہ حد تک ایمان اور صبر نہیں تھا وہ ناکام ہوئی ہے۔ میں ان آیات کی تلاوت کرتا ہوں تاکہ آپ غور کریں۔

﴿قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾[1] کہہ دو کہ خدا ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ چونکہ اس نے پیدا کیا ہے لہٰذا وہی بتا سکتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ کیونکہ اس کے بعد خدا حق و باطل کے انجام اور عاقبت کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے کہ ہم نے پیدا کیا ہے اس کائنات کو، ہم تاریخ کی سنتوں اور قوانین کو جانتے ہیں، ہم سے سنیں ﴿قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ کہہ دو کہ اللہ ہر چیز کا خلق کرنے والا ہے ﴿وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ اور وہ ایک ہے ﴿الْقَهَّارُ﴾ طاقتور اور قدرتمند ہے۔

﴿أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾ تمہارے لیے مثال بیان فرما رہا ہے۔ عربی جملہ بندی کے لحاظ سے یہ آیت

---

۱. سورہ مبارکہ رعد: آیات ۱۶ سے ۱۸

بہت پیاری ہے لیکن افسوس کہ جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہیں وہ اس خوبصورتی کو بھی صحیح طور پر محسوس نہیں کر سکتے ہیں۔ پہلے نہیں فرماتا کہ میں مثال بیان کر رہا ہوں، آپ جو سن رہے ہیں نہیں سمجھتے کہ یہ ایک تمثیل ہے اور کس کے بارے میں ہے، آپ متوجہ نہیں ہوتے، آخر میں سمجھیں گے کہ ماجرا کیا ہے، خدا مثال بیان فرما رہا ہے ﴿أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾ اس نے آسمان سے پانی نازل کیا، یعنی بارش، ﴿فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا﴾ دریا اور نہریں مختلف اندازوں میں (بقدر ظرف) جاری ہو گئیں، چھوٹے دریا، بڑے دریا بارش کے پانی سے بہنے لگے، ﴿فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا﴾ دریاؤں میں آنے والے اس سیلاب نے اپنے دوش پر ابھرا ہوا جھاگ اٹھایا۔ جب آپ ایسے دریا کے کنارے کھڑے ہوتے ہیں کہ جس میں سیلاب آیا ہوا ہوتا ہے تو جو کچھ آپ دیکھتے ہیں وہ پانی نہیں ہوتا بلکہ جھاگ ہوتا ہے، پانی جھاگ کے نیچے ہوتا ہے۔ یہ جھاگ ایسے ہی دریا کے پانی پر خودنمائی کرتا ہے۔ آپ جھاگ کو دیکھتے ہیں، جھاگ کے نیچے پانی ہوتا ہے۔

ایک اور مثال کی طرف جائیں وہ یہ ہے: ﴿وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ﴾ وہ چیزیں کہ جنہیں آگ میں پگھلاتے ہیں جیسے بہت سی معدنیات اور لوہا کہ جسے آگ میں ڈالتے ہیں، ﴿ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ﴾ اس لیے تاکہ اس سے زیور بنائیں، سونے کو آگ میں ڈالتے ہیں تاکہ اس سے زیورات بنائیں، لوہے کو آگ میں ڈالتے ہیں تاکہ اس سے مختلف چیزیں بنائیں، تانبے کو آگ میں ڈالتے ہیں تاکہ اس سے مختلف اشیا بنائیں۔ یہ چیزیں کہ جنہیں آگ میں ڈالتے ہیں تاکہ ان سے زیورات اور دوسری اشیا بنائیں، ان میں بھی ﴿زَبَدٌ مِثْلُهُ﴾ دریا کے پانی کے جھاگ کی طرح جھاگ ہے۔ جب لوہے کو بھی پگھلاتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی سطح پر جھاگ ہے، پگھلے ہوئے لوہے کی بھی جھاگ ہوتی ہے، لوہے کو پگھلائیں تو اس پر بھی ایک خاص قسم کا جھاگ ہوتا ہے۔ وہاں پانی کی سطح پر جھاگ تھا، اصلی چیز کیا تھی؟ زندگی بخش مادہ اور مایۂ حیات کیا تھا؟ پانی یا جھاگ؟ پانی۔ لیکن بظاہر کیا نظر آرہا تھا؟ کون سی چیز جلوہ گری کر رہی تھی؟ کون سی چیز اپنے آپ کو زیادہ دکھا رہی تھی؟ جھاگ۔

لوہے کو پگھلانے میں مطلوبہ چیز کیا ہے؟ لوہا یا جھاگ؟ سونے کو پگھلانے میں مطلوبہ چیز سونا ہے یا جھاگ؟ یقیناً سونا، یقیناً لوہا۔ جھاگ کی حیثیت کیا ہے؟ ایک طفیلی چیز، ایک اضافی چیز۔ لیکن بظاہر دیکھنے میں کونسی چیز نمایاں محسوس ہوتی ہے؟ جھاگ، نہ کہ سونا اور نہ ہی لوہا۔ یہاں تک بات واضح ہو گئی،

اس کے بعد بغیر فاصلے کے خدا فرماتا ہے ﴿كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ﴾ خدا حق و باطل کو اس طرح تمہیں دکھاتا ہے، خدا حق و باطل کی مثال اس طرح بیان کرتا ہے تمہارے لیے، ﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ﴾ یعنی وہ چیز جو آپ لوگوں نے دیکھی، جو نمایاں تھی، وہی جھاگ، وہ باطل ہے۔ وہ چیز جو جھاگ کے نیچے چھپی ہوئی ہے، یعنی پانی، یعنی سونا، یعنی لوہا وہ حق ہے۔

یہاں تک آپ نے مثال کو سمجھ لیا، اس کے بعد کا قصہ خود خدا سے سنیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا ﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً﴾ وہ بے سود اور بے فائدہ جھاگ نابود ہو جائے گا، ختم ہو جائے گا۔ دریا کی سطح پر بننے والا جھاگ دائمی تو نہیں ہے۔ ایک لمحے کے لیے ہے اور پھر اگلے لمحے میں نہیں ہے۔ جب آپ نے پانی کھیتوں میں چھوڑا تو دریا سے جو کچھ آپ کے لیے بچے گا وہ پانی ہے نہ کہ جھاگ، اس کا جھاگ ختم ہو جائے گا۔ ﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً﴾ وہ جھاگ نیست و نابود ہو جاتا ہے ﴿وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ﴾ لیکن جو چیز لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے یعنی وہ پانی، یعنی وہ لوہا، یعنی وہ سونا، وہ زمین میں ٹھہر جاتا ہے، رک جاتا ہے، وہ نابود نہیں ہوتا، ﴿كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ﴾ خدا اس طرح آپ کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے۔ خدا یہ فرمانا چاہتا ہے کہ حق باقی رہ جاتا ہے۔ انبیاؑ کی دعوت حق ہے، انبیاؑ کی تحریک حق ہے اور وہ باقی رہے گی۔ انبیاؑ کے مقابلے میں جو باطل آتے ہیں، سرکشی و بغاوت کرتے ہیں، وہ جھاگ ہیں، وہ بلبلے ہیں، نابود ہونے والے ہیں۔ یہ وہ مثال ہے جو خدا بیان فرماتا ہے۔

اگلی آیت اسی مثال کو مسلمانوں کی اجتماعی جدوجہد پر منطبق کرتی ہے۔ خدا فرماتا ہے ﴿لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ﴾ جو اپنے پروردگار کی دعوت پر لبیک کہیں ان کے لیے بہترین عاقبت اور اجر و پاداش ہے۔ نیک انجام ان کے لیے ہے۔ نیک اور اچھی عاقبت ان کے لیے ہے جو انبیاؑ کی دعوت پر لبیک کہیں اور ان کی تحریک کا ساتھ دیں، ﴿وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ﴾ لیکن جو خدا کی دعوت پر لبیک نہیں کہتے اور باطل راستے پر چلتے ہیں، وہ ﴿لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ اگر روئے زمین پر جو کچھ ہے ان کا ہو جائے، ﴿وَمِثْلَهُ مَعَهُ﴾ اور اس کے ساتھ اسی کے برابر مزید بھی ہو جائے، ﴿لَافْتَدَوْا بِهِ﴾ تو وہ اس چیز کے لیے تیار ہوں گے کہ وہ سب کچھ بطور فدیہ دیں اور اپنے آپ کو مصیبت سے چھٹکارا دلائیں۔ آپ نے تاریخ میں یہ نہیں دیکھا؟ آپ نے حق و باطل کی محاذ آرائیاں نہیں دیکھیں کہ کس طرح باطل کے سربراہوں اور پیشواؤں کی بساط لپیٹ دی گئی؛ اس وقت اگر ان سے ہو سکتا تو وہ اس بات پر تیار

ہوجاتے کہ ساری دنیا دے دیں اور اپنے آپ کو، اپنی جان کو، اپنے مقام و منصب کو محفوظ رکھیں۔ ﴿أُولَـٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ﴾ ان کے لیے بدترین حساب اور محاسبہ ہے ﴿وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ﴾ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے ﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ اور وہ کتنا برا مقام ہے۔ یہ سورہ رعد کی آیات تھیں۔

اکیسویں نشست

۲۲ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری

نبوت کا انجام (۲)

۹-۱۰-۱۹۷۴

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

﴿إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ۝ يَوْمَ لَا يَنفَعُ الظَّالِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۝ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَىٰ وَأَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ ۝ هُدًى وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ (سورہ غافر/۵۱-۵۴)

کل ہم نے عرض کیا تھا کہ خداوند متعال کا لوگوں کے درمیان موجود اپنے انبیا و مرسلین سے وعدہ ایک امید بخش اور نوید بخش وعدہ ہے؛ یعنی خداوند متعال نے وعدہ فرمایا ہے کہ اپنے انبیا اور رسالت کی امانت اپنے دوش پر اٹھانے والوں اور اسی طرح دین اور حق و حقیقت کی طرف دعوت دینے والے تمام افراد کو اس دنیا میں بھی اپنے دشمنوں پر کامیاب و کامران کرے اور آخرت میں بھی انہیں اجر و ثواب عطا فرمائے اور مجموعی طور پر انبیا کی کامیابی کے بارے میں جو کچھ بیان کیا جا سکتا ہے اسے میں نے دو مطلب میں خلاصہ کیا تھا؛ ایک یہ کہ جب ہم ابتدا سے آخر تک تاریخ کی نبوتوں کے سلسلے پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ مجموعی طور پر انسانیت کے یہ معلم کامیاب و کامران رہے ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے بعض دعوت کے دوران یا دعوت کے اختتام پر بعض ناکامیوں اور لوگوں کی ناشکری سے دوچار ہوئے ہیں لیکن مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ انبیائے کرام شروع سے آخر تک جو کام انجام دینا چاہتے تھے، وہ انہوں نے انجام دیا۔

حضرت نوحؑ تشریف لائے، انہوں نے انسانوں کی ہدایت کی ذمہ داری نبھائی اور انہیں فضیلت و کرامت اور شرافت کی طرف ایک قدم آگے کی طرف لے کرگئے، اگرچہ یہ ایک قدم آگے

لے جانے میں انہوں نے بہت دکھ سہے، اگرچہ انہوں نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی، دعوت کی اور انسانیت کو تھوڑا سا آگے کی طرف لے جا سکے، اگرچہ انہوں نے اس راستے میں اپنی جان کی پرواہ بھی نہ کی لیکن بہر حال انہوں نے اپنی ذمہ داری نبھائی یا نہیں؟ کیا انہوں نے انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود سے ایک قدم نزدیک کیا یا نہیں؟ آپ دیکھتے ہیں کہ نزدیک کیا ہے۔ حضرت نوحؑ کے بعد والے نبی آتے ہیں اور اس ذمہ داری کے بوجھ کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیتے ہیں وہ ایک قدم مزید آگے لے جاتے ہیں۔ تیسرے نبی آتے ہیں وہ ایک قدم اور آگے لے جاتے ہیں۔ خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفیٰؐ تشریف لاتے ہیں اور مبعوث بہ رسالت ہوتے ہیں، وہ اس بوجھ کو جو ایک خاص حد تک پہنچ چکا ہے ایک ایسے راستے پر ڈالتے ہیں جو نشیب کی طرح ہے اسے خود آگے کی طرف لے کر جائے گا، بشریت فکری بلوغ تک پہنچ چکی ہے۔ بنابریں شروع سے لے کر آخر تک انبیاؑ کامیاب رہے ہیں۔

آخر میں حضرت ولی عصر (عج) کا ظہور بھی ایک نوید اور بشارت ہے اس سلسلے میں تمام الٰہی اور خدائی انسانوں کے لیے، خدا کا آخری نمائندہ کہ جسے ہم اپنے زمانے کا امام سمجھتے ہیں اور دنیا کے تمام انسان جس کے انتظار میں ہیں، وہ تشریف لائے گا اور اس بوجھ کو اس کی آخری منزل تک پہنچائے گا۔ امام زمان (عج) کا کام کس کے کام کا تسلسل ہے؟ حضرت نوحؑ کے کام کا تسلسل ہے، حضرت ابراہیمؑ کے کام کا تسلسل ہے، حضرت موسیٰؑ کے کام کا تسلسل ہے، حضرت عیسیٰؑ کے کام کا تسلسل ہے، ہمارے پیغمبر اکرمؐ اور اہل بیت اطہارؑ میں سے آئمہ طاہرینؑ کے کام کا تسلسل ہے۔ چنانچہ اگر (ہدایت کا) یہ بوجھ آخر تک نہ پہنچتا تو حضرت نوحؑ ناکام شمار ہوتے، لیکن چونکہ یہ بوجھ آخر تک پہنچے گا اور حضرت نوحؑ بھی اسے آخر تک پہنچانے میں شریک رہے ہیں لہٰذا وہ ناکام نہیں ہیں، حضرت ابراہیمؑ ناکام نہیں ہیں، حضرت زکریاؑ کہ جنہیں آرے سے دو ٹکڑے کر دیا گیا، ناکام نہیں ہیں، وہ نبی کہ جنہیں کنویں میں پھینک دیا گیا، ناکام نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہیں کنویں میں ڈال دیا گیا، یہ صحیح ہے کہ وہ دنیا میں وہ کچھ نہ دیکھ سکے جو وہ دیکھنا چاہتے تھے، یہ صحیح ہے کہ حضرت یحییٰؑ کا سر زمانے کے طاغوت کے لیے تن سے جدا کر دیا گیا اور اس کے لیے بطور ہدیہ لے جایا گیا، یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی ناکام نہیں ہوا، کیوں؟ اس لیے کہ انہوں نے یہ سارے مصائب و آلام امانت کے بوجھ کو آگے لے جانے

اور اسے منزل سے قریب کرنے کے سلسلے میں برداشت کیے ہیں۔
دوسرا مطلب یہ ہے کہ بعض انبیا کو اس آخری کامیابی کے علاوہ کہ انہوں نے اس امانت کے بوجھ کو منزل سے ایک قدم نزدیک کیا، انہیں دنیا میں بھی کامیابیاں نصیب ہوئی ہیں۔ وہ کامیابیاں یہ تھیں کہ وہ توحیدی فکر اور اپنے مجوزہ مکتب کی بنیاد پر معاشرہ قائم کرنے میں سرخرو ہو گئے۔ اس کی واضح مثال ہمارے اپنے نبیؐ ہیں کہ جنہوں نے اسلامی فکر اور قرآنی طرز تفکر اور خداوند متعال کے الہام کی بنیاد پر ایک معاشرہ، مدینہ فاضلہ اور نظام قائم کیا۔ اور پیغمبر اسلامؐ ہی کی طرح ہیں بہت سے گذشتہ انبیاؑ جیسے حضرت عیسیٰؑ کے جانے کے بعد روم کے بادشاہ کا ایمان لے آنا اور حضرت موسیٰؑ کی رحلت کے بعد بنی اسرائیل کا مدینہ فاضلہ اور مثالی معاشرہ تشکیل دینا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے زمانے میں الٰہی معاشرہ قائم کیا کہ جس کی خبر قرآن دے رہا ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے پوری دنیا میں الٰہی حکومت قائم کی۔ بنی اسرائیل کے ایک نبی حضرت سلیمان بن داؤدؑ نے پورے عالَم کو ایک توحیدی اور الٰہی معاشرے کی صورت میں ایک دوسرے کے گرد اور ایک محور کے گرد اکٹھا کیا۔ پس بعض انبیا نے اپنی زندگی میں بھی کچھ کامیابیاں حاصل کی ہیں کہ جن کا خلاصہ الٰہی و توحیدی نظام اور معاشرے کی تشکیل ہے۔ بعض انبیا کو یہ موقع نصیب ہوا، جیسے حضرت زکریاؑ کہ جن کی میں نے مثال دی، جیسے حضرت یحییٰؑ کہ جن کا میں نے نام لیا، بظاہر اپنی زندگی میں ناکام ہوئے، آخرکار قتل کر دیئے گئے اور اسی طرح حضرت زکریاؑ اور یحییٰؑ سے پہلے کے کچھ انبیا۔ یہ کیا ہے؟ یہ بات کس طرح قابلِ تجزیہ و تحلیل اور قابلِ توجیہ ہے؟ کیا وجہ ہے کہ بعض انبیا کامیاب ہو جاتے ہیں اور بعض ناکام ہوتے ہیں؟ سب الٰہی اور توحیدی معاشرہ کیوں نہیں تشکیل دے پاتے؟ صرف بعض کو یہ موقع اور توفیق کیوں نصیب ہوتی ہے؟ اس کا جواب صرف ایک مختصر جملے میں ہے، جہاں بھی عظیم الٰہی انسانوں اور پیشواؤں نے کامیابیاں حاصل کی ہیں تو وہ ایمان اور صبر کے سائے میں حاصل کی ہیں اور ہر جگہ، جہاں بھی عظیم الٰہی راہنماؤں اور حق و حقیقت کی طرف دعوت دینے والوں کو شکست ہوئی ہے تو وہ کافی حد تک ایمان یا صبر نہ ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے، اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے۔ ہر جگہ اسی طرح تھا۔ جہاں بھی کسی نبی کے ساتھیوں اور اس پر ایمان لانے والوں نے اس نبی کے دشمنوں اور اس کی دعوت کے مخالفین و معاندین کے مقابلے میں صبر سے کام لیا ہے تو انہیں کامیابی نصیب ہوئی ہے انہوں نے پیش قدمی کی ہے۔ انبیا

کی دعوت میں فتح و نصرت اور پیش قدمی کا عنصر اور تقاضا پایا جاتا ہے، اس لیے کہ انبیا حق کے مطابق بات کرتے ہیں، حق کے تحت آگے بڑھتے ہیں اور حق کامیاب ہے۔ حق کائنات کی فطرت کے مطابق ہے لہٰذا کامیاب و کامران ہے۔ انبیا بھی کائنات کی فطرت کے مطابق بات کر رہے ہیں، بنابریں انبیا کی تحریک اور ان کے انقلاب میں کامیابی کا عنصر اور تقاضا مکمل طور پر موجود ہے۔ اگر آپ دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں ایک نبی نے شکست کھائی ہے تو اسے اس چیز کی دلیل نہ بنا لیں کہ حق ہمیشہ شکست ہی کھائے گا؛ نہیں، حق بات کو کامیاب ہونا چاہیے، حق کے نظام کو غالب آنا چاہیے، حق کے ہاتھ کو باطل کا سر پھوڑنا چاہیے، پس نبی ایک جگہ شکست کیوں کھاتے ہیں؟ اس لیے کہ نبی کے پیروکاروں کے پاس یا کافی حد تک ایمان نہیں ہے یا صبر نہیں ہے۔ اسلامی معاشرہ جس وقت خدا کا لشکر بن جائے تو پیش قدمی کرتا ہے اور جس وقت وہ پسپا ہوتا ہے تو اس وقت وہ خدا کا لشکر نہیں ہوتا، خدا کی سپاہ نہیں ہوتا۔ گفتگو کا ماحصل دو جملوں میں خلاصہ ہوتا ہے، ایک طرف ناکامیوں کی علت اور دوسری طرف کامیابیوں اور کامرانیوں کا سبب، جہاں بھی ایک نبی کے پیروکاروں نے اپنے اندر ایمانِ کامل اور یقینِ کامل پیدا کیا اور حق بات پر ڈٹ گئے وہاں یقیناً کامیاب ہوئے اور پیش قدمی کی، شکست ان سے دور رہی۔ حق اپنے حق ہونے کے باوجود کام، محنت و مشقت اور جدوجہد کا محتاج ہے۔ یہ نہ سمجھیں کہ چونکہ ہماری بات حق ہے پس ہمیں اس کے راستے میں سعی و کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ فکر نہ کریں کہ چونکہ ہماری دعوت کا محور قرآن ہے پس خدا خود ہی قرآن کو آگے لے جائے گا، نہیں؛ یہ صحیح ہے کہ حق بات حق ہے، یہ صحیح ہے کہ دنیا مستقبل میں اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہے لیکن اس کے لیے کوشش کی ضرورت ہے، جدوجہد کی ضرورت ہے، کچھ لوگوں کو اس راستے میں صبر کرنے کی ضرورت ہے، کچھ افراد کو حق بات منوانے کے لیے خونِ جگر پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ امیر المومنینؑ نہج البلاغہ میں ایک خطبے میں اس بات کو مکمل طور پر واضح فرماتے ہیں۔ امیرالمومنینؑ پیغمبرِ خداؐ کے زمانے میں مجاہدینِ اسلام کی کامیابیوں اور پیش قدمیوں کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ «وَ لَقَدْ كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللهِ صلی الله علیه وآله نَقْتُلُ آبَاءَنَا وَ أَبْنَاءَنَا وَ إِخْوَانَنَا وَ أَعْمَامَنَا»[1] فرماتے ہیں ہم پیغمبر خداؐ کے ساتھ اور ان کے ہمرکاب جب میدان جنگ میں جاتے تھے تو کفر و شرک کے محاذ پر موجود اپنے آباء

---

۱. نہج البلاغہ، خطبہ ۵۶

و اجداد، اولاد، بھائیوں اور چچاؤں کو قتل کرتے تھے۔ اگر ہمارا چچا، ہمارا باپ، ہمارا بیٹا، ہمارا بھائی کفر کے پرچم تلے پیغمبر خداؐ کے ساتھ جنگ کے لیے آتا تھا تو ہم جو کہ پیغمبر اکرمؐ کے ہمرکاب ہوتے تھے یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ میرا بھائی ہے پس اسے قتل نہ کروں، یہ میرا بیٹا ہے پس اسے نہ ماروں، بلکہ بلا استثنا سب کو راہ خدا میں تہہ تیغ کرتے تھے۔ اور پھر ان کو قتل کرنے کے بعد جب واپس آتے تھے تو دل میں یہ نہیں کہتے تھے کہ ہائے افسوس ہم نے اس نئے دین کے لیے، اس نئی فکر کے لیے اپنے فرزند دلبند کو قتل کر ڈالا، نہیں، اس سخت اقدام کی وجہ سے ہمارا ایمان کم نہیں ہوتا تھا بلکہ اور بڑھ جاتا تھا۔ «مَا یَزِیدُنَا ذٰلِکَ إِلَّا إِیمَاناً وَ تَسْلِیماً» یہ جہاد ہمارے ایمان اور الٰہی احکامات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو اور بڑھا دیتا تھا «وَ مُضِیّاً عَلَی اللَّقَمِ وَ صَبْراً عَلَی مَضَضِ الْأَلَمِ» ہمارا یہ جہاد اس چیز کا باعث بنتا تھا کہ ہم سخت کاموں میں اور زیادہ مصمم ہو جائیں، جہاد کے مصائب و آلام پر زیادہ صبر کریں۔ اس کے بعد امیر المومنینؑ اختصار کے ساتھ میدانِ جنگ کے حالات کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں ان کی تشریح نہیں کرنا چاہتا: «وَ جِدّاً فِی جِهَادِ الْعَدُوِّ وَ لَقَدْ کَانَ الرَّجُلُ مِنَّا وَ الْآخَرُ مِنْ عَدُوِّنَا یَتَصَاوَلَانِ تَصَاوُلَ الْفَحْلَیْنِ یَتَخَالَسَانِ أَنْفُسَهُمَا أَیُّهُمَا یَسْقِی صَاحِبَهُ کَأْسَ الْمَنُونِ» کہ ہمارا مجاہد میدانِ جنگ میں کس طرح دشمن پر حملہ آور ہوتا تھا، کس طرح اس کے ساتھ گتھم گتھا ہوتا تھا، کس طرح ہمارے مجاہدین اور اسلام کے بہادر سپاہی موت کی طرف پیش قدمی اور اس کا استقبال کرتے تھے، اس سے فی الحال ہمارا سروکار نہیں ہے۔ اس کے بعد اسی مختصر خطبے کے آخر میں فرماتے ہیں کہ «فَلَمَّا رَأَی اللهُ صِدْقَنَا أَنْزَلَ بِعَدُوِّنَا الْکَبْتَ وَ أَنْزَلَ عَلَیْنَا النَّصْرَ» اس حد تک ہم نے جہاد کیا کہ خدا نے دیکھ لیا کہ ہم سچے ہیں، دیکھ لیا کہ ہم واقعی مسلمان ہیں، دیکھ لیا کہ واقعی ہم مومن ہیں، ہم نے اپنے گہرے ایمان کا اظہار عمل سے کیا، جب ہم نے اس طرح سے عمل کیا، تو پھر خدا کی جانب سے ہمارے دشمنوں کی سرکوبی اور ہماری نصرت و کامیابی نازل ہوئی۔ کیا وجہ ہے کہ اس دن پیغمبر خداؐ نے تو اس طرح ترقی و پیشرفت جبکہ امیر المومنینؑ کے زمانے میں اس طرح سارے کام رک گئے؟ کیوں؟ امیر المومنینؑ اس کا راز بیان فرما رہے ہیں۔ فرماتے ہیں وجہ یہ ہے کہ اس دن ہم نے جنگ کے میدانوں میں صبر کیا، اس دن درد کی سوزش پر صبر کیا، اس دن ہم بستر خواب سے اٹھ کر میدان جہاد میں آئے، اس دن ہم نے خدا کے لیے اپنے مادی فوائد و منافع اور کاروبار سے ہاتھ اٹھا لیا لیکن آج تم لوگ اس کام کے لیے تیار نہیں

ہو۔ اس دن ہم نے ترقی کی، پیشقدمی کی، آج پسماندگی کا شکار ہیں۔ ایک انتہائی سادہ اور واضح سی بات ہے دو اور دو، چار کی طرح۔ یہ امیر المومنینؑ کا اجتماعی و معاشرتی تجزیہ و تحلیل ہے۔

جی ہاں، خلاصہ یہ ہے کہ انبیائے الہیٰؑ کے لیے نبوت و رسالت کے سلسلے میں کامیابی و کامرانی اور آخرکار ابدی و دائمی فتح و نصرت کے علاوہ اسی دنیا میں بھی فتح مندی و ظفر مندی اور اپنی اور اپنے مکتب کی آرزوؤں کا حصول مسلّم ہے بشرطی کہ ان کے پیروکار اور ان کا ساتھ دینے والے ایمان لے آئیں، حقیقی معنوں میں ایمان لے آئیں اور جنگ و جہاد کے میدانوں میں صبر کریں؛ ایمان اور صبر کی شرط کے ساتھ، یہ ساری گفتگو کا ماحصل ہے۔

اب قرآن کریم کی آیات کی طرف پلٹتے ہیں۔ سورۂ انبیاء سترھویں پارے میں ہے، سورہ طٰہٰ کے بعد۔ انتہائی ارفع و اعلیٰ ہیں سورۂ انبیاء کی آیات۔ میں ان دوستوں کو جو قرآن سے انس رکھتے ہیں، نصیحت کرتا ہوں کہ سورۂ انبیاء کو توجہ اور غور سے پڑھیں۔ سورہ کی ابتدا سے ہی خداوند متعال مسلسل فرما رہا ہے کہ انبیا کامیاب ہوں گے، انبیا کے دشمن ناکام و نامراد ہوں گے، آخرت سے پہلے اسی دنیا میں عذاب میں مبتلا ہوں گے؛ اس چیز کو سورہ کی ابتدا سے مسلسل فرما رہا ہے۔ کسی حد تک ان مطالب کا تکرار کرنے کے بعد تاریخ کو بیان کرتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا قصہ نقل فرماتا ہے، حضرت موسیٰؑ کی کامیابی اور ان کی مخالف طاقت کی شکست کا ذکر کرتا ہے؛ حضرت ابراہیمؑ کی داستان نقل فرماتا ہے، ان کی فتح و نصرت اور ان کی مخالف طاقتوں کی شکست و ذلت کا تذکرہ کرتا ہے؛ حضرت نوحؑ کا قصہ، حضرت سلیمانؑ کا قصہ اور مختلف دوسرے قصے۔ تمام وہ قصے جو اس سورہ میں نقل ہوئے ہیں اس طرح سے ہیں کہ انبیا پیش قدمی کرتے ہیں، کامیاب ہوتے ہیں، فاتح قرار پاتے ہیں اور انبیا کے مخالفین، انبیا کے انقلابات کے مخالفین، انبیا کی فکر نو کے مخالفین یعنی نبوت و رسالت کی مخالف ارتجاعی طاقتیں مغلوب ہوتی ہیں، شکست کھاتی ہیں اور صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہیں اور یہ تاریخ کی سنت اور روش ہے۔

فرماتا ہے کہ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ﴾[1] سورہ کی ابتدائی آیات ہیں۔ فرماتا ہے کہ تجھ سے پہلے ہم نے انبیا کو بھیجا اور ان پر وحی نازل کی ﴿وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ﴾ انہیں ہم نے مَلَک اور فرشتے کی شکل میں قرار نہیں دیا کہ ان کا جسم نہ ہو اور انہیں کھانے کی ضرورت نہ ہو ﴿وَمَا

۱. سورہ مبارکہ انبیا: آیات ۷ سے ۱۸

﴿كَانُوا خَالِدِينَ﴾ خالدین، خالد، جاوید اور دائمی و ہمیشگی بھی نہیں تھے، وہ بھی ایک وقت دنیا سے چلے گئے ہیں، لیکن ﴿ثُمَّ صَدَقْنَاهُمُ الْوَعْدَ﴾ ان کے ساتھ اپنے وعدے کو ہم نے پورا کیا، کامیابی کے وعدے کو ﴿ثُمَّ صَدَقْنَاهُمُ الْوَعْدَ فَأَنْجَيْنَاهُمْ﴾ انہیں نجات دی، ﴿وَمَنْ نَشَاءُ﴾ اور ان کے ساتھ جن کو چاہا نجات دی، ﴿وَأَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِينَ﴾ اور تجاوز کرنے اور حد سے بڑھنے والوں کو ہلاک کیا، ﴿لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ اب تمہاری طرف بھی اے مومنین ہم نے کتاب اور قرآن کو بھیجا ہے کہ جس میں تمہارے لیے آگاہی، یاد آوری اور تذکر ہے، ﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ کیا تعقل نہیں کرتے ہو؟ تفکر و تدبر نہیں کرتے ہو؟

اس کے بعد گیارہویں آیت میں فرماتا ہے: ﴿وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ﴾ حقیقت میں یہ انبیا کی فتح و نصرت کا ترانہ ہے، انتہائی محرک اور جذبات کو بر انگیختہ کرنے والا ترانہ جو یہ بتاتا ہے کہ کس طرح انبیا ان الٰہی اور غیبی امدادوں اور تائیدوں کے ذریعے جو اس کائنات اور عالَم کے باطن میں ہیں، کامیاب و کامران ہوئے ہیں؛ وہ غیبی امدادیں جو خود اسی جہان اور دنیا کے باطن میں پوشیدہ ہیں اور کائنات اور انسان کی سرشت اور فطرت کے برابر اور مساوی ہیں، نہ اس طرح کی غیبی امدادیں جو عوام الناس چاہتے ہیں کہ غیب سے ایک ہاتھ آئے جو دشمن کے سینے پر ضرب لگائے اور اسے وہیں ڈھیر کر دے۔ خدا نے کائنات میں چھپی غیبی امدادوں کے ذریعے انبیا کو فتح و نصرت سے ہمکنار کیا ہے۔ ﴿وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ﴾ اور کتنی ہی آبادیوں اور معاشروں کو ہم نے تباہ و برباد اور نیست و نابود کر دیا جو کہ ﴿كَانَتْ ظَالِمَةً﴾ ظالم تھے۔

ظالم معاشرہ، ظالم نظام، ظالم تمدن، وہ معاشرہ کہ جس کی بنیادیں ظلم و ستم پر استوار ہوں، جس میں طبقہ بندی پیدا ہو چکی ہو، استثمار وجود میں آچکا ہو یعنی انسان دوسرے انسانوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہو؛ ایسا معاشرہ ظالم معاشرہ ہے، ایسی آبادی ظالم آبادی ہے، ایسی بستی ظالم بستی ہے، اور ہم نے کتنے ہی ایسے معاشروں اور بستیوں کو نیست و نابود کیا ہے۔ ﴿قَصَمْنَا﴾ یعنی نابود کر دیا، صفحہ ہستی سے مٹا دیا ﴿وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ﴾ اور ان کے بعد دوسرے لوگوں کو، دوسرے گروہ کو، دوسرے طبقے کو سامنے لے آئے، ﴿فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا﴾ عذاب الٰہی دیکھنے کے بعد ظالموں کی بیچارگی کی شرح ہے ﴿فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا﴾ جونہی ان ظالموں نے ہمارے غیظ و غضب کو

محسوس کیا یا تو اس باب سے کہ مثلاً فرض کریں آسمان سے عذاب نازل ہوا یا اس باب سے کہ انہوں نے دیکھا کہ مومنین اپنے نبی کے ساتھ ان پر حملہ آور ہو چکے ہیں اور عنقریب خدا کے غیظ و غضب کی تلوار ان کے سروں پر چلائیں گے، جونہی انہوں نے ہمارے غیظ و غضب کو محسوس کیا ﴿إِذَا هُم مِّنْهَا يَرْكُضُونَ﴾ تو اچانک ان آبادیوں سے، اس تمدن سے، اس معاشرے سے فرار کرنے لگے، بھاگنے لگے ﴿لَا تَرْكُضُوا﴾ مت بھاگو ﴿وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ﴾ اپنی آسائش گاہوں اور آرام گاہوں کی طرف لوٹ جاؤ، ان محلّات کی طرف پلٹ جاؤ جن میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے، اس معاشرے اور اس شہر کی طرف لوٹ جاؤ کہ جس شہر میں سرداری کرتے تھے، فخر اور ناز نخرے کرتے تھے، کہاں بھاگ رہے ہو؟ ﴿وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ﴾ اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاؤ ﴿لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ﴾ شاید تمہارا مؤاخذہ کیا جائے، شاید تم سے باز پرس کی جائے، کہاں بھاگ رہے ہو؟ ﴿قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ﴾ انہوں نے کہا وائے ہو ہم پر، وائے ہو ہم پر کہ ہم ظالم و ستمگر تھے، ﴿فَمَا زَالَت تِّلْكَ دَعْوَاهُمْ﴾ وہ یہی کہے جا رہے تھے ﴿حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ﴾ یہاں تک کہ ہم نے انہیں موت کا نوالہ بنا دیا اور نیست و نابود کر دیا۔

بعد والی یہ آیات در حقیقت اس تاریخی حقیقت کی فکری بنیاد کو بیان کر رہی ہیں، ایسا کیوں ہوا؟ کیوں ظالم مٹ جائیں اور مظلوم ان کی جگہ لے لیں؟ کیوں انبیاؑ کی دعوت ہر حال میں پیش قدمی کرے اور ان کے دشمن نیست و نابود ہو جائیں؟ اس کا سبب یہ ہے: ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ﴾ ہم نے آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اسے بیہودہ اور بے مقصد پیدا نہیں کیا، ﴿لَوْ أَرَدْنَا أَن نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنَاهُ مِن لَّدُنَّا إِن كُنَّا فَاعِلِينَ﴾ اگر ہم چاہتے کہ بےہدف و بےمقصد اور بےہودہ کام انجام دیں تو انجام دیتے؛ خود ہی یہ کام کر لیتے اگر ایسا کام کرنے والے ہوتے، لیکن ہرگز ایسا کام نہیں کرتے۔ پروردگار عالم بےہودہ اور بےمقصد کام نہیں کرتا، باطل کے مطابق عمل نہیں کرتا، فضول کام نہیں کرتا۔ کیا مطلب؟ یعنی اس آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے ہم نے اگر پیدا کیا ہے تو ایک خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے، ایک ہدف اور ایک مقصد تک پہنچنے کے لیے خلق فرمایا ہے۔ حق یعنی اس آسمان و زمین کی اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان سب کی حرکت اس ہدف کی طرف ہے۔ وہ راستہ جو زمین و آسمان اور ان کی موجودات کو اس منزلِ مقصود

اور ہدفِ مطلوب تک لے جاتا ہے کہ جس کے لیے انہیں خلق کیا گیا ہے، وہ راستہ حق ہے۔ ہر وہ ذریعہ اور وسیلہ جو انسانوں کو اس منزلِ مقصود تک پہنچائے، وہ ذریعہ حق ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے؛ آیت میں تدبر کرنے سے یہ بات انتہائی روشن اور واضح ہو جاتی ہے۔ اور قرآن کریم کی بنا اس چیز پر ہے کہ ان چیزوں کی تصریح نہیں کرتا جو غالباً سمجھی جا سکتی ہیں، واضح و روشن ہیں اور عقل انسانی ان تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ﴾ بلکہ ہم حق کے ذریعے باطل کی بساط لپیٹ دیتے ہیں۔

یہ راہ حق، یہ صحیح طریقہ، انسان اور جہان کا یہ فطری طریقہ آخرکار باطل پر غالب آجائے گا۔ بلکہ ہم حق کو باطل پر کامیاب کرتے ہیں، ﴿فَيَدْمَغُهُ﴾ پس یہ حق، باطل کو مکمل طور پر نیست و نابود کر دیتا ہے، ﴿فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ اس وقت آپ دیکھتے ہیں کہ باطل نابود ہو رہا ہے، زوال کی طرف جا رہا ہے، ﴿وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ﴾ اس وقت اے ظالمو! اے ستمگرو! اے باطل پرستو! وائے ہے تم پر، بیچارگی اور نیستی و نابودی ہے تم پر۔ ﴿وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ﴾ وائے ہے تمہارے لیے اور ہلاکت ہے تمہارے لیے اس سے کہ جس کی توصیف کرتے ہو اور بیان کرتے ہو۔

بائیسویں نشست

نبوت پر ایمان کے تقاضے

۲۳ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری ۱۰-۱۰-۱۹۷۴

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّى يُهَاجِرُوا وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ (سورہ انفال/۷۲)

نبوت کی بحثوں میں ایک مسئلہ ضرور اٹھایا جانا چاہیے اور اگر ہم اسے نہ سمجھ پائیں تو نبوت کے باب کی بہت سی بحثوں کا ہمارے لیے عملی طور پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ یہ آخری بحث پچھلی بحثوں کے ہماری زندگی میں عملی ہونے کی ضامن ہے۔ یہ آخری بحث ہے کیا؟ یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں «اَشھدُ انَّ محمّداً رسولُ الله» میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ خدا کے رسول ہیں، اس کا اعلان کرتا ہوں اپنی اذان میں، اپنی نماز میں، شہادتین کے وقت، ہر جگہ پر کہ میں اپنے نبیؐ کی امت ہوں اور قبول کرتا ہوں، اعتقاد رکھتا ہوں، ایمان رکھتا ہوں ان کی نبوت پر۔ یہ شہادت اور گواہی جو میں دیتا ہوں میرے کندھوں پر کیا ذمہ داری ڈالتی ہے؟ اصولی طور پر یہ عقیدہ، یہ شہادت، یہ گواہی مجھ پر کوئی ذمہ داری ڈالتی بھی ہے یا نہیں؟

ایک وقت آپ کہتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں اور اس چیز کو قبول کرتا ہوں کہ مثلاً گلِ نرگس، گلِ محمدی سے زیادہ خوشبودار ہے؛ یہ بھی ایک بات ہے۔ بعض اس چیز کو بھی نہیں جانتے۔ بعض اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔ جناب عالی نے بھی غلط یا صحیح یہ عقیدہ رکھ لیا کہ اس پھول کی خوشبو اس پھول سے زیادہ دلفریب ہے۔ اچھا تو یہ شہادت جو آپ نے دی ہے «ثم ماذا» ہم دینی طالب علموں کے

بقول، اس کے بعد کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اگر ہم شہادت دیں اور قبول کریں کہ یہ پھول اس پھول سے بہتر ہے یا اس کے برعکس یہ تسلیم کریں کہ وہ پھول اس پھول سے بہتر ہے، اس کا ہماری زندگی میں کوئی اثر نہیں ہے، یہ چیز ہمارے کندھوں پہ کوئی ذمہ داری نہیں ڈالتی ہے۔
یہ جو میں نماز کے تشہد میں کہتا ہوں «اَشھدُ انَّ محمّداً رسولُ الله» اپنے شہر اور علاقے میں گلدستۂ اذان سے ایک عمومی شعار اور نعرے اور مجموعی طور پر اس معاشرے کے عقیدے کے اظہار کے طور پر جو کہا جاتا ہے «اَشھدُ انَّ محمّداً رسولُ الله» تو نبوت کی یہ شہادت و گواہی، نبوت پر یہ ایمان اور اس ایمان کا اعلان و اظہار مجھ شہادت دینے والے کے دوش پر اور اس معاشرے کے کندھوں پر کہ جس کے شعار اور نعرے کے طور پر یہ گواہی دی جاتی ہے، کوئی ذمہ داری ڈالتا ہے یا نہیں؟ سوال یہ ہے۔ جواب یہ ہے کہ جی ہاں ڈالتا ہے۔ کون سی ذمہ داری پیغمبر خداؐ کے پیروکار اور ان کی دعوت کو قبول کرنے والے کے کندھوں پر ڈالتا ہے؟ ایک جملے میں میں اس ذمہ داری کا خلاصہ کرتا ہوں۔ پیغمبر خداؐ کی نبوت کا عقیدہ رکھنے والے کے کندھوں پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ ہے رسول خداؐ کے راستے پر چلنا اور نبی اکرمؐ کی ذمہ داریوں کے بوجھ کو اپنی منزل تک پہنچانا۔ یہ کلمات و جملات بڑی آسانی سے ادا ہوجاتے ہیں لیکن ان کی ذمہ داری اور تقاضے انتہائی سنگین ہیں؛ اور بنیادی طور پر نبی کی امت ہونے اور نبوت کی شہادت دینے کا مطلب بھی یہی ہے۔
کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ کہا کہ ہم فلاں نبی کی نبوت کو قبول کرتے ہیں تو جونہی ہم نے دل سے اس کی نبوت کے اقرار کا زبان سے اظہار کیا تو بات ختم ہو گئی، ہم نے اپنے آپ کو جہنم کی سرحد سے جنت کی سرحد میں داخل کر لیا۔ غور سے سنیں اور دیکھیں کہ کیا یہ عقیدہ جو میں بیان کرنے لگا ہوں، آپ کے ذہنوں میں ہے یا نہیں ہے؟ اس سے مجھے سر و کار نہیں ہے کہ کون یہ عقیدہ رکھتا ہے اور کون نہیں رکھتا۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ انسان خدا کی غیظ و غضب کی آگ میں جل رہے تھے اسی اثنا میں خاتم الانبیاؐ کی نبوت کا مسئلہ سامنے آیا تو خدا کے عذاب اور غیظ و غضب کی آگ میں جلنے والے ان لوگوں میں سے کچھ نے کہا «آشھدُ انَّ محمّداً رسولُ الله» میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ خدا کے رسول ہیں، یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ خدا کے عذاب اور غیظ و غضب کی آگ سے باہر نکل آئے اور خدا کی رحمت و رأفت کی وادی میں داخل ہو گئے۔ اب اگر انہوں نے نماز پڑھی اس وادی

رحمت میں تو رحمت کے سرچشمے کے تھوڑے نزدیک ہو جائیں گے؛ اگر روزہ رکھا تو تھوڑے مزید نزدیک ہو جائیں گے؛ اور اگر خمس و زکوٰۃ ادا کی تو اور زیادہ نزدیک ہو جائیں گے؛ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا تو کچھ اور نزدیک ہو جائیں گے؛ اور دوسرے نیک کام بھی کیے تو رحمت کے سرچشمے تک پہنچ جائیں گے؛ اور اگر انجام نہ بھی دیئے تو پھر بھی رحمت کی وادی میں تو ہیں ہی۔ توجہ فرمائی آپ نے؟ بعض اس طرح سمجھتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے؛پیغمبر خداؐ پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن اس ایمان کے کچھ تقاضے ہیں، یہ ایمان اپنے پیچھے کچھ ذمہ داریوں کو لے آتا ہے، اگر وہ تقاضے پورے کیے جائیں، اگر وہ ذمہ داریاں ادا کی جائیں تو جس حد تک وہ تقاضے پورے کیے جائیں گے، جس حد تک وہ ذمہ داریاں پوری کی جائیں گی، اسی حد تک انسان کا ایمان بھی صحیح ہوگا۔ اور اگر کسی انسان کی زبان پر یا حتیٰ کہ دل میں ایمان ہو لیکن اس نے ایمان کی کسی بھی ذمہ داری کو قبول نہ کیا، نبی کی نبوت کو قبول کرنے سے انسان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں کسی ذمہ داری کو بھی ادا نہ کیا تو ایسا انسان اگرچہ ظاہری طور پر مومن ہے لیکن حقیقی معنوں میں مومن نہیں ہے۔ قیامت میں خدا اس کے ساتھ کیا کرے گا؟ میں نہیں جانتا، جاننا ضروری بھی نہیں ہے؛ لیکن اس دنیا کے معیاروں کے مطابق اگر ہم بطور قاضی فیصلہ کرنا چاہیں کہ ایسا انسان مومن ہے یا مومن نہیں ہے تو ہم یہی کہیں گے کہ اس قسم کا شخص مومن نہیں ہے۔

البتہ اس بات کا اضافہ کرتا چلوں کہ اس کلمۂ شہادت کا زبانی اقرار اور ظاہری طور پر اس عقیدے کا اظہار اگرچہ مشہور و معروف قول کے مطابق انسان کی جان و مال کو محفوظ بنا دیتا ہے کہ البتہ اس بات میں یہ تھوڑا تساہل ہے یعنی انسان کو اسلامی سرحد میں داخل کرتا ہے لیکن بحث اس بات پر نہیں ہے کہ ہم دیکھیں کہ آیا انسان کی جان و مال محفوظ ہے یا نہیں ہے بلکہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مومن ہے یا مومن نہیں ہے۔ ہم قرآنی معیاروں کے مطابق کہ جن کی آیات کا میں آپ کے سامنے معنی کرتا ہوں، یہ کہتے ہیں کہ جو شخص ایمان کے تقاضوں کا پابند نہ ہو وہ مومن نہیں ہے، وہ اس وقت مومن ہے جب ان تقاضوں اور ذمہ داریوں کا پابند ہو جو نبوت پر ایمان انسان کے کندھوں پر ڈالتا ہے۔

وہ ذمہ داری کیا ہے؟ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ میں دیکھوں کہ پیغمبر خداؐ اس دنیا میں کیا کرنا چاہتے تھے،

ایک عظیم بوجھ کو پیغمبر خداؐ اٹھانا چاہتے تھے، ایک عظیم پتھر کو رسول خداؐ اپنی جگہ سے اکھاڑنا چاہتے تھے، ایک عظیم عمارت کی پیغمبر اکرمؐ بنیاد رکھنا چاہتے تھے، میں بھی اپنے زمانے میں دیکھوں کہ آیا وہ بوجھ جو پیغمبر خداؐ اٹھانا چاہتے تھے، مکمل طور پر اٹھا لیا گیا ہے؟ وہ پتھر جسے رسول خداؐ زمین سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے، مکمل طور پر اکھاڑا جا چکا ہے؟ وہ عمارت جو رسول اکرمؐ کھڑی کرنا چاہتے تھے، مکمل طور پر بن چکی ہے؟ اگر میں دیکھوں کہ ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے یعنی وہ بوجھ ابھی زمین پر ہی پڑا ہے، وہ پتھر ابھی تک نہیں اکھاڑا گیا ہے، وہ عمارت ابھی تک نہیں کھڑی ہوئی ہے تو مجھے کوشش کرنی چاہیے کہ جو کام وہ کرنا چاہتے تھے کروں۔ کوشش کروں کہ اس بوجھ کو میں اٹھا لوں۔ اگر میری ہڈیاں کمزور ہوئیں اور میرا بس نہ چلا تو جس حد تک ہو سکے میں کوشش کروں، اس پر زور لگاؤں، دس افراد اور بھی اپنے ساتھ ملالوں تاکہ مل کر اس بوجھ کو اٹھالیں، کچھ اور لوگ بھی اکھٹے کر لوں تاکہ مل کر اس عمارت کو کھڑا کر لیں۔ اگر مکمل عمارت کھڑی نہ بھی کر سکوں تو کیا دس اینٹیں بھی وہاں نہیں لگا سکتا ہوں؟ اس کا ڈھانچہ کھڑا کرنے میں معمولی سی مدد بھی نہیں کر سکتا ہوں؟ اس کام کے مقدمات بھی فراہم نہیں کر سکتا ہوں؟ اگر یہ کہوں کہ نہیں کر سکتا تو یہ جھوٹ ہے۔

اس تقاضے اور اس ذمہ داری کا پابند ہونا چاہیے ورنہ یہ کہنا جھوٹ ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ یہ ایک ظاہری شہادت اور گواہی ہے۔ شہادت دیتا ہوں کہ وہ پیغمبرؐ ہیں لیکن یہ شہادت نہیں دے سکتا کہ میں ان کی نبوت و رسالت کا عقیدہ رکھتا ہوں، منافقوں کی طرح: ﴿إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ﴾[۱] آکر کہتے تھے یا رسول اللہ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں؛ خدا فرماتا ہے جی ہاں ہم خود جانتے ہیں کہ آپ ہمارے رسول اللہ ہیں، یہ بات ہمارے لیے واضح و روشن ہے، ہمارے نزدیک مسلّم ہے، اپنی جگہ پر صحیح بات ہے؛ لیکن ہم شہادت دیتے ہیں کہ وہ اپنی اس شہادت اور گواہی میں جھوٹے ہیں؛ دل سے اس چیز کو قبول نہیں کرتے صرف زبان سے اقرار کر رہے ہیں۔

رسالت کی ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا کو اس طرح بنایا جائے جس طرح اسلام چاہتا ہے؛ یہ رسالت کی ذمہ داری ہے۔ رسول خداؐ جب آتے ہیں تو اس لیے آتے ہیں تاکہ دنیا کو اس طرح بنایا جائے جس

---

۱. سورہ مبارکہ منافقون: آیت ۱

طرح اسلام بنانا چاہتا ہے۔ پیغمبر اس لیے مبعوث ہوتے ہیں تاکہ انسانوں کی زندگی کی شکل و صورت اور نظام کو اس طرح بنائیں جس طرح خدا چاہتا ہے۔ اگر آپ اپنے زمانے میں دیکھیں کہ بشریت اس طرح زندگی نہیں گزار رہی جس طرح خدا نے فرمایا ہے، اگر دیکھیں کہ انسانیت ایک الٰہی معاشرے سے محروم ہے، اگر دیکھیں کہ مختلف مکاتب فکر انسانیت کو اِدھر اُدھر لے جا رہے ہیں اور اسلام صرف انسانوں کے دل و دماغ کے ایک حصے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے تو پیغمبر خداؐ کی رسالت کی گواہی دینے کی بنیاد پر آپ کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ کوشش کریں تاکہ دنیا کو اس شکل و صورت میں لے آئیں جو اسلام نے فرمائی ہے؛ یہ نبوت کی ذمہ داری اور تقاضا ہے۔

پیغمبر خداؐ کیا کرنا چاہتے تھے؟ لوگوں کو بہشت لے جانا چاہتے تھے: اس دنیا کی بہشت اور موت کے بعد کی بہشت، دونوں۔ چونکہ لوگوں کو جنت کی طرف لے جانا چاہتے ہیں لہٰذا لوگوں کو چاہیے کہ ان کے ساتھ چلیں، اگر ان کے ساتھ نہیں چلیں گے تو جنت نہیں پہنچ پائیں گے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ رسول خداؐ انسانوں کو سعادت و خوشبختی کی منزل تک لے جانا چاہتے ہیں۔ اگر ان کے ساتھ نہ چلیں، اگر ان کے ساتھ نہ جائیں تو کمال و سعادت کی منزل تک نہیں پہنچ پائیں گے، یہ بات یاد رکھیں۔ اب ان دو صفوں کے درمیان ایک شخص ہے، پیغمبر خداؐ کی طرف دیکھتا ہے کہ آپؐ باتیں تو صحیح کر رہے ہیں، جتنا غور سے سنتا ہے دیکھتا ہے کہ رسول خداؐ کی باتیں اچھی باتیں ہیں؛ دوسری طرف دیکھتا ہے کہ اگر رسول خداؐ کی صف میں جائے تو مجبور ہے کہ سامنے والی صف کے ساتھ مبارزہ و مقابلہ کرے۔ سامنے والی صف میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ دیکھ رہا ہے کہ اس صف والے جہنم کی طرف جا رہے ہیں، پیغمبر خداؐ کی صف میں بھی نہیں آنا چاہتا کیونکہ دیکھ رہا ہے کہ پیغمبرؐ کی صف میں مشکلات ہیں۔ کیا کرتا ہے؟ ان دونوں صفوں کے درمیان میں آتا ہے، ایک پرامن جگہ کا انتخاب کرتا ہے وہاں ایک خیمہ لگاتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے، یہ کیسا شخص ہے؟ آپ بتائیں کہ یہ شخص جو درمیان میں بیٹھا ہے، دو صفوں کے درمیان بستر پر آرام کر رہا ہے، کیا یہ بہشت پہنچ سکے گا یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں پہنچ سکے گا۔ کیونکہ پیغمبر خداؐ بہشت جانا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ وہ لوگ بہشت میں جائیں گے جو ان کے ساتھ چلیں گے، یہ شخص تو رسول خداؐ کے ساتھ نہیں چلا ہے۔ جو بھی دو صفوں کے درمیان ہے، پیغمبر خداؐ کے ساتھ نہیں ہے، جو بھی پیغمبر خداؐ کے ساتھ نہیں ملا ہے وہ ان کے خلاف ہے؛ جو شخص بھی

علیؑ کے ساتھ نہ ہو وہ علیؑ کے خلاف ہے؛ جو بھی حق کے ساتھ نہ ہو وہ حق کے خلاف ہے۔ یہ ہمیں قرآن بھی بتاتا ہے لیکن امامؑ کا فرمان جو کہ ذہن اور فہم کے زیادہ نزدیک ہے، اس حقیقت کو اس طرح بیان فرماتا ہے کہ «اَلسَّاکِتُ أَخُو الرَّاضِی»[۱] اس حدیث کو یاد رکھیں، یہ حدیث بحار الانوار کی جلد «مواعظ» میں ہے «اَلسَّاکِتُ أَخُو الرَّاضِی وَ مَنْ لَمْ یَکُنْ مَعَنَا کَانَ عَلَیْنَا» جو شخص باطل صورت حال کے مقابلے میں خاموش ہے وہ اس کا بھائی ہے جو اس صورت حال پر راضی ہے۔ یہ نہیں فرماتے کہ جو راضی ہے وہ کیا ہے اس کی پوزیشن معلوم ہے «مَن رَضِیَ بِفِعلِ قَومٍ فَهُوَ مِنهُم» جو بھی ایک قوم کے کام پر، کچھ لوگوں کی زندگی پر راضی ہو تو وہ بھی انہی میں سے ہے، اسے بھی وہیں لے جائیں گے جہاں اُن کو لے جائیں گے۔ یہ جو خاموش ہے اگرچہ دل میں راضی نہیں ہے لیکن چونکہ اس ناراضگی کا اظہار نہیں کرتا پس یہ بھی اس کا بھائی ہے جو راضی ہے۔ اس کے بعد کا جملہ ہے «وَ مَنْ لَمْ یَکُنْ مَعَنَا کَانَ عَلَیْنَا» جو بھی ہمارے ساتھ نہیں ہے پس ہمارے خلاف ہے۔ ان دو صفوں کے درمیان اسلام کی نظر میں غیر جانبدار رہنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ بقول شاعر

گفت ای گروه هر که ندارد هوای ما
سر گیرد و برون رود از کربلای ما[۲]

امام حسینؑ نے کربلا کے سفر میں فرمایا کہ جو بھی ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ ہماری کربلا سے نکل جائے اور چلا جائے، چلا جائے اس لیے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ وہ شخص جسے امام حسینؑ کربلا کے راستے میں بلاتے ہیں کہ آؤ اور ہماری مدد کرو اور وہ کہتا ہے کہ یابن رسول اللہ! میں اپنا گھوڑا یا اپنی تلوار آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، واضح ہے کہ ایسا شخص امام حسینؑ کے ساتھ نہیں ہے؛ وہ امام حسینؑ کے خلاف ہے نہ کہ امام حسینؑ کے ساتھ ﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۞ کَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾[۳] جس چیز کا عقیدہ رکھنے کا زبان سے اظہار کرتے ہو، اس پر عمل کیوں نہیں کرتے ہو؟ بہت زیادہ احادیث کے راوی، مفسر قرآن، شیعہ سنی سب کے نزدیک معتبر شخصیت، امیر المومنینؑ اور پیغمبر خداؐ کے چچازاد بھائی عبداللہ بن عباس نے حضرت علیؑ کے ساتھ یہی

---

۱. بحارالانوار، کتاب الروضة، ابواب المواعظ و الحکم، باب مواعظ امیر المومنین
۲. نیّر تبریزی
۳. سورہ مبارکہ صف: آیات ۲ اور ۳

کیا، امیر المومنینؑ کے عبداللہ بن عباس کے نام دو خط اور دو خطاب ہیں نہج البلاغہ میں۔ یہ شخص جب بصرہ کا حاکم اور والی تھا اس نے بیت المال سے بہت زیادہ دولت و ثروت اٹھائی اور بھاگ گیا، کہاں؟ مکہ، حرم امن الٰہی میں۔ یقیناً سارا مال وہاں صدقہ خیرات کر دیا ہوگا! غربا اور فقرا کو دے دیا ہوگا! جی ہاں کنیزیں بیچنے والے غریبوں کو دیا، چند کنیزیں خریدیں، اور ان حسین و جمیل کنیزوں کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے میں مصروف ہو گیا۔

آج اگر عبد اللہ بن عباس ہوتا تو آپ کی نظر میں امیر المومنینؑ کے بارے میں کیا کہتا؟ حضرت علیؑ کی فضیلت میں پہلے درجے کی ساری حدیثیں وہی نقل کرتا تھا، حضرت علیؑ کی یاد میں آنسو بہاتا تھا، امام علیؑ کے ساتھ گزرے لمحات کی خوشگوار یادیں نقل کرتا تھا، لیکن کیا میں اور آپ جیسے ہوشیار اور زیرک لوگ یہ قبول کرتے کہ وہ حضرت علیؑ کا شیعہ ہے؟ ہم یہ کہتے کہ جاؤ کسی اور کو دھوکہ دینا؛ اگر تو شیعہ ہوتا تو امتحان کے وقت اور سخت حالات میں علیؑ کو چھوڑ کے نہ جاتا۔ «عِندَ الامتِحانِ یُکرَمُ الرّجُلُ أو یُهانُ»[1] «فی تَقَلُّبِ الأحوالِ عُلِمَ جَواهِرُ الرِّجالِ»[2] تو اگر علیؑ کا شیعہ ہوتا تو علیؑ کو خون کے آنسو نہ رلاتا؛ علیؑ کو تنہا چھوڑ کر علیؑ کو فریادیں بلند کرنے پر مجبور نہ کرتا، کہ علیؑ نے عبداللہ بن عباس کے چلے جانے پر اس طرح فریاد کی: تو میرے تمام رشتے داروں سے زیادہ میرے نزدیک تھا، مجھے تجھ سے امید تھی، مجھے تجھ پے اعتماد تھا، تو اپنے چچازاد بھائی کو ان سخت حالات میں چھوڑ کر چلا گیا؟ امام علیؑ کا ایک خط ہے نہج البلاغہ میں عبداللہ بن عباس کے نام، البتہ مرحوم سید رضیؒ[3] چونکہ بنی عباس کے زمانے میں تھے لہٰذا خوف یا شرم کی وجہ سے انہوں نے «مِن کِتابٍ لَهُ اِلی عَبدِاللهِ بنِ عباس» کی بجائے لکھا «مِن کِتابٍ لَهُ اِلی بَعضِ عُمّالِهِ»[4] کہ امامؑ نے اپنے گورنروں یا والیوں میں سے ایک کے نام لکھا، یہ نہیں لکھا کہ یہ گورنر کون تھا لیکن جب آپ اس خط کو پڑھتے ہیں تو پتہ چل جاتا ہے کہ عبداللہ بن عباس تھا۔ مزید یہ کہ نہج البلاغہ کے علاوہ دوسری کتابوں میں نقل ہوا ہے کہ یہ عبداللہ بن عباس سے مربوط ہے

---

۱. آزمائش میں مردوں کو عزت یا ذلت ملتی ہے۔ (غرر الحکم و درر الکلم، الفصل الثانی و الخمسون، حدیث ۷)

۲. حالات کے بدلنے میں مردوں کے جوہر سامنے آتے ہیں۔ (نہج البلاغہ، حکمت ۲۱۷)

۳. ابوالحسن، محمد بن حسین (۳۵۹-۴۰۶ ھ ق) الملقّب سید رضیؒ۔ بغداد میں پیدا ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ کے ساتھ شیخ مفیدؒ کے پاس تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس زاہد و پارسا عالم کی شہرت کی اصل وجہ نہج البلاغہ کی تالیف ہے۔

۴. نہج البلاغہ، مکتوب نمبر ۴۱

کہ تو نے اپنے چچازاد بھائی کو اکیلا چھوڑ دیا اور یہ کیا اور وہ کیا۔

جی ہاں، نبوت کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کا تقاضا ہے: نبیؐ کے نقش قدم پر چلنا، ان کی ذمہ داری کو قبول کرنا اور جس طرح وہ چاہتے ہیں اس طرح عمل کرنا۔

وقت گزر گیا، تمام آیات کا ترجمہ و تشریح کرنے کی فرصت نہیں ہے صرف چند آیات کا آپ کے لیے معنی کرتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ اسلام کے تقاضے کیا ہیں۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا﴾[۱] وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کیا۔ پیغمبر خداؐ کے زمانے سے مربوط ہے، یہ نہیں کہنا چاہتا کہ دوسرے زمانوں کے لیے نہیں ہے، نہیں، یہ ایک کلی حکم ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے زمانے کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ اس وقت ہجرت کا مسئلہ بھی درپیش تھا؛ اسلامی معاشرے کی طرف ہجرت۔ اس زمانے میں کچھ لوگ مسلمان ہو جاتے تھے، پیغمبر اکرمؐ کے طرز تفکر کو قبول کرتے تھے لیکن مکہ سے باہر جانے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ کہتے تھے باہر کیوں جائیں؟ مکہ میں میری دکان ہے، کاروبار ہے، میرے جانے پہچانے گاہک ہیں، قوم قبیلہ ہے، دوست احباب ہیں، ان سب کو چھوڑ کر پیغمبرؐ کے پاس چلا جاؤں؟ آخر کس لیے؟ ایمان ضروری ہے؟ ایمان ہے، سو بار کہتا ہوں، دل میں، زبان سے، البتہ آہستہ کہ کوئی سن نہ لے، خدا ایک ہے، پیغمبرؐ بھی برحق ہیں، پیغمبرؐ مجھ سے نماز چاہتے ہیں، پڑھتا ہوں، روزہ چاہتے ہیں، تیس دن کی جگہ ساٹھ دن روزہ رکھتا ہوں، لیکن مدینہ کیوں جاؤں؟ بعض حضرات اس طرح سوچتے تھے، ہجرت وہاں ضروری تھی۔ اسلامی معاشرہ قیام کے ابتدائی مراحل میں تھا، ان کو چاہیے تھا کہ جاتے، اسے مضبوط کرتے اور دشمنوں کی سازشوں اور حملوں کے مقابلے میں اسے ناقابلِ شکست بناتے؛ لہٰذا ہجرت ایمان لانے کی حتمی و ضروری شرط تھی۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ وہ لوگ جو ایمان لائے، ﴿وَهَاجَرُوا﴾ اور مدینہ کی طرف ہجرت کی، ﴿وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ﴾ اور اپنے مال اور جان دونوں کے ساتھ راہِ خدا میں جہاد کیا، اور اسی طرح دوسری طرف ﴿وَالَّذِينَ آوَوْا﴾ وہ لوگ جنہوں نے بےگھر اور بےسرپرست مہاجرین کو مدینہ میں پناہ دی، ﴿وَنَصَرُوا﴾ اور ان کی مدد کی، ﴿أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ ان میں سے بعض دوسرے بعض کے اولیا ہیں اور ایک ہی محاذ کے سپاہی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اور پیوستہ ہیں۔ یہ

---

۱. سورہ مبارکہ انفال: آیات ۷۲ سے ۷۴

وہی مومن ہیں جو اینٹوں کی طرح ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ آپ ایک عمارت کو دیکھیں، ایک بلڈنگ کو دیکھیں، اینٹیں ایک دوسرے کے اندر گئی ہوتی ہیں، لکڑیاں ایک دوسرے کے اندر گئی ہوتی ہیں، ایک عمارت کے تمام اجزا ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اور متصل ہوتے ہیں، اسلامی معاشرے میں مومنین اسی طرح ہیں؛ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، متصل اور گرہ خوردہ ہیں، ایک دوسرے کے اولیا ہونے سے مراد یہ ہے، ولایت یعنی مکمل طور پر ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا، متصل ہونا، یہ ولایت ہے۔

﴿أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ وہ بعض دوسرے بعض کے اولیا ہیں، ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ (یہاں غور سے سنیں) لیکن وہ لوگ جو ایمان تو لائے، اپنے دل میں تیرے نبی ہونے کا یقین تو رکھا لیکن ﴿وَلَمْ يُهَاجِرُوا﴾ ہجرت نہ کی، ایمان کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہ اٹھایا ﴿مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا﴾ تمہارا ان کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی اتصال اور ارتباط نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں۔ جب تک انہوں نے ہجرت نہیں کی اور وہیں مکہ میں ہیں، آپ سے بیگانہ اور اجنبی ہیں، آپ کے درمیان کسی قسم کا رابطہ، تعلق اور اسلامی اخوت و بھائی چارہ نہیں ہے۔

البتہ اس کے ساتھ ایک اور حکم بھی ہے؛ وہی مومنین جو وہاں پر ہیں اگر ان کی کسی اور گروہ کے ساتھ جنگ ہو جائے اور وہ تم سے مدد مانگیں تو تمہیں ان کی مدد کرنی چاہیے؛ اس لیے کہ وہ تمہارے ہم فکر ہیں اور جنگ کی حالت میں ہیں۔ اگر ایک مسلمان ایک کافر جماعت کے ساتھ جنگ میں مصروف ہو تو تم پر واجب ہے کہ اگرچہ وہ مسلمان تمہارے ساتھ نہیں ہے، تمہارے وطن میں نہیں ہے، اس نے تمہارے ساتھ ہجرت نہیں کی ہے، تم پر واجب ہے کہ جاؤ اور اس کی مدد کرو۔ مگر ایک صورت میں، اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص کہ جس کے ساتھ مسلمان لڑ رہا ہے، اس نے تمہارے ساتھ صلح کا معاہدہ کر رکھا ہو، اس صورت میں اس مسلمان کی مدد کرنا بھی واجب نہیں ہے۔ یہاں یہ آیت ہمیں کیا سمجھا رہی ہے؟

ایک بات تو یہ سمجھا رہی ہے کہ مسلمان دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، اس کی مدد کرنا واجب ہے اگرچہ اس نے ہجرت بھی نہ کی ہو۔ اور دوسری چیز یہ سمجھا رہی ہے کہ وہ مسلمان جس نے اسلامی معاشرے کی طرف ہجرت نہیں کی ہے، اسلامی معاشرے میں نہیں آیا ہے، دارالکفر میں رہ گیا ہے،

اس مسلمان کی اگر ایک کافر شخص یا کافر جماعت کے ساتھ جنگ ہو جائے، لڑائی ہو جائے اور تمہارا اس کافر کے ساتھ صلح کا معاہدہ ہو تو تمہیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جاؤ اور اس مسلمان کی مدد کرو، کیوں؟ اس لیے کہ اس نے ہجرت نہیں کی، چونکہ تمہارا بھائی نہیں ہے، اس نے تمہاری طرف ہجرت نہیں کی۔ ﴿وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ﴾ مگر اس قوم کے خلاف کہ ﴿بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ﴾ تمہارے اور اس قوم کے درمیان میثاق اور معاہدہ ہو، ﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو، خدا اس سے آگاہ ہے اور اسے دیکھ رہا ہے۔

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ اور جو کافر ہیں ان میں سے بعض بعض دوسروں کے اولیا ہیں، آپس میں ملے ہوئے ہیں، ایک ہی محاذ پر کھڑے ہیں۔ یہ نہ دیکھیں کہ دو الگ الگ کیمپوں میں ہیں، تمہارے ساتھ دشمنی میں دونوں ایک ہی کیمپ میں اور ایک ہی محاذ پر ہیں۔ ﴿إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ﴾ اگر اسے انجام نہ دو تو زمین پر فتنہ اور بہت بڑا فساد بر پا ہو گا۔ شاید مراد یہ ہو کہ اگر اس صف بندی اور محاذ آرائی کی رعایت نہیں کرو گے، اگر یہ نہیں سمجھو گے کہ دشمنانِ خدا کی صف کے مقابلے میں تمہاری صف ایک مشخص و معیّن، علیحدہ اور مستقل صف ہے اور اگر یہ نہیں جانو گے کہ جو بھی ان دو صفوں کے درمیان میں ہے، وہ دشمنوں اور مخالفوں کی صف میں ہے نہ کہ تمہاری صف میں؛ اگر یہ نہیں جانو گے اور اس کے تقاضوں کے مطابق عمل نہیں کرو گے تو زمین پر فتنہ بر پا ہو گا، فساد برپا ہو گا۔ احتمالاً فتنہ سے مراد دین سے دوری کا فتنہ ہے اور فساد سے مراد معاشرے میں حکم خدا کے نہ ہونے کا فساد ہے۔

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ وہ لوگ جو ایمان لائے، ﴿وَهَاجَرُوا﴾ اور ہجرت کی (اس آیت پر بھی غور فرمائیں اس لیے کہ جو باتیں عرض کی ہیں، ان پر بہترین شاہد ہے) ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ وہ لوگ جو ایمان لائے، ﴿وَهَاجَرُوا﴾ اور ہجرت کی، ﴿وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ اور راہ خدا میں جہاد کیا، ﴿وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی، ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ یہی حقیقی مومن ہیں۔ سمجھ میں آگیا آپ کو اچھی طرح سے؟ سچے اور حقیقی مومن یہ ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں لیکن نہ ہجرت کی ہے نہ جہاد، نہ پناہ دی ہے نہ امداد کی ہے، وہ کیا ہیں؟ ﴿هُمُ الْمُؤْمِنُونَ﴾ غیر حق۔ وہ غیر حقیقی مومن ہیں، یہ آیت کا معنی و مفہوم ہے۔

ولایت

ولایت کا بنیادی مفہوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَن تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ إِن كُنتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنتُمْ وَمَن يَفْعَلْهُ مِنكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ﴾ (سورہ ممتحنہ/۱)

ولایت نبوت کا تسلسل ہے، نبوت سے جدا کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ درحقیقت نبوت کا تتمہ، ضمیمہ اور اختتامیہ ہے۔ اگر ولایت نہ ہو تو نبوت بھی ناقص رہ جائے گی۔ لہٰذا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہم نبوت کے بارے میں گزشتہ گفتگو کو مختصر طور پر دہرائیں۔ اس کے کلیات کو بیان کریں، تاکہ ضمنی گفتگو کرتے ہوئے بتدریج ولایت کے موضوع میں داخل ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کا مقصد کیا تھا؟

پیغمبرؐ انسانوں کو کمال تک پہنچانے کے لیے آئے ہیں، لوگوں کو اخلاقِ الٰہی سے مزین کرنے کے لیے آئے ہیں، مکارمِ اخلاق کو کامل کرنے اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ احادیث کے مضمون کے مطابق ہے: «بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ»[۱] پیغمبر انسان سازی کے لیے آئے ہیں، انسان نامی اس خمیر کو سنوارنے اور اسے آراستہ و پیراستہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ چاہیے کہ پیغمبرؐ انسان سازی کے لیے کون سے راستے اختیار کرتے ہیں؟ کن ذرائع سے استفادہ کرتے ہیں؟ اور کس طریقے سے انسان سازی کرتے ہیں؟

---

۱. بحارالانوار، کتاب الایمان والکفر، ابواب مکارم الاخلاق، باب حسن الخلق، حدیث ۱

کیا کوئی مدرسہ قائم کرتے ہیں؟ کیا کوئی فلسفی مکتب بناتے ہیں؟ صومعہ اور عبادت خانہ تعمیر کرتے ہیں؟ ہم نے عرض کیا کہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ پیغمبر انسان بنانے کے لیے انسان سازی کا کارخانہ قائم کرتے ہیں۔ پیغمبر اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ چاہے انہیں دس سال، بیس سال تاخیر سے کامیابی نصیب ہو، لیکن جو چیز وہ تیار کریں وہ ایک انسان، دو انسان، بیس انسان نہ ہوں، بلکہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ انسان سازی کا ایسا کارخانہ قائم کریں جو خودکار (automatic) انداز میں پیغمبر کی پسند کے انسانِ کامل تیار کرے۔

پس پیغمبر انسان بنانے کے لیے، انسان سازی کے کارخانے سے کام لیتے ہیں اور یہ کارخانہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام ہے۔ یہ وہ بنیادی نقطہ ہے جو ہماری گفتگو میں توجہ کا مرکز رہے گا۔

سب یہی کہتے کہ پیغمبر انسان بنانا چاہتے ہیں، تمام لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ پیغمبر تعلیم و تربیت کے لیے آئے ہیں اور سب یہ بات سمجھتے ہیں، لیکن جس بات کو توجہ کے ساتھ سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ پیغمبر ایک ایک انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے تنہائی میں لے جا کر اسکے کان میں خدا کی محبت کے نغمے نہیں گنگناتے تھے۔ انبیانے ایسے علمی اور فلسفی مدارس بھی قائم نہیں کئے تھے کہ جن میں چند شاگردوں کی تربیت کی ہو اور پھر انہیں لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے گوشہ و کنارِ عالَم میں روانہ کیا ہو۔ پیغمبر کا کام ان امور سے زیادہ محکم، مضبوط اور گہرا ہے، وہ ایک ایسا کارخانہ قائم کرتے ہیں، جو صرف انسان پیدا کرتا ہے، اور وہ کارخانہ «اسلامی معاشرہ» ہے۔

اسلامی معاشرہ، یعنی وہ معاشرہ اور سماج جس کی حکمرانی کا سب سے بلند مقام خدا کے پاس ہو، اس معاشرے کے قوانین، الٰہی قوانین ہوں، اس معاشرے میں حدودِ الٰہی جاری ہوں، اس معاشرے میں عہدہ اور منصب، الٰہی تعلیمات کی روشنی میں سپرد کیا جاتا ہو اور انہی تعلیمات اور اصولوں کی روشنی میں عہدے اور منصب سے معزول کیا جاتا ہو۔

جس طرح بعض معاشرہ شناس افراد میں معمول اور رائج ہے، اسی طرح اگر ہم معاشرے کی تصویر کشی ایک مثلث (triangle) کی صورت میں کریں، تو اسلامی معاشرے کے مثلث کی چوٹی (top) پر خدا ہے، اور تمام انسان اس کے نیچے ہیں۔ اس معاشرے کے ادارے دینی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں، صلح اور جنگ کے قانون احکامِ الٰہی کی بنیاد پر بنائے جاتے ہیں، اجتماعی روابط، اقتصاد، حقوق، تمام چیزوں کا تعین

خدا کا دین کرتا ہے، ان کا نفاذ دینِ الٰہی کی روشنی میں ہوتا ہے، اور ان تمام قوانین کی پشت پر خدا کا دین ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں اسلامی معاشرہ۔

کیا اس کی کوئی مثال ہے؟ ہاں، اس کی مثال مدینہ ہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں تشریف آوری کے بعد وہاں ایک معاشرہ تشکیل دیا۔ ہاں، وہ لوگ مکہ سے نکل کر دوسرے شہروں میں بھی جا سکتے تھے تاکہ خدا کی عبادت کریں؛ لیکن یہ کافی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ مدینہ تشریف لائے، وہاں پر ایک معاشرہ تشکیل دیا، اس معاشرے پر خدا کی حکمرانی تھی اور عملاً حکومت کا کنٹرول خدا کے نمائندے رسول اللہؐ کے ہاتھوں میں تھا۔ آپ ہی قوانین و احکام وضع کرتے اور ان کو نافذ کیا کرتے تھے۔ معاشرے کی ہدایت و رہبری اور اس کا نظم و نسق آنحضرتؐ کے ذمے تھا۔

ایک ایسے معاشرے میں جس کا سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے، نماز جماعت، نماز جماعت کے بعد کا خطبہ اور میدان جنگ میں پڑھے جانے والے ترانے، سب یکرنگ ہوتے ہیں۔ اسی مسجد میں جہاں رسول اللہؐ نماز جماعت قائم کیا کرتے تھے، لوگوں سے خطاب کے لیے منبر پر جایا کرتے تھے، درس دیتے اور تزکیہ و تعلیم کا کام انجام دیا کرتے تھے، وہیں جہاد کا پرچم لایا جاتا تھا، پیغمبرؐ اسے باندھتے اور اسامہ بن زید[1] یا کسی دوسرے مومن سپہ سالار کے سپرد کرتے اور فرماتے تھے کہ: «اِنْطَلِقُوْا عَلَى اسْمِ اللهِ»[2]، اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو، فلاں جگہ پر دشمن کو گھیر لو، فلاں کام انجام دو۔ اسی مسجد میں رسول اللہؐ حد جاری فرماتے تھے، اسی مسجد میں پیغمبرؐ کی عدالت سجتی تھی، اسی مسجد سے پیغمبرؐ معاشرے کا نظم و نسق اور اقتصاد چلاتے، اسی مسجد میں زکات جمع ہوتی اور یہیں سے تقسیم کی جاتی، اسی میں درس ہوتا، نماز ہوتی، دعا ہوتی اور جنگی ترانے ہوتے، اور اقتصادی مسائل حل ہوتے۔ مختصر یہ کہ خانۂ خدا میں دنیا اور آخرت کے تمام امور ایک ساتھ پیغمبر کی رہنمائی میں انجام پاتے۔ یہ ہے اسلامی معاشرہ۔

---

۱. اسامہ بن زید بن حارثہ، رسول خداؐ کے آزاد شدہ غلام تھے۔ رسول خداؐ جب اپنے آخری حج (حجۃ الوداع) سے واپس تشریف لائے تو انہیں رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے جوانی میں سپہ سالار بنایا۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے زمانے میں ابتدا میں انہوں نے حضرت کی بیعت کی لیکن امیرالمومنین علیہ السلام کے ساتھ جنگوں میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ یہ اپنی عمر کے آخری حصے میں اس پر شرمندہ و نادم تھے، اسی وجہ سے حضرت امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:ان کے بارے میں اچھائی کے علاوہ کچھ نہ کہا جائے۔

۲. سنن ابی داؤد، کتاب الجھاد، باب فی دعاء المشرکین، حدیث ۲۶۱۴

انبیاؑ ایسے ہی معاشرے کے قیام کے لیے آتے ہیں، اس معاشرے میں رہنے والا ہر فرد انسان بن جاتا ہے۔ اگر انسانِ کامل نہ بھی بن سکے (تب بھی) مجبور ہوتا ہے کہ انسانوں کی طرح طرزِ عمل اختیار کرے۔ جو کوئی اچھا بننا چاہے، وہ پیغمبرؐ کے قائم کردہ معاشرے میں اچھا بن سکتا ہے، جبکہ غیر الٰہی معاشروں میں ایسا ممکن نہیں ہے۔

غیر اسلامی اور غیر الٰہی معاشروں میں انسان اچھا بننا چاہتے ہیں، لیکن نہیں بن سکتے۔ دیندار بننا چاہتے ہیں، لیکن نہیں بن سکتے۔ چاہتے ہیں کہ نہ سود دیں اور نہ سود لیں، لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

ایسے معاشرے میں عورت چاہتی ہے کہ اسلام اس سے جس پاکدامنی کا تقاضا کرتا ہے، وہ اس کی حفاظت کرے، لیکن ماحول اسے ایسا نہیں کرنے دیتا۔ اس معاشرے میں پائے جانے والے عوامل اور اسباب انسان کو خدا کی یاد سے دور کرتے ہیں۔ تصاویر، دکھاوا، آزادانہ میل جول اور گفتگو، یہ سب باتیں انسان کو خدا سے دور کرتی ہیں اور انسان کے دل کو ذکر خدا سے غافل کرتی ہیں۔

اسلامی معاشرے میں معاملہ اسکے برعکس ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں بازار، مسجد، حکومتی ادارے، دوست، رشتے دار، گھرانے کا سربراہ،، گھر کا جوان، سب کے سب انسان کو خدا کی یاد دلاتے ہیں، خدا کی طرف کھینچتے ہیں، خدا کا دوست بناتے، خدا کے ساتھ اس کا ربط و تعلق ایجاد کرتے ہیں، اسے خدا کا بندہ بناتے اور غیر خدا کی بندگی سے دور کرتے ہیں۔

انبیاؑ ایسا ہی معاشرہ قائم کرنے کےلیے آتے ہیں۔ جب یہ معاشرہ بن جاتا ہے، تو جس طرح کارخانے سے بڑی مقدار میں پیداوار نکلتی ہے، اسی طرح انسان سازی کے اس کارخانے سے لوگ ایک ایک، دو دو نہیں، دس دس، بیس بیس نہیں،بلکہ گروہ در گروہ مسلمان بن کر نکلتے ہیں۔ وہ ظاہری مسلمان بھی ہوتے اور قلبی بھی، واقعی، باطنی مسلمان اور مومن بھی۔ پس پیغمبرؐ اس کام کے لیے آتے ہیں۔

پیغمبر جب اس لیے آتے ہیں کہ اپنا پسندیدہ معاشرہ تعمیر کریں، ایسا معاشرہ جو انسان سازی کا کارخانہ ہو تو اس کام کے لیے ایک ایسے متحد اور یکسو گروہ کی ضرورت ہے جو دل کی گہرائیوں سے اس مکتب پر ایمان اور عقیدہ رکھتا ہو اور ثابت قدمی اور جوش و خروش کے ساتھ اس مقصد کی جانب گامزن ہو۔

پیغمبر، ابتدائے کار ہی میں ایسے گروہ کی موجودگی ضروری سمجھتے ہیں۔ لہٰذا پیغمبر کا پہلا کام ایسے متحد اور باہم متفق گروہ کی فراہمی اور تیاری ہے، پیغمبر ایسا گروہ تیار کرنے کے در پے ہوتے ہیں۔ وہ آیاتِ قرآنی پر عمل کرتے ہوئے مواعظِ حسنہ کرتے ہیں: ﴿ ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾۔[1] آیات قرآنی اور اپنے کلام کی تاثیر کے ذریعے لوگوں کے دل خدا کے دین کی جانب جذب کرتے اور پہلے مرحلے میں اُنہیں اپنے گرد جمع کرتے ہیں۔ پیغمبر کے گرد جمع ہو جانے والے ان لوگوں کے ذریعے ایک گروہ وجود میں آتا ہے۔ پس سب سے پہلے پیغمبر اپنی دعوت پیش کر کے ایک گروہ اور ایک صف وجود میں لاتے ہیں، کفر کے محاذ کے بالمقابل ایک محاذ قائم کرتے ہیں۔

یہ محاذ کن لوگوں سے مل کر بنتا ہے؟

یہ محاذ صاحبِ ایمان، صاحبِ عقیدہ، مضبوط دل اور ثابت قدم مسلمانوں کے ملنے سے بنتا ہے، ان لوگوں کے اکٹھا ہونے سے تشکیل پاتا ہے جنہیں «لا تَأْخُذُهُمْ فِي اللهِ لَوْمَةُ لَائِمٍ»[2] کسی ملامت کرنے والے کی ملامت راہ خدا سے نہیں ہٹا سکتی۔

پیغمبر معاشرے میں ایک محاذ تشکیل دیتے ہیں۔ یہ درجہ اول کے مسلمان ہیں۔ یہ کس معاشرے میں زندگی بسر کرتے ہیں؟ مکہ کے جاہل معاشرے میں زندگی گزارتے ہیں۔ مثلاً یہ مکہ کے جاہل معاشرے میں رہنے والے صدرِ اسلام کے مسلمان ہیں۔ اب اگر اسلام اور مسلمین کے نام سے وجود میں آنے والے اس کمزور اور نازک محاذ کو اس جاہل اور مزاحمتوں اور مشکلات سے بھرے معاشرے میں باقی رکھنا چاہیں، اگر یہ چاہیں کہ یہ گروہ، یہ صف اور یہ محاذ ختم نہ ہو جائے، تحلیل نہ ہو جائے تو لازم ہے کہ مسلمانوں کا یہ گروہ سیسہ پلائی دیوار کی مانند ایک دوسرے کے ساتھ مربوط رہے، ان مسلمانوں کو اس طرح ایک دوسرے سے متصل اور منسلک کریں کہ کوئی چیز انہیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے۔ آج کی زبان میں اور آج کی ادبیات میں، ایک انتہائی شدید جماعتی نظم (party discipline) ان مسلمانوں کے درمیان قائم کیا جائے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھا جائے اور دوسرے محاذوں، دوسری تحریکوں اور مخالف عوامل سے انہیں زیادہ سے زیادہ دور رکھا جائے۔

---

۱. سورہ مبارکہ نحل: آیت ۱۲۵۔ لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیں۔

۲. نہج البلاغہ: خطبہ ۱۹۲

کیوں؟ اس لیے کہ یہ اقلیت میں ہیں۔

ایک ایسا گروہ جو اقلیت میں ہے، ممکن ہے اسکی فکر اکثریت کی فکر سے متاثر ہو جائے، ان کا عمل، ان کی حیثیت، ان کی شخصیت، ممکن ہے ان کی مخالف بقیہ اکثریت کی حیثیت و شخصیت اور اعمال میں گم یا نابود اور تحلیل ہو کر ختم ہو جائے۔

لہٰذا انہیں تحلیل ہونے سے بچانے کے لیے، انہیں نابودی سے محفوظ رکھنے کے لیے، انہیں ایک گروہ کی صورت میں باقی رکھنے کے لیےزیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ متصل کیا جاتا ہے،نیز انہیں ہر ممکن طریقے سے دوسرے محاذوں، دوسری صفوں سے جدا کیا جاتا ہے، تاکہ مستقبل میں ان کے مضبوط ہاتھوں سے اسلامی معاشرے کی تعمیر ہو، یہ اس کا نظم و نسق سنبھالیں اور اسے آگے بڑھائیں، پیغمبر کے مددگار بنیں، تاکہ یہ باقی رہ سکیں، انہیں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مربوط کریں اور جس قدر ہو سکے دوسرے تمام محاذوں سے جدا کریں۔ ان کی مثال کوہ پیما کےاس گروہ کی ہے جو ایک دشوار گزار پہاڑی راستہ عبور کر رہا ہوتا ہے، دس افراد لاٹھیاں (sticks) ہاتھ میں لیے برف کے درمیان ایک تنگ اور پُرخطر راستہ طے کر رہے ہوتے ہیں اور پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے پیچ و خم کھاتی وادیوں سے گزرتے ہیں۔ ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ایک دوسرے سے متصل ہو جائیں، اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ لیں، علیحدہ علیحدہ اور انفرادی طور پر آگے نہ بڑھیں۔کیونکہ اگر وہ اکیلے رہ جائیں گے، تو ان کے لڑکھڑانے کا خطرہ ہے، انہیں مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے سے منسلک کر دیتے ہیں، اور ایک دوسرے سے باندھنےکے ساتھ ساتھ ان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ بہت زیادہ وزن نہ لیں، اِدھر اُدھر نہ دیکھیں، بلکہ صرف اپنے راستے پر نظر رکھیں اور حواس فقط اپنے کام کی طرف متوجہ رکھیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کی کمر اور ہاتھوں کو مضبوطی سے ایک ساتھ باندھ لیتے ہیں، تاکہ اگر ان میں سے کوئی گرنے لگےتو بقیہ لوگ اسے بچا سکیں۔

کوہ پیماؤں کا اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ مربوط ہونا صدرِ اسلام کے مسلمانوں کے ایک دوسرے کے ساتھ شدید متصل اور مربوط ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔

کیا قرآن و حدیث نے اس اتصال اور ارتباط کو کوئی نام دیا ہے؟

اسلام کے ابتدائی دور سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کا یہ رابطہ، جو انہیں آپس میں اس طرح جوڑتا

ہے جسے توڑنا ممکن نہیں، جو معاشرے میں موجود دوسری صفوں سے یکسر جدا ہوتے ہیں، مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اور ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں، کیا قرآن اور حدیث میں انہیں کوئی نام دیا گیا ہے؟

جی ہاں، اس باہمی ارتباط اور اتصال کا نام ولایت ہے۔ پس قرآن کی پہلی اصطلاح میں، ولایت یعنی باہم رابطہ و تعلق اور ایک صف کی صورت میں یک جہت ہونا، ایک فکر رکھنے والے، ایک مقصد کی جستجو میں سرگرداں اور ایک ہی راہ پر گامزن لوگوں کے ایک گروہ کا مضبوطی کے ساتھ آپس میں متصل ہونا۔ یہ لوگ ایک ہی منزل کی جانب گامزن ہوتے ہیں اور ایک ہی فکر اور ایک ہی عقیدے کو ماننے والے ہوتے ہیں۔

اس صف سے تعلق رکھنے والے افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ متصل ہونا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ دوسری صف بندیوں، دوسرے مراکز اور دوسرے عناصر سے اپنے آپ کو جدا اور علیحدہ رکھیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کا خاتمہ نہ ہو جائے، وہ دوسروں میں تحلیل اور گم نہ ہو جائیں۔اس چیز کو قرآن کریم میں ولایت کہا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ مسلمانوں کے اولین گروہ کو اس طرح پیوستہ اور متصل کرتے ہیں، انہیں ایک دوسرے سے جوڑتے ہیں، انہیں ایک دوسرے کا بھائی بناتے ہیں، انہیں ایک پیکر کی صورت میں ڈھالتے ہیں، ان کے ذریعے امتِ اسلامی تشکیل دیتے ہیں اور اسلامی معاشرہ وجود میں لاتے ہیں۔ ان شاء اللہ آپ آگے چل کر آیاتِ قرآنی میں دیکھیں گے کہ پیغمبرؐ صدرِ اسلام کے مسلمانوں کے اس اتحاد اور یکجہتی کے ذریعے دشمنوں، معاندوں اور مخالفوں کا راستہ روکتے ہیں، اپنے تیار کردہ اس گروہ کو معاشرے میں موجود دوسرے گروہوں سے جدا کرتے ہیں۔ انہیں یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین کے گروہ کے ساتھ مل جانے سے روکتے ہیں۔ اور ان کی صفوں کو باہم منسلک اور متصل رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر یہ مسلمان اس حالت میں نہ ہوں، اگر ان کے درمیان ولایت نہ پائی جائے، اگر یہ سو فیصد ایک دوسرے سے مربوط نہ ہوں اور ان کے درمیان اختلاف وجود میں آجائے تو یہ اپنے کاندھوں پر پڑنے والی امانت کے اس بوجھ کو اٹھانے سے قاصر رہیں گے اور اس بارِ گراں کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکیں گے۔

البتہ بعد میں جب اسلامی معاشرہ ایک عظیم امت میں تبدیل ہو جاتا ہے، تب بھی ولایت کی ضرورت رہتی ہے۔

اب یہ کہ ایک امت کے لیے کس طرح کی ولایت ضروری ہے اور یہ کس لیے لازمی ہے، اسکی وضاحت ہم بعد میں کریں گے۔ لیکن اگر ہم یہیں ٹھہر کر کچھ غور کریں تو وہ ولایت جس کا ذکر شیعہ کرتے ہیں، اس کا کچھ مفہوم ہم پر واضح ہو جائے گا۔

ہم نے کہا کہ ظلمت سے بھری ایک دنیا میں، ایک جاہل سماج میں ایک چھوٹے سے گروہ کو اپنی بقا کے لیے باہم مربوط اور متصل رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ گروہ باہم مربوط اور جڑا ہوا نہ ہو تو اس کا باقی رہنا اور اپنی زندگی کو جاری رکھنا محال ہے۔ ہم نے مثال کے طور پر مکہ کے جاہل معاشرے میں اسلام کے ابتدائی دور کے مسلمانوں کے گروہ یا پہلے پہل مدینہ میں آنے والے مسلمانوں کے گروہ کا ذکر کیا۔ اسکی دوسری مثال تاریخ کے آغاز میں شیعہ مخالف اور اسلام مخالف خلافتوں کے زمانے میں شیعوں کا چھوٹا سا گروہ ہے۔ کیا شیعہ آسانی کے ساتھ باقی رہ سکتے تھے؟ کیا پروپیگنڈے کے حربے، پابندیاں، قید خانے، اذیتیں اور قتل و غارت اس بات کی اجازت دیتے تھے کہ یہ گروہ باقی رہ سکے؟

اور وہ بھی شیعوں کی مانند ایک فکری گروہ، جو اپنے زمانے کی حکومتوں کا سخت مخالف اور ان کے لیے دردِ سر تھا۔ لیکن اسکے باوجود یہ گروہ کیسے باقی رہ گیا؟

اس لیے باقی رہ گیا کہ ولایت نے شیعوں کے درمیان ایک حیرت انگیز پیوستگی اور شیرازہ بندی پیدا کردی تھی، تاکہ اس ولایت کے زیر سایہ شیعی تحریک، وہاں پائی جانے والی دوسری طرح طرح کی تحریکوں کے درمیان محفوظ رہ سکے۔

آپ اموی اور عباسی دور کے عالَم اسلام کو اس دریا سے تشبیہ دیں جس میں طرح طرح کی فکری، سیاسی اور عملی تحریکیں ایک دوسرے کے دوش بدوش چل رہی تھیں۔ آپ اول سے آخر تک نگاہ ڈال لیجیے، آپ تشیع کی تحریک کو دیکھیں گے کہ وہ اس عجیب طوفان کے درمیان پانی کی ایک باریک لکیر کی مانند ایک ناچیز اور معمولی شے نظر آئے گی، لیکن اس نے اپنے آپ کو اس طرح سے محفوظ رکھا ہوا ہے کہ کسی صورت آلودہ نہیں ہوئی، کسی صورت اس کا ذائقہ خراب نہیں ہوا، ہرگز وہ اپنی شفافیت سے محروم نہیں ہوئی، ہرگز اس نے دوسرے پانیوں کے رنگ، بو اور ذائقے کو اختیار نہیں کیا ہے، وہ باقی

رہی اور مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔

لیکن وہ کیا چیز ہے جس نے اسکی حفاظت کی؟ وہ کیا شے ہے جو اس شیعی تحریک کی بقا کا سبب بنی؟ وہ اس ولی کاوجود ہے جو لوگوں اور اپنے پیروکاروں کو ولایت کی تلقین کرتا ہے، انہیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتا ہے، انہیں ایک دوسرے کے لیے مہربان کرتا ہے، ان کے درمیان ولایت کی ترویج کرتا ہے۔ یہ (ولایت) وہی پیغمبر خداؐ کے زمانے کی ولایت کے معنی میں ہے۔

شیعی ولایت کا ایک پہلو یہ ہے کہ جس پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اسکے اور بھی پہلو ہیں، ہم ان کا بھی جائزہ لیں گے۔

ہماری آج کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ولایت اور خدا اور راہِ خدا کے لیے کوشاں گروہ کی ولایت کے معنی یہ ہیں کہ اس گروہ میں موجود افراد کے درمیان زیادہ سے زیادہ قربت اور اتصال وجود میں آئے، ان کے دل زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے مربوط اور نزدیک ہوں اور یہ لوگ اپنے مخالف مراکز سے، ایسے لوگوں سے جن کی سوچ ان کے خلاف ہواور جو ان کے برخلاف عمل کرتے ہوں، حتی الامکان دور ہوں۔ یہ ہیں ولایت کے معنی۔

سورہ ممتحنہ میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے۔ لہٰذا ہمارے خیال میں اس موضوع کی مناسبت سے اس سورے کا نام سورہ ولایت رکھا جا سکتا ہے۔ہم یہاں پر سورہ ممتحنہ کی کچھ آیات کے معانی ذکر کرتے ہیں۔

﴿ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ ﴾[1]۔

اے ایمان والو!میرے دشمن اور اپنے دشمن کو ولی نہ بناؤ۔

وہ کافر جو میرے اور آپ کے دشمن ہیں، انہیں ولی نہیں بنانا چاہیے۔ یہ تعبیر اس معنی کے ساتھ سازگار ہے جو میرے ذہن میں ہے۔

بعض ترجموں میں آیا ہے کہ میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ یہ اس کے مکمل معنی نہیں ہیں۔ فقط دوستی اور محبت کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ مسئلہ اس سے بالاتر ہے۔

اپنا ولی نہ بناؤ، یعنی انہیں اور خود کو ایک مورچے میں نہ سمجھو، اپنے آپ کو ان کی صف میں کھڑا

---

۱. سورہ مبارکہ ممتحنہ: آیت ۱

نہ کرو، یعنی اپنے آپ کو اور انہیں ایک ہی صف میں تصور نہ کرو۔ ایک ایسا شخص جو خدا کا اور تمہارا دشمن ہے، اسے اپنے پہلو میں جگہ نہ دو، بلکہ اسے اپنا مدِمقابل اور اپنا دشمن اور حریف سمجھو۔

﴿تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ انہیں اپنا ہم محاذ اور اپنی صفوں میں شامل نہ سمجھو کہ انہیں دوستی کے پیغام بھیجنے لگو۔

﴿وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ﴾ جبکہ تم اس بات سے واقف ہو کہ انہوں نے اس حقیقت سے انکار کیا ہے جسے پروردگار نے تمہارے لیے نازل کیا ہے۔

﴿يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ﴾ یہ لوگ پیغمبر کو اور تمہیں تمہارے وطن سے باہر نکال رہے ہیں۔

﴿أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللهِ رَبِّكُمْ﴾ صرف اس جرم میں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

﴿إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي﴾ اگر تم میری راہ میں جہاد اور ہماری خوشنودی کے حصول کے لیے نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

اگر تم واقعاً سچ کہتے ہو اور میری راہ میں جہاد اور کوشش کرتے ہو تو تمہیں حق نہیں پہنچتا کہ میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنی صفوں میں جگہ دو اور انہیں اپنا مددگار، ساتھی اور ہم محاذ بناؤ۔

البتہ بعد کی آیات واضح کرتی ہیں کہ خدا کی مراد کون سے کفار ہیں اور ان آیات میں کفار کو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

﴿تُسِرُّونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ تم ان کے ساتھ خفیہ اور پوشیدہ طور پر محبت کرتے ہو۔

﴿وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ﴾ اور جو کچھ تم خفیہ اور اعلانیہ کرتے ہو میں اس سب سے باخبر ہوں۔

﴿وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ﴾ اور تم میں سے جو کوئی دشمنانِ خدا کی طرف دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھائے گا اور اپنے آپ کو ان کی صف میں سمجھے اور ظاہر کرے گا، وہ راہِ اعتدال سے بھٹک گیا ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو فکری اعتبار سے مطمئن کرنے کے لیے کہ کفار سے کیوں رابطہ ختم کرنا چاہیے، آیت ان کا تعارف کرواتے ہوئے جواب میں کہتی ہے: غلط فہمی کا شکار نہ رہو، ان کے دل تمہارے لیے نرم نہیں ہوں گے۔ جو لوگ فکری لحاظ سے تمہارے مخالف ہیں۔ وہ لوگ جن کے لیے تمہارا دین، تمہارا ایمان ضرر رساں ہے، انہوں نے تمہارے دین اور تمہارے ایمان کو نابود کرنے پر کمر باندھی ہوئی

ہے، وہ کسی صورت میں بھی تمہارے لیے مہربان اور تمہارے دوست نہیں ہوں گے۔ یہ آیت اس نکتے کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہے:

﴿إِنْ يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً﴾[1] یہ اگر تم پر قابو پا لیں، تو تمہارے دشمن ثابت ہوں گے۔

﴿وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوءِ﴾ اور اپنے ہاتھ اور زبان کو تمہارے خلاف استعمال کریں گے۔ وہ تمہیں اور زیادہ دبائیں گے، تمہاری تذلیل کریں گے، تمہیں بے حیثیت اور بےعزت کریں گے، تمہیں انسان نہیں سمجھیں گے۔

﴿وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ﴾ یہ چاہیں گے کہ تم بھی کافر ہو جاؤ۔

اگر کل یہ تم پر مسلط ہوگئے تو تمہیں ذرہ برابر قلبی ایمان رکھنے تک کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ؛ یہ نہ سمجھنا کہ یہ تمہیں مسلمان رہنے اور اسلامی فرائض پر عمل کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیں گے۔

بعد والی آیت ایک دو ٹوک جملے میں کہتی ہے کہ تم اپنے بچوں کے لیے، اپنے عزیز و اقارب کے لیے اور اپنے رشتے داروں کی آسائش کے لیے خدا کے دشمن کے ساتھ سازباز پر تیار ہو اور خدا کے ناچیز بندوں کی محبت حاصل کرنے کے لیے اور اپنے اور اپنے اقربا کے مفادات کے حصول کے لیے حکمِ خدا کو نظر انداز کر رہے ہو اور خدا کے دشمن سے دوستی کر رہے ہو۔

آخر یہ اعزہ اور اولاد، انسان کے کتنے کام آسکتے ہیں کہ انسان ان کی خاطر پروردگارِ عالَم کے عذاب اور اسکے غضب کو دعوت دے؟

﴿لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ﴾[2] تمہارے رشتے دار، اعزہ اور اولاد تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے،

﴿يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ﴾ روز قیامت تمہارے اور ان کے درمیان جدائی ڈال دے گا۔

یا اسے اس طرح پڑھیں اور اسکے یہ معنی کریں:

﴿لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ روز قیامت تمہارے رشتے دار اور اولاد تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔

---

۱. سورہ مبارکہ ممتحنہ: آیت ۲

۲. سورہ مبارکہ ممتحنہ: آیت ۳

وہ لوگ جو اپنی آل و اولاد کے آرام و آسائش کی خاطر دنیا اور آخرت کی کامیابی اور فلاح سے منہ موڑ لینے اور بدبختیاں، شقاوتیں اور عداوتیں مول لینے پر تیار ہیں، انہیں قرآن مجید کی اس منطق سے آگاہ ہونا چاہیے، شاید وہ ہوش میں آجائیں۔ یہ انسان کی اولاد، یہ عزیز جو تمہیں دوزخ کی طرف کھینچ رہا اور تم جو تیار نہیں ہو کہ تمہیں ذرہ برابر کوئی نقصان پہنچے، اس کے لیے بڑے بڑے نقصان اٹھانے پر تیار ہو؛ وہ کس قدر تمہارے ساتھ ہے؟ وہ کس قدر تمہارے لیے ہے؟ کس قدر تمہیں فائدہ پہنچاتا ہے؟ وہ کس قدر تیار ہے کہ روز قیامت تمہارا بھاری وزن اپنے کاندھوں پر اٹھائے؟

سورہ ممتحنہ میں بھی خداوند عالَم فرماتا ہے:

﴿لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ اے مومنین! یہ بات جان لو کہ روز قیامت تمہارے رشتے دار اور تمہاری اولاد تمہارے کسی کام نہ آئے گی، اور روز قیامت تمہارے درمیان مکمل جدائی ڈال دے گا اور تم جو کچھ کرتے ہو، خدا اس سے خوب باخبر ہے۔

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾[1] یہ آیت جو ہم نے ذکر کی ہے ان آیات کا بہترین حصہ ہے۔ مومنین سے خطاب ہے کہ یقیناً ابراہیم اور ان کے پیروکاروں میں آپ کے لیے اچھا نمونہ ہے۔ دیکھیں، ابراہیمؑ اور ان کی اطاعت کرنے والوں نے کیا کیا ہے؟ آپ بھی وہی کام کریں۔ انہوں نے اپنے زمانے کی قوم کو واضح الفاظ میں خطاب کیا، طاغوت اور جھوٹے خداؤں کے بندوں سے کہا: ہم تم اور تمہارے خداؤں سے بیزار و متنفر ہیں، ہم تمہیں نہیں مانتے، ہم تم لوگوں سے روگرداں ہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ عداوت، دشمنی اور نفرت برقرار ہے، آپ لوگوں کے ساتھ صلح کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے: ﴿حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللهِ وَحْدَهُ﴾ آؤ اور ہماری فکری منطق میں داخل ہو جاؤ۔ آیت صاف صاف کہتی ہے کہ اے مومنو! آپ بھی ابراہیم کی مانند عمل کریں۔

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ﴾ یقیناً ابراہیم میں تمہارے لیے اچھا نمونہ ہے، ﴿وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾ اور وہ لوگ جو اُن کے ہمراہ تھے، ﴿إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ﴾ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا، ﴿إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ﴾ ہم تم لوگوں سے بیزار ہیں، ﴿وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ﴾ اس سے بھی بیزار ہیں جس کی تم خدا کے علاوہ عبادت اور پرستش کرتے ہو، ﴿كَفَرْنَا بِكُمْ﴾ ہم تمہیں نہیں مانتے، ﴿وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ

---

۱. سورہ مبارکہ ممتحنہ: آیت ۴

﴿وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا﴾ ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ دشمنی اور بغض نمایاں و آشکار ہے، ﴿حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللهِ وَحْدَهُ﴾ یہاں تک کہ تم خدائے واحد پر ایمان لے آؤ۔

قرآن کہتا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[۱] آپ مومنین کے لیے ابراہیمؑ اور ان کے پیروکاروں میں اچھا نمونہ ہے، ﴿لِمَن كَانَ يَرْجُو اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ﴾ ان کے لیے جو اللہ اور روزِ آخرت پر امید رکھتے ہیں، ﴿وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ جو کوئی منحرف ہو گا اور اس کے حکم سے روگرداں ہو گا، خدا بے نیاز قابلِ حمد وثنا ہے۔

اگر تم نے دشمن کے ساتھ سازباز کی تو تمہاری انسانیت اور شرافت کا دامن داغ دار ہو جائے گا اور خدا کو کوئی بھی نقصان نہیں ہو گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ جملہ اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھیں، حضرت ابراہیم اور ان کے پیروکار اپنے زمانے کے کافروں اور منحرفوں سے کہتے ہیں: ﴿إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ﴾ ہم تم لوگوں سے متنفر ہیں۔

---

۱. سورہ مبارکہ ممتحنہ: آیت ۶

چوبیسویں نشست

امت اسلامیہ کے باہمی تعلقات

۲۵ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری — ۱۲-۱۰-۱۹۷۴

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۞ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَن تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ فَعَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنفُسِهِمْ نَادِمِينَ﴾ (سورہ مائدہ/۵۱-۵۲)

بحث ولایت کو جاری رکھتے ہوئے یہ عرض کرنا ضروری ہے اگر امت اسلامی اس قرآنی معنی میں ولایت کی حامل ہونا چاہے اور اپنے لیے اس کا بندو بست کرنا چاہے کہ جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں تو اس پر لازم ہے کہ وہ دو پہلوؤں کا خیال رکھے۔ ایک پہلو اسلامی معاشرے کے اندرونی روابط ہیں اور دوسرا پہلو اس کے بیرونی روابط۔ یعنی عالمِ اسلام اور اسلامی معاشرے کے دوسرے معاشروں اور دوسری اقوام سے روابط و تعلقات۔

اندرونی تعلقات اور روابط کے حوالے سے (عرض ہے کہ) امت اسلامیہ اس وقت قرآنی معنی کے اعتبار سے ولایت کی حامل ہوگی جب اس کی صفوں میں اتحاد ہو اور اس کے مختلف ارکان اور گروہوں کے درمیان مکمل اتحاد و اتفاق پایا جاتا ہو، پوری امت اسلامیہ میں کوئی تفرقہ اور اختلاف موجود نہ ہو اور اس کے اندر مختلف صف بندیاں نہ پائی جاتی ہوں۔

اگر امت اسلامیہ کے اندر دو دھڑے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہوں تو قرآنی حکم یہ ہے کہ بقیہ مسلمانوں کو ان دو دشمنوں اور باہم بر سر جنگ گروہوں کے درمیان حتی الامکان صلح و آشتی کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر وہ دیکھیں کہ ان دو لڑنے والے گروہوں میں سے ایک صلح و آشتی پر آمادہ ہے لیکن دوسرا اس پر تیار نہیں یا ان میں سے ایک کی بات ناحق ہے جب کہ دوسرا حق بجانب ہے اور جس گروہ کی بات ناحق ہے، وہ حق بات تسلیم کرنے پر تیار نہیں تو اس موقع پر تمام عالمِ اسلام کو چاہیے کہ وہ اس ظالم گروہ کے خلاف یکجا ہو جائے، ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے، اس ظالم کا پیچھا کرے اور اس سے جنگ کرے، یہاں تک کہ وہ گھٹنے ٹیک دے۔

خداوند عالَم کا ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾[1] اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جھگڑ پڑیں، تو تم ان کے درمیان صلح کراؤ۔

﴿فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي﴾ اگر ان دو گروہوں میں سے ایک گروہ نے دوسرے پر ظلم کیا ہو یعنی جارحیت اور ظلم روا رکھا ہو، بد معاشی کرنا چاہی ہو، زور زبردستی کرنا چاہتا ہو تو اس کے خلاف جنگ کرو۔

﴿حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ﴾ یہاں تک کہ وہ فرمان خدا کی طرف پلٹنے پر مجبور ہو جائے۔

خداوندِ عالَم کا یہ حکم اسلامی معاشرے کے اندر اتحاد و اتفاق کو بچانے کے لیے ہے۔

بیرونی روابط کے حوالے سے (عرض ہے کہ) امتِ اسلامیہ کو غیر مسلم دنیا اور اپنی امت سے باہر کے لوگوں کے ساتھ اپنے روابط اور تعلقات کو اس طرح ترتیب دینا چاہیے کہ امت اسلامیہ ذرّہ برابر ان کے زیرِ کنٹرول اور ان کے افکار کے زیرِ اثر نہ ہو اور ان کی سیاست کی معمولی سی بھی تاثیر قبول کر کے اپنی خود مختاری سے دستبردار نہ ہو۔ مسلمانوں کا ایک قوم کی حیثیت سے ان کے ساتھ ایک کیمپ میں شامل ہونا اور ان سے مل جانا قطعاً ممنوع ہے۔

لہٰذا بیرونی روابط کے میدان میں غیر اسلامی گروہوں بالخصوص اسلام کے دشمنوں کی ذرّہ برابر تاثیر قبول کرنا بھی ممنوع ہے۔ اسلامی معاشرے اور امتِ اسلامیہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ غیر مسلم دنیا سے اس پر بالادستی کے سوا کسی اور صورت سے روابط برقرار کرے۔

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ جب ہم غیر مسلم حکومتوں اور غیر مسلم اقوام کے ساتھ تعلقات نہ رکھنے کی

---

۱. سورہ مبارکہ حجرات: آیت ۹

بات کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عالَم اسلام اور امت اسلامیہ سیاسی طور پر دنیا سے الگ تھلک ہو جائے۔ نہیں، یہ سیاسی گوشہ نشینی کا مسئلہ نہیں ہے۔ کہیں آپ یہ خیال نہ کریں کہ عالمِ اسلام کو نہ کسی سے تجارتی تعلقات رکھنے چاہئیں، نہ سیاسی روابط اور نہ سفارتی تعلقات، نہ اسے کہیں اپنے سفیر بھیجنے چاہئیں، نہ کسی کے سفیر قبول کرنے چاہئیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ اسے دوسروں کے ساتھ معمول کے تعلقات رکھنے چاہئیں لیکن ان کے ساتھ ولایت نہیں رکھنی چاہیے، ان کے ساتھ وابستہ نہیں ہونا چاہیے، ان کے ساتھ کوئی ایسا تعلق نہیں رکھنا چاہیے جس کی وجہ سے وہ جب چاہیں، عالمِ اسلام کو اپنے زیرِ اثر لے سکیں۔

پس قرآنی ولایت کے دو مظہر ہیں۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کے اندر تمام عناصر ایک مقصد، ایک سمت اور ایک راہ پر گامزن ہوں اور دوسرا یہ کہ امتِ اسلامیہ اسلامی معاشرے سے باہر تمام اسلام مخالف عناصر اور گروہوں سے اپنا رشتہ توڑ لے۔

اس مقام پر ایک انتہائی اہم نکتہ موجود ہے جو یہ ہے کہ لفظ ولایت کے قرآنی مفہوم کی رو سے ولایت کا مفہوم وہی ہے جس کے شیعہ قائل ہیں۔

یہاں قرآن کریم ہم سے کہتا ہے کہ اگر ایک معاشرہ اور ایک امت اس مفہوم میں قرآنی ولایت کی حامل ہونا چاہتی ہو، یعنی اگر چاہتی ہو کہ اس کی تمام اندرونی طاقتیں، ایک سمت، ایک مقصد کی جانب اور ایک راہ پر گامزن ہوں، اگر یہ چاہتی ہو کہ اس کی تمام داخلی قوتیں اس سے باہر اسلام مخالف طاقتوں کے خلاف صف آرا ہوں تو اسے اسلامی معاشرے میں طاقت کے ایک مرکزی نقطے کی ضرورت ہے، ایک ایسے محور کی ضرورت ہے جس سے اس کی تمام داخلی قوتیں مربوط ہوں، سب اسی سے ہدایت حاصل کرتی ہوں، سب اسی کی بات سنتی ہوں، اسی کی بات مانتی ہوں اور امت کی تمام مصلحتوں اور اس کے نقصان میں جانے والے تمام امور سے واقف ہو، تاکہ وہ ایک طاقتور، دوراندیش اور بابصیرت سپہ سالار کی طرح محاذِ جنگ پر ہر ایک کو اس کے مخصوص کام پر متعین کرے۔

ضروری ہے کہ اسلامی معاشرے میں ایک رہبر، ایک سپہ سالار اور ایک مرکزی قدرت موجود ہو جو یہ بات جانتی ہو کہ تم سے کیا بن پڑے گا، مجھ سے کیا ہو سکے گا، دوسرے انسان کیا کر سکیں گے تاکہ وہ ہر ایک کو اس کی قابلیت کے مطابق کام سپرد کرے۔

کوئی معاشرہ اگر یہ چاہے کہ اس کی تمام طاقتیں ایک نکتے پر مرکوز ہوں تو اس کا ایک دل اور مرکز ہونا چاہیے۔

البتہ اس مرکز اور اس قلب میں کچھ خصوصیات ہونی چاہئیں۔ اسے انتہائی دانا ہونا چاہیے، قوت فیصلہ کا مالک ہونا چاہیے، اسے ایک جدا اندازِ فکر کا حامل ہونا چاہیے، اسے راہِ خدا میں کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے، بوقت ضرورت اپنے آپ کو بھی قربان کرنے پر تیار ہونا چاہیے۔

ہم ایسی ہستی کو کیا نام دیتے ہیں؟ ہم اسے امام کہتے ہیں۔

امام، یعنی وہ حاکم اور رہنما جو پروردگارِ عالَم کی طرف سے اس معاشرے کے لیے معین کیا گیا ہو۔ جیسے خداوند متعال نے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں فرمایا: ﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾[1] یعنی میں نے آپ کو لوگوں کے لیے امام مقرر کیا ہے۔ امام یعنی ایک معاشرے میں رہبر،پیشوا اور حاکم ہونا۔

لیکن یہ جو ہم کہتے ہیں کہ امام کا تعین خدا کی طرف سے ہونا چاہیے، اس کی دو صورتیں ہیں: یا تو خدا امام کو نام اور نشان کے ساتھ معین کرتا ہے، جیسے امیر المومنین حضرت علیؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ اور بقیہ آئمہ کو معین کیا ہے یا پھر خدائے متعال، امام کو نام کے ساتھ معین نہیں کرتا بلکہ صرف نشانی کے ذریعے معین کرتا ہے، جیسے امام علیہ السلام نے فرمایا:

«فَأمّا مَن كانَ مِن الفُقَهاءِ صائنًا لنفسِهِ حافِظًا لِدينِهِ مُخالِفًا على هَواهُ مُطِيعًا لأمرِ مَولاهُ فلِلعَوامِّ أن يُقَلِّدُوهُ»[2]

اس روایت میں امامؑ نے بغیر نام لیے ایک رہبر و رہنما کی خصوصیات اور علامات کا تعین کیا ہے۔ جو کوئی ان علامات پر پورا اترتا ہو، وہ رہبر و رہنما ہو گا۔

ہم آپ کی خدمت میں لفظ «امام» کے معنی بیان کرنا چاہتے ہیں۔ امام، یعنی پیشوا، یعنی حاکم، یعنی حکمران، یعنی ایسی ہستی جو جس طرف جائے لوگ اس کے پیچھے پیچھے جائیں۔

پس ولایت کے قرآنی اصولوں کی رو سے، امام کا وجود لازمی ہے اور اگر یہ عظیم الشان پیکر، جس کا نام امتِ اسلامی ہے، زندہ، کامیاب و کامران اور ہمیشہ مضبوط و مستحکم رہنا چاہتا ہے، تو اس کا اس متحرک

---

۱. سورہ مبارکہ بقرہ: آیت ۱۲۴

۲. فقہاء میں سے جو کوئی اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو، اپنے دین کی حفاظت کرتا ہو، جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو کچلا ہوا ہو اور خدا کے احکام (خواہ وہ انفرادی احکام ہوں خواہ اجتماعی) کا مطیع ہو تو لوگوں کو چاہیے کہ اس کی تقلید (پیروی) کریں۔ (وسائل الشیعہ، کتاب القضاء، ابواب صفات القاضی، باب ۱۰، حدیث ۲۰)

اور پرجوش قلب اور ہمیشہ مستحکم اور قدرت مند مرکز سے رابطہ برقرار رکھنا ضروری ہے۔

ولایت یعنی کیا؟ سب غور و فکر کریں، ولایت کا دوسرا پہلو یعنی کیا؟ یعنی امت اسلامیہ کے ہر فرد کا، ہر حال میں اس قلبِ امت سے مستحکم اور مضبوط رابطہ۔ یہ رابطہ فکری بھی ہونا چاہیے اور عملی بھی؛ یعنی امام کو نمونۂ عمل قرار دینا، ان کے افکار و نظریات میں ان کی پیروی کرنا اور افعال، رفتار، سرگرمیوں اور اقدامات میں ٹھیک ان کے نقشِ قدم پر چلنا ولایت ہے۔

لہٰذا علی ابن ابی طالبؑ کی ولایت رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے افکار اور اپنے افعال میں علیؑ کے پیروکار ہوں، آپ کے اور علیؑ کے درمیان ایک مضبوط، مستحکم اور اٹوٹ بندھن قائم ہو۔ آپ علیؑ سے جدا نہ ہوں۔ یہ ہیں ولایت کے معنی۔

اب ذرا غور فرمائیے گا ہم قرآن کریم کی سورۂ مائدہ سے کچھ آیات آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ ان آیات میں ولایت کے مثبت پہلو، یعنی داخلی تعلق کے قیام کا ذکر بھی ہوا ہے اور ولایت کے منفی پہلو، یعنی خارجی تعلقات کے توڑنے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان آیات میں ولایت کا وہ دوسرا پہلو یعنی ولی کے ساتھ اتصال و ارتباط بھی بیان کیا گیا ہے۔ ولی یعنی قطب، یعنی قلب، یعنی حاکم اور امام؛ یعنی ان تمام مطالب کی طرف مکمل طور پر اشارہ ہوا ہے، اب غور و فکر کریں تاکہ مطلب سمجھ سکیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ﴾[1]

اے صاحبانِ ایمان! یہود و نصاریٰ کو (یہودیوں اور عیسائیوں کو) اپنا اولیاء نہ بناؤ۔

اولیاء، ولی کی جمع ہے، ولی ولایت سے ماخوذ ہے۔ ولایت یعنی پیوستگی، ولی یعنی پیوستہ اور جڑا ہوا۔ یہود و نصاریٰ کو اپنے سے نہ جوڑو، ان سے منسلک نہ ہو، انہیں اپنے لیے اختیار نہ کرو۔

﴿بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ ان میں سے بعض، بعض دوسروں کے اولیاء اور ان سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ علیحدہ علیحدہ بلاکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت تمہارے دین کی مخالفت میں یکجا ہیں۔ ﴿بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں۔

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ﴾ تم میں سے جو کوئی ان سے تولّیٰ کرے گا تو بے شک وہ انہی میں سے ہو جائے گا۔

---

۱. سورہ مبارکہ مائدہ: آیات ۵۱ سے ۵۳

تولّی (تفعُّل کے باب سے) یعنی ولایت کو قبول کرنا۔ جو کوئی ان کی ولایت کے دائرے میں قدم رکھے گا اور اپنے آپ کو ان سے منسلک کرے گا تو بلا شک وہ انھی میں سے ہو گا۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ بے شک خدا ظالم لوگوں کی ہدایت نہیں کرے گا۔

﴿فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ﴾ تم ان لوگوں کو دیکھتے ہو جن کے دلوں میں بیماری ہے، وہ دوڑ دوڑ کر دشمنانِ دین کے کیمپ کی جانب جاتے ہیں۔ وہ اس بات پر اکتفا نہیں کرتے کہ معمول کے مطابق چل کر ان کی طرف جائیں، بلکہ دوڑ کر ان کی طرف جاتے ہیں۔ ان کے قریب جانے پر بھی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان کی صفوں میں پوری طرح شامل ہو جاتے ہیں۔ ان سے دوستی کا اظہار کرتے ہیں۔

﴿يَقُولُونَ نَخْشَى أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ﴾ کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہمارے لیے کوئی مشکل اور دردِ سر کھڑا نہ ہو جائے، ہمیں ڈر لگتا ہے کہ اگر ہم ان سے دوستی نہ کریں تو وہ ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔ خدا ان کے جواب میں فرماتا ہے: ﴿فَعَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ﴾ امید ہے کہ خدا مومنین کے گروہ کو فتح نصیب کرے گا یا ان کے مفاد میں اپنی طرف سے کوئی حادثہ وجود میں لے آئے گا اور جب یہ کام ہو جائے گا تو: ﴿فَيُصْبِحُوا عَلَى مَا أَسَرُّوا فِي أَنْفُسِهِمْ نَادِمِينَ﴾ اس وقت ان کے ساتھ مل جانے والے یہ بدبخت لوگ، پشیمان ہوں، شرمندہ ہوں اور کہیں گے کہ دیکھا ہم نے کیسی غلطی کی ہے؟ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ مومنین کو اس طرح کامیابی اور قوت نصیب ہو گی تو ہم دشمنِ دین اور دشمنِ خدا کے ساتھ نہ ملتے، اپنے آپ کو بے عزت نہ کرتے۔

جب وہ دشمنانِ خدا کے ساتھ سازباز کے ذریعے ذلیل و رسوا ہو گئے تو مومنین نے کہا؟

﴿أَهَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ﴾ کیا یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے خدا کی سخت اور شدید قسمیں کھائی تھیں، ﴿إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ﴾ کہ وہ آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کے ہم عقیدہ و ہم فکر ہیں۔

﴿حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ﴾ ان کے اعمال نابود و تباہ و برباد ہو گئے، ﴿فَأَصْبَحُوا خَاسِرِينَ﴾ پس یہ نقصان اٹھانے والے ہو گئے ہیں۔ یہاں تک یہ آیات بیرونی تعلقات کے بارے میں تھیں۔

اب اندرونی تعلقات کے بارے میں غور و فکر کیجیے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ﴾ اے اہلِ ایمان! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پلٹ جائے خدا کے دین کی نشر و اشاعت کی وہ ذمہ داری

جو تم نے خدا پر ایمان کے ساتھ قبول کی ہے، اگر تم اس سے سبک دوش ہو جاؤ اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچانے سے کتراؤ تو یہ نہ سمجھنا کہ یہ بوجھ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا، یہ تمہاری غلط فہمی ہو گی، یہ افتخار ایک دوسری قوم کو نصیب ہو جائے گا کہ جواس ذمہ داری کو پورا کرے گی۔

﴿مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾[1] تم میں جو کوئی اپنے دین سے پلٹ گیا اور مرتد ہو گیا، تو خداوندِ عالم ایسے لوگوں کو پیدا کرے گا جن سے خود خدا کو محبت ہو گی اور وہ بھی خدا سے محبت کرتے ہوں گے۔

محبتِ خدا کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ﴾[2] یہ قرآن ہے اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو مجھ پیغمبر کی پیروی کرو تاکہ خدا بھی تمہیں دوست رکھے۔ پس ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ یعنی یہ سو فیصد فرمان خدا کے تابع تھے کہ خدا بھی ان سے محبت کرتا تھا۔یہ ایک دوطرفہ صفت ہے۔

﴿أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ ان لوگوں میں پائی جانے والی صفات میں سے ایک اور صفت یہ ہے کہ یہ مومنین کے لیے منکسر اور خاکسار ہیں۔ یہ خاکساری مومنین کے ساتھ ان کے انتہائی گہرے بندھن اور تعلق کی علامت ہے، ﴿أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ کفار، دشمنانِ دین اور مخالفینِ قرآن کے مقابل، سر اٹھا کے کھڑے ہوتے ہیں یعنی ان سے متاثر اور مرعوب نہیں ہوتے، ان کے سامنے سر اٹھا کے رکھتے ہیں اور انہوں نے اپنے گرد اسلامی فکر کا ایک ایسا حصار اور دائرہ کھینچا ہوتا ہے کہ وہ کسی صورت میں کفار سے متاثر نہیں ہوتے۔

﴿يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ﴾ ان کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ یہ لوگ کسی قید اور شرط کے بغیر انتہائی بہادری اور دلیری کے ساتھ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔ جیسا کہ آیت میں ہے: ﴿وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ کس طرح کی ملامت، اس کے بارے میں آپ غور و فکر کریں؛ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ یہ خدا کا وہ لطف اور فضل

---

۱. سورہ مبارکہ مائدہ: آیت ۵۴۔ یہ لوگ وہی ہیں جو اسلامی آئیڈیل ہیں، وہ معاشرہ اسلامی آئیڈیل ہے، وہ داخلی و خارجی رابطوں اور تعلقات کے اعتبار سے یوں ہیں کہ اس آیت میں آیا ہے: ﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ﴾ خدائے متعال ایسے لوگوں کو پیدا کرے گا کہ جن سے خود خدا محبت کرتا ہے، ﴿وَيُحِبُّونَهُ﴾ ور وہ خدا سے محبت کرتے ہوں گے۔

۲. سورہ مبارکہ آل عمران: آیت ۳۱

ہے جو وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور وہ صاحبِ وسعت اور علیم و دانا ہے۔
بعد والی آیت اس قلب، اس امام اور اس پیشوا سے اسلامی معاشرے کے مختلف حصوں سے تعلق کے بارے میں ہے۔
(قرآن کریم نے) بیرونی روابط کے بارے میں گفتگو کی، اندرونی روابط کے بارے میں بات کی، اب اندرونی روابط کے مرکزی نکتے، یعنی امام اور پیشوا کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، قائد اور رہبر کے متعلق بات کرتا ہے: ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ﴾[1] ولی اور قائم امر، وہ ہستی جسے اسلامی معاشرے اور امت اسلامیہ کی تمام سرگرمیوں کا محور و مرکز ہونا چاہیے اور ان کے بارے میں جس سے ہدایات لینی چاہیے، وہ خدا ہے، لیکن خدا مجسم ہو کر تو لوگوں کے درمیان نہیں آسکتا اور انہیں بنفس نفیس امر و نہی تو نہیں کر سکتا۔ پس پھر یہ محور و مرکز کون ہے؟ ﴿وَرَسُولُهُ﴾ واضح ہے کہ رسول اور خدا کے درمیان کسی قسم کی رقابت اور تنازع نہیں۔ پیغمبر، خدا کا نمائندہ ہے۔ پس خدا ہے اور اس کا رسول؛ رسول ہمیشہ کے لیے باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ قرآن کریم نے کہا ہے: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾[2] رسول بھی ہمیشہ باقی نہیں رہے گا۔
پس رسول کے بعد یہ ذمہ داری کس کی ہو گی، اسے بھی واضح ہونا چاہیے۔ لہٰذا خداوندِ عالَم ان ہستیوں کا تعارف کراتا ہے: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے،
لیکن کیا کسی کا صرف صاحبِ ایمان ہونا کافی ہو گا؟ ظاہر ہے جواب نفی میں ہے۔ اس میں دوسری صفات بھی پائی جانی چاہئیں۔
﴿الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں،
﴿وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾ اور جو رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں۔
مفسرین نے واو کو واو حالیہ ذکر کیا ہے، یعنی وہ رکوع کی حالت میں ہیں، رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں۔ یعنی وہ کون ہیں؟ یعنی امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ ولی معین ہوتے ہیں۔
اس مقام پر یہ یاددہانی ضروری ہے کہ اگر ہم تشیع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ولایت کی گفتگو کر رہے ہیں تو

---

۱. سورہ مبارکہ مائدہ: آیت ۵۵۔ یہ وہی آیت ہے جس کے ہر جز کی تشریح کی گئی ہے اور یہاں اسے ایک مرتبہ پھر بیان کیا گیا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ: تمہارا ولی خدا ہے، اس کا رسول ہے اور وہ مومنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں۔
۲. سورہ مبارکہ زمر: آیت ۳۰، پیغمبر آپ کو بھی مرنا ہے اور ان سب نے بھی مر جانا ہے۔

ہمارے پیشِ نظر اس مسئلے کا مثبت پہلو ہے، اس کا منفی پہلو نہیں۔

ہم اسلام کو اس طرح بیان کر رہے ہیں جیسا کہ مکتبِ تشیع میں سمجھتے اور جانتے ہیں اور دوسرے گروہ جو ممکن ہے، اس سے مختلف سمجھتے ہوں اور اس سے مختلف جانتے ہوں، ان سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے اور اس بارے میں ہم ان سے بحث بھی نہیں کرتے، نہ ہمارا ان سے کوئی جھگڑا ہے، ہم باہم بھائی بھائی ہیں اور دوستی کا ہاتھ بھی بڑھاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہمارے سامنے ایک دشمن موجود ہے، کیونکہ دشمن ہمارے سروں تک پہنچ چکا ہے۔ اس حالت میں ہمیں ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے کا حق نہیں ہے۔ ہمارا یہی مسلک ہے جسے ہم بیان کرنا چاہتے تھے۔ ہمارا اصل مقصد تشیع ثابت کرنا ہے، نہ کہ دوسروں کی نفی کرنا۔

تشیع اور شیعیت کے بارے میں گفتگو، شیعیت کی صداقت اور اس کے کھرے ہونے کی بنا پر ہے، اس لیے ہے کہ ہم تشیع کے معتقد ہیں اور اسلام کو تشیع کے نکتۂ نظر سے دیکھتے ہیں، اس لیے نہیں ہے کہ ہم شیعہ اور سنی کے درمیان اختلاف ایجاد کرنا چاہتے ہیں، ہرگز ہمارا مقصد یہ نہیں ہے، ہم اس اختلاف انگیزی کو حرام سمجھتے ہیں۔

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اگر ہم ولایت کو ملحوظ رکھیں، تو کیا ہو گا؟ کیا اس کا ہمارے اوپر کوئی اثر بھی ہو گا؟ ہم نے ولایت کے تین پہلوؤں کو بیان کیا ہے جو اندرونی ربط و تعلق کی حفاظت، متضاد بیرونی مراکز سے تعلقات اور وابستگیوں کو توڑنا اور امتِ مسلمہ کے قلب یعنی امام اور رہبر کے ساتھ دائمی اور مضبوط تعلق کی حفاظت کرنا ہے۔

اب اگر ہم نے ان تین پہلوؤں کو ملحوظ رکھا تو کیا ہو گا؟ قرآن مجید، بعد والی آیت میں جواب دیتا ہے:

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّ اللهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللهِ هُمُ الْغَالِبُونَ﴾[۱]

جو لوگ خدا، اس کے رسول اور اہلِ ایمان کی ولایت کو قبول کریں گے، اس بندھن کا لحاظ رکھیں گے اور اس کی حفاظت کریں گے، وہی کامیاب اور غالب ہوں گے اور سب سے زیادہ کامیاب یہی لوگ ہیں اور یہ تمام دوسرے گروہوں پر غلبہ پائیں گے۔

---

۱. سورہ مبارکہ مائدہ: آیت ۵۶

بہشت ولایت

۲۶ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری — ۱۳-۱۰-۱۹۷۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾ (سورہ حج/۴۱)

گزشتہ موضوع کو پیش نظر رکھتے ہوئے ولایت کے بارے میں گفتگو سے متعلق دو نکتے قابلِ ذکر ہیں۔

ا۔ ولایت رکھنے والے فرد اور ولایت کے حامل معاشرے سے اجمالی شناسائی۔

۲۔ جس معاشرے میں ولایت پائی جاتی ہے اس کے کردار کی عکاسی۔

ولایت کے بارے میں جو کچھ عرض کیا ہے وہ قرآن اور حدیث میں بیان شدہ مطالب کا خلاصہ ہے۔ اس گفتگو سے حاصل شدہ خلاصہ یہ ہے کہ ولایت کے کئی ایک پہلو اور مظاہر ہیں۔

ایک یہ کہ مسلمان معاشرہ اپنے وجود سے باہر موجود عناصر کے ساتھ منسلک اور غیر مسلموں سے وابستہ نہ ہو۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ منسلک اور وابستہ نہ ہونا ایک بات ہے اور دوسرے سے کوئی رابطہ نہ رکھنا ایک علیحدہ بات۔ ہم ہرگز یہ نہیں کہہ رہے کہ عالمِ اسلام کو سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے اپنے آپ کو دنیا سے الگ تھلگ کر لینا چاہیے اور کسی بھی غیر مسلم قوم، ملک اور طاقت سے رابطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ اسے ان سے وابستہ، مربوط اور ان کا تابع نہیں ہونا چاہیے۔ اسے دوسری طاقتوں کے زیر سایہ آکر ختم نہیں ہو جانا چاہیے۔ بلکہ اسے چاہیے کہ اپنی خود مختاری کی حفاظت کرے اور اپنے قدموں پر کھڑا ہو۔

ولایت کا دوسرا مظہر، مسلمان عناصر کے درمیان گہرا داخلی اتحاد اور رابطہ و تعلق ہے۔ یعنی جب ہماری گفتگو اسلامی معاشرے کے بارے میں ہو تو اس پیرائے جسے ولایت کہتے ہیں وہ اسلامی معاشرے کا متحد اور یک جہت ہونا ہے۔ جیسے کہ احادیث نبویؐ اور احادیث معصومینؑ میں ہے:

«مَثَلُ الْمُؤْمِنِینَ فِی تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ کَمَثَلِ الْجَسَدِ»[۱]

(مومنین کی مثال) ایک ایسے جسد واحد اور عمارت واحد کی سی ہے، جسے ایک دوسرے سے پیوست اور باہم متصل ہونا چاہیے اور جسے دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی مزاحمتوں اور ان کی عداوتوں کے مقابل متحد ہونا چاہیے۔

یہ نکتہ قرآن مجید کی آیت ﴿أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِینَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِینَ﴾[۲] سے حاصل ہوتا ہے۔

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت نے اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے: ﴿مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِینَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَهُمْ﴾۔[۳]

جب یہ بیرونی مخالفین کے سامنے ہوتے ہیں تو تم انہیں مضبوط، مستحکم اور باہر کی کوئی تاثیر اور اثر قبول نہ کرنے والا پاؤ گے۔ لیکن یہ خود آپس میں انتہائی مہربان ہیں کیونکہ ان کے درمیان دھڑے بندی نہیں ہے اور اس عظیم جسد و اسلامی پیکر کے اعضا ایک دوسرے پر تاثیر ڈالتے ہیں، وہ سب ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں، سب ایک دوسرے کو خیر اور بھلائی کی طرف بلاتے ہیں۔

ولایت کے مظاہر میں سے ایک اور مظہر جو سب سے زیادہ اہم ہے اور پہلے اور دوسرے معنی کی ولایت کی بقا کا ضامن بھی ہے، وہ یہ ہے کہ خود معاشرے کے اپنے اندر ایک مقتدر مرکزی قیادت موجود ہو کیونکہ اسلامی معاشرے کو جسد واحد کی مانند ہونا چاہیے جس کے مختلف اعضا اندر سے بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور مربوط ہوں اور باہر بھی بیرونی عناصر کے مقابل ایک بند مٹھی اور جسد واحد کی مانند عمل کریں۔ چونکہ اسلامی معاشرے میں وحدت ضروری ہے اور یہ وحدت اور یکسوئی انہیں منظم کرنے والی ایک مرکزی قوت کے بغیر ممکن نہیں۔

لہٰذا اگر اسلامی معاشرے کے مختلف حصّوں میں ہر حصے پر علیحدہ علیحدہ خودمختار قوتوں کی حکومت ہو تو

---

۱. بحارالانوار، کتاب السماء و العالم، ابواب الانسان و الروح..، باب فی خلق الارواح قبل الاجساد..، ح ۲۹

۲. سورہ مبارکہ مائدہ: آیت ۵۴۔ مومنین کے سامنے خاکسار اور کفار کے سامنے صاحب عزت۔

۳. سورہ مبارکہ فتح: آیت ۲۹۔ محمد، اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لیے انتہائی سخت اور آپس میں انتہائی مہربان ہیں۔

اس پیکر کے اعضا ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیں گے، ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے اور ایک راستے پر گامزن نہیں ہو سکیں گے۔
وہ مرکز جو اسلامی معاشرے میں موجود تمام گروہوں کو منظم کرتا ہے اور ہر ایک کی صلاحیت کے مطابق کام اس کے سپرد کرتا ہے، ان کے درمیان ٹکراؤ اور تصادم کو روکتا ہے اور تمام قوتوں کی ایک سمت میں رہنمائی کرتا ہے، اسے خدا کی جانب سے ہونا چاہیے، اسے عالم، آگاہ اور معصوم ہونا چاہیے، اسے اسلام کے تمام تعمیری عناصر کا عکاس ہونا چاہیے، اسے قرآن کا مظہر ہونا چاہیے۔ ایسے مرکز کو ہماری اسلامی تعلیمات میں ولی کہا جاتا ہے۔
پس مذکورہ بالا دو پہلوؤں سے اسلامی معاشرے کی ولایت تقاضا کرتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں ایک ولی کا وجود ضروری ہے۔ یہ بھی ولایت کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔
اس کے بعد یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیامیں اور آپ ولایت رکھتے ہیں یا نہیں؟کیا مجموعی طور پر ہمارا معاشرہ ولایت رکھتا ہے یا نہیں؟
ممکن ہے کوئی یہ سوال کرے کہ کیا یہ دونوں(فرد اور معاشرہ) ایک ہی نہیں ہیں؟کیا یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں؟ ہم جواب میں کہیں گے، جی ہاں۔ ممکن ہے کہ ایک عضو خود سالم ہو لیکن اس ایک عضو کے سالم ہونے کے اولاً تو یہ معنی نہیں ہوں گے کہ پورا بدن سالم ہے اور ثانیاً یہ کہ اگر ایک سالم عضو ایک غیر سالم بدن میں ہو تو وہ ایک سالم عضو کی تمام خوبیوں کا مالک نہیں ہو سکتا۔
تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا ولایت رکھنے والے ایک شخص کے ذاتی طور پر ولایت رکھنے سے اس کی ذمے داری ختم ہو جاتی ہے؟ اور اب اس پر ولایت کا حامل معاشرہ بنانے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟
چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ اگر انسان خودتو ولایت کا حامل ہو لیکن ولایت سے محروم ایک معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہو اور اسے اپنے معاشرے کو ولایت کا حامل بنانے کی ذمے داری کا احساس نہ ہو تو کیا اس میں ذمہ داری کے اس احساس کا نہ پایا جانا، خود اس کی ولایت کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟ کیا اس کی ولایت کو اسی بات نے ضعیف اور مخدوش نہیں کر دیا ہے کہ اس میں دوسروں کو ولایت کا حامل بنانے کی سوچ نہیں پائی جاتی؟
یہ وہ مسائل ہیں جن پر ہمیں بحث اور گفتگو کرنی چاہیے۔ اب ہم ان میں سے کچھ مسائل بیان کریں گے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے صاحبِ ولایت ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ جب کبھی اہل بیتؑ میں سے کسی کا نام سنے تو علیہ السلام کہے۔ سمجھتے ہیں کہ ولایت کا حامل ہونا یہ ہے کہ انسان کے دل میں محبتِ اہلِ بیتؑ پائی جاتی ہو۔ البتہ بے شک اہلِ بیتؑ کی محبت رکھنا واجب اور فرض ہے اور ان کے اسمائے گرامی کو عزت و تکریم کے ساتھ زبان پر جاری کرنا، ان کے نام پر مجالس کا انعقاد، ان کی خوشی غمی سے سبق لینا، ان کے مصائب بیان کرنا اور مسرتوں پر ان کا ذکر کرنا اور ان کی مظلومیت پر آنسو بہانا لازمی ہے۔ لیکن صرف یہی چیزیں ولایت نہیں ہیں۔

انسان کی سرشت میں ولایت کے پائے جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ولی کے ساتھ فکری اور عملی طور پر زیادہ سے زیادہ وابستہ ہو اور اس کی اس وابستگی میں روز بروز اضافہ ہو۔

ولی کو تلاش کیجیے، خدا کے ولی کو پہچانیے، اسلامی معاشرے کے حقیقی ولی کا تعین کیجئے، اس کے بعد ذاتی طور پر فکری لحاظ سے، عملی لحاظ سے، جذبات و احساسات کے لحاظ سے، راہ و رسم اور روش کے اعتبار سے اپنے آپ کو اس سے متصل اور مربوط کیجیے، اس کی اتباع کیجئے، اس انداز سے کہ آپ کی کوشش اس کی کوشش، آپ کا جہاد اس کا جہاد، آپ کی دوستی اس کی دوستی، آپ کی دشمنی اس کی دشمنی اور آپ کی صف اس کی صف ہو۔ اس طرح کا انسان ولایت کا حامل انسان ہوتا ہے۔

ایسا شخص جو ولی کو پہچانتا ہو اور اس کا ہم فکر ہو، ولی کے عمل کو پہچانتا ہو اور اس کا عمل ولی کے عمل سے ہم جہت ہو، وہ ولی کی اتباع کرتا ہو، اپنے آپ کو فکری اور عملی طور پر ولی سے منسلک قرار دیتا ہو، ایسا شخص حاملِ ولایت ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی نظر میں ولایت کے لیے عمل ضروری ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

«وہ شخص جو اہلِ عمل ہے، وہ ہمارا ولی (دوست) ہے اور وہ شخص جو اہلِ عمل نہیں،وہ ہمارا دشمن ہے۔»

امام جعفر صادقؑ ولایت کے یہ معنی بیان کرتے ہیں، کیونکہ آپ کی نظر میں ولایت اس جاہل یا اس مفاد پرست شخص کی نظر میں ولایت سے مختلف ہے جو امامؑ کا نام لے کر دنیاوی مفاد حاصل کرتا ہے۔

ولایت رکھنے والا معاشرہ کیسا ہوتا ہے؟

ولایت رکھنے والا معاشرہ وہ ہوتا ہے جس میں پہلے ولی متعین ہو اور اس کے بعد وہ ولی اس معاشرے کی تمام قوتوں، تمام سرگرمیوں اور تمام فعالیتوں کا سرچشمہ اور مرکزِ ہدایت ہو، ایک ایسا نقطہ ہو کہ جس

سے سماج کے چھوٹے بڑے دھارے نکلتے ہوں، ایک ایسا مرکز ہو کہ جس سے تمام احکام و فرامین جاری ہوتے ہوں، جو تمام قوانین کا اجرا اور ان کا نفاذ کرتا ہو، سب کی نگاہیں اس کی طرف لگی رہتی ہوں، سب اسی کی پیروی کرتے ہوں، زندگی کا انجن وہی سٹارٹ کرتا ہو، کاروانِ حیات کا قافلہ سالار وہی ہو۔ ایسا معاشرہ، ولایت رکھنے والا معاشرہ کہلائے گا۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد پچیس برس تک معاشرے کی باگ ڈور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ پیغمبرؐ کے بعد پچیس سال تک اسلامی معاشرہ ولایت کے بغیر رہا تھا۔ اس معاشرے میں کچھ مسلمان ولایت کے حامل تھے، ابوذرؓ ذاتی طور پر ولایت کے حامل تھے، مقدادؓ ذاتی طور پر ولایت رکھتے تھے، کچھ اور لوگ ذاتاً ولایت کے مالک تھے، لیکن اسلامی معاشرہ ولایت کا حامل نہ تھا۔ جب اسلامی معاشرے پر حضرت علیؑ کی حکومت قائم ہوئی تو اسلامی معاشرہ ولایت کا حامل معاشرہ بنا۔ جب معاشرے میں امر و نہی کا مرکز امامؑ ہو، جب تمام امور کی باگ ڈور امامؑ کے ہاتھ میں ہو، جب عملی طور پر معاشرے کا نظم و نسق امامؑ کے اختیار میں ہو، جب امامؑ ہی جنگ کا حکم دے، جب امامؑ ہی حملے کا فرمان جاری کرے، جب امامؑ ہی صلح نامہ تحریر کرے تو ایسی صورت میں معاشرہ ولایت کا حامل ہوتا ہے۔ بصورت دیگر معاشرہ ولایت کا حامل نہیں ہوتا۔

اگر آپ ولایت کے حامل ہیں تو خدا کا شکر ادا کیجیے۔ اگر یہ نعمت آپ کو میسر ہے تو خدا کا شکر بجا لائیے۔ کیونکہ ولایت کی نعمت سے بڑھ کر کوئی اور نعمت نہیں ہے۔ میں آپ کے سامنے وضاحت سے بیان کرتا ہوں کہ کس طرح ولایت سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں ہے۔ اور اگر آپ کو ولایت میسر نہیں تو اسے حاصل کرنے کی کوشش کیجئے اور اپنی ذات میں اور انسانی معاشرے میں ولایت قائم کیجئے۔

ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ علیؑ کی طرح زندگی بسر کریں، کوشش کرنی چاہیے کہ علیؑ کے نقش قدم پر چلیں، کوشش کرنی چاہیے کہ اپنے اور علیؑ کے درمیان، جو خدا کے ولی ہیں، تعلق قائم کریں۔

ان باتوں کے لیے کوشش کی ضرورت ہے، جدوجہد کی ضرورت ہے، ان کے لیے خون دل پینا پڑتا ہے۔ اسی طرح جیسے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد آئمہ ہدیٰ علیہم السلام نے ولایت کے لیے جدوجہد کی، اس کے لیے صعوبتیں اٹھائیں۔

آئمہؑ نے ولایت کو زندہ کرنے اور اسلامی معاشرے کے احیا کے لیے بھرپور جدوجہد کی، تاکہ وہ پودا جو

انسان کے نام سے اس زمین اور اس باغ میں کاشت ہوا ہے، ولایت کے جاں بخش اور حیات آفریں خوشگوار پانی سے اس کی نشو و نما کریں۔ آئمہؑ نے اس مقصد کے لیے کوشش کی۔ معاشرے میں ولایت کے قیام کے لیے کوشش کرنے کا یہ معنی نہیں ہے کہ بیٹھ کر بولتے رہیں، زبانی جمع خرچی کرتے رہیں اور دوسروں کو برابھلا کہتے رہیں۔ ایسا کرنے سے ولایت حاصل نہیں ہوتی، ایسا کرنے کی صورت میں ولایت سے دور ہو جائیں گے، اس کا راستہ یہ ہے کہ ہمیں اسلام کے اس ولی کو قوت بخشنے کے لیے کوشش کرنی چاہیے کہ جسے خدا نے ولی کہا ہے۔ خدا کا ولی کیسا ہے؟ وہ عرض کر چکا ہوں کہ خدا ایک ولی کا تعارف نام سے کرواتا ہے۔ ایک دفعہ یہ ہے کہ علی بن ابی طالبؑ، حسن بن علیؑ، حسین بن علیؑ، علی بن حسینؑ سے لے کر امام آخر تک تمام ائمہؑ اپنے ناموں اور خصوصیات کے ساتھ معین ہوتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ولی کا تعین نام کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ ایک ولی کے توسط سے یا بعض صفات بیان کر کے اس کا تعین کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

«فَأَمّا مَن كانَ مِن الفُقَهاءِ صائنًا لنفسِهِ حافِظًا لِدينِهِ مُخالِفًا على هَواهُ مُطيعًا لأمرِ مَولاهُ فلِلعَوامِّ أن يُقَلِّدُوهُ»[1]

جب معاشرہ ولایت کا حامل ہو جائے تو اس وقت کیا ہوگا؟ بہتر ہے کہ ایک جملے میں بیان کروں؛ وہ معاشرہ ایسا مردہ ہے جس میں روح آجاتی ہے۔

ایک معاشرے میں ولایت کی اہمیت سمجھنے کے لیے آپ اس مثال کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیے۔ مردہ جسم ہٹا کر اس کی جگہ انسانی معاشرہ لے آئیے، جان اور روح کی جگہ ولایت کو رکھ دیجئے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں ولایت نہ ہو، اس میں صلاحیتیں ہیں لیکن ناکارہ ہو جاتی ہیں، برباد چلی جاتی ہیں، نابود ہو جاتی ہیں، ضائع ہو جاتی ہیں یا اس سے بھی بدتر یہ کہ انسان کو نقصان پہنچانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ دماغ ہوتا ہے اور سوچتا ہے، لیکن فساد پھیلانے کی بابت، انسان کشی کی بابت، دنیا کو جلا ڈالنے کی بابت، انسانوں کو برباد کر دینے کے بارے میں، استحصال، استبداد اور استکبار کی جڑیں مضبوط کرنے کے بارے میں۔ اس کی آنکھیں ہوتی ہیں لیکن جو چیزیں اسے دیکھنی چاہئیں وہ انہیں نہیں دیکھتا اور جنہیں نہیں دیکھنا چاہیے انہیں دیکھتا ہے۔ اس کے کان ہوتے ہیں لیکن وہ حق کی بات نہیں سنتا۔ اس

---

۱. وسائل الشیعہ، کتاب القضاء، ابواب صفات القاضی، باب ۱۰، حدیث ۲۰۔ فقہاء میں سے جو فقیہ اپنے نفس پر مسلط ہو، خدا کے دین کا محافظ ہو، نفسانی خواہشات کی مخالفت کرتا ہو اور احکامِ الٰہی کا مطیع و فرمانبردار ہو تو عوام کو چاہیے کہ اس کی تقلید کریں۔

کے اعصاب حق کی بات کو دماغ تک پہنچاتے ہیں لیکن دماغ اعضا و جوارح کو حق کے مطابق حکم نہیں دیتا، اعضا و جوارح حق کے مطابق عمل انجام نہیں دیتے، دنیا کے حالات انسان کو حق کے مطابق عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتے، ایسا معاشرہ ولایت سے خالی اور بے بہرہ ہے۔

جس معاشرے میں ولایت ہو وہ معاشرہ ایک ایسا معاشرہ بن جاتا ہے جو تمام انسانی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے، وہ تمام چیزیں جو خدا نے انسان کو کمال اور بلندی کے لیے دی ہیں، یہ معاشرہ ان کی نشوونما کرتا ہے، انسانیت کے پودے کو تناور درخت میں تبدیل کرتا ہے، انسانوں کو کمال تک پہنچاتا ہے، انسانیت کی تقویت کا باعث بنتا ہے۔ اس معاشرے میں ولی، یعنی حاکم، یعنی وہ ہستی جس کے ہاتھ میں تمام امور کی باگ ڈور ہوتی ہے، پورے معاشرے کو خدا کی راہ پر ڈالتا ہے اور اسے ذکر خدا کا حامل بناتا ہے۔ مال و دولت کے لحاظ سے، دولت کی منصفانہ تقسیم کرتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ نیکیوں کو عام کرے، کوشش کرتا ہے کہ برائیوں کی جڑ سے اکھاڑ دے۔

﴿الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾[1]

وہ لوگ جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ نماز خدا کے ذکر اور اس کی جانب معاشرے کی توجہ کی علامت ہے۔

﴿أَقَامُوا الصَّلَاةَ﴾: نماز قائم کرتے ہیں، خدا کی طرف قدم بڑھاتے ہیں، احکام الٰہی کے مطابق اپنے لیے راہِ عمل کا تعین کرتے ہیں﴿وَآتَوُا الزَّكَاةَ﴾: کلی اور مسلّمہ طور پر اس کے معنی یہ ہیں کہ دولت کے لحاظ سے سماج میں توازن پیدا ہو۔ زکات کے بارے میں ایسی روایات بھی ہیں جو کہتی ہیں کہ زکات دولت میں توازن کا موجب ہے۔

﴿وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ﴾: نیکیوں کو عام کرنا، اچھائیوں کو فروغ دینا اور منکرات کا قلع قمع کرنا۔ عام طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے معنی فقط یہ ہیں کہ میں آپ کو تلقین کروں کہ جناب عالی! آپ فلاں برا کام نہ کیجئے، فلاں اچھا کام کیجئے۔ جبکہ تلقین کرنا اور زبانی کہنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔

---

۱. سورہ مبارکہ حج: آیت ۴۱۔ وہ لوگ جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکات ادا کرتے ہیں، نیکیوں کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور یہ طے ہے کہ جملہ امور کا انجام خدا کے اختیار میں ہے۔

لوگوں نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے کہا: آپ معاویہ کے خلاف جنگ کیوں کر رہے ہیں؟ امامؑ نے فرمایا: «اس لیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے۔» اچھی طرح سنیے اور نتیجہ نکالیے۔ جنگ صفین میں امامؑ سے کہا جا رہا ہے کہ آپ کو معاویہ سے کیا واسطہ، آپ کوفہ جائیے اور وہ شام کا رخ کرے۔ امامؑ فرماتے ہیں: خدا نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو واجب کیا ہے۔

امام حسینؑ کوفہ سے نکلتے ہیں، آپ سے پوچھتے ہیں کہ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ فرماتے ہیں:

«أُریدُ أنْ آمُرَ بالمَعروفِ و أنهی عَنِ المنکَر»[1]۔ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں۔

دیکھیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دائرہ کس قدر وسیع ہے جبکہ ہماری نظر میں یہ کس قدر چھوٹا اور تنگ ہو چکا ہے۔

بہر حال جب کسی معاشرے میں ولایت ہو تو وہاں نماز قائم ہوتی ہے، زکات ادا کی جاتی ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ بے جان جسم میں جان پڑ جاتی ہے۔

---

۱. بحارالانوار، کتاب تاریخ الحسین، ابواب ما یختص بتاریخ الحسین بن علی، باب ۳۷، وصیتہ لمحمد بن حنفیّہ

چھبیسویں نشست

ولایت کا عملی قیام

۲۷ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری

۱۹۷۴-۱۰-۱۴

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ إِنَّ اللهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ۞ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾

(سورہ نساء/۵۸-۵۹)

گزشتہ گفتگوؤں کے تسلسل میں، ہمارا مقصد ولایت کے حوالے سے سامنے آنے والے کچھ مسائل کی تشریح ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید سے ثابت کیا کہ مسلمان معاشرے کے اندرونی اتحاد و اتصال کو محفوظ رکھنے اور اسے بیرونی وابستگیوں سے بچانے کے لیے لازمی ہے کہ اسلامی معاشرے میں ایک مرکزی قوت موجود ہو، تاکہ وہ قوت اس معاشرے کی تمام سرگرمیوں کی نگرانی کرے، تمام میدانوں میں اس کی سمت اور اس کی پالیسیوں کا تعین کرے اور معاشرے کے تمام گروہوں اور دھڑوں کی رہنمائی اور انہیں منظم کرے۔ اس قوت کا نام ولیّ ہے۔ «ولی» یعنی فرمانروا، یعنی وہ ہستی جس سے تمام قوتیں رہنمائی لیں اور تمام کاموں میں اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا شخص ہو کہ فکری اور عملی ہر دو میدانوں میں اسلامی معاشرے کا نظم و نسق اسی کے ہاتھ میں ہو۔ اسے «ولی» کہتے ہیں۔ ہم نے اسے قرآن سے ثابت کیا ہے۔ آپ بتائیں کہ اسلامی معاشرے کا ولی کون ہے؟

اس سوال کے جواب میں قرآن مجید کا جواب یہ ہے، کہتا ہے: وہ ہستی جو معاشرے کی واقعی ولی ہے «خدا» ہے۔ خدا کے سوا کوئی اور اسلامی معاشرے کا حاکم نہیں ہے۔ یہ وہی بات ہے جو توحید بھی ہم سے کہتی ہے اور نبوت بھی اسی اصول کو ہمارے لیے ثابت کرتی ہے۔

اب آپ دیکھیں گے کہ ولایت بھی ہم سے یہی کہتی ہے۔ بنیادی طور پر ایک مکتب اور مسلک کے اصولوں کو اسی طرح ہونا چاہیے کہ ان میں سے ہر اصول وہی نتیجہ دے جو نتیجہ اس کے دوسرے اصول دیتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم مکتب کے ایک اصول سے جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں، اس کے دوسرے اصولوں سے اس کے مخالف نتیجہ اخذ کریں۔

لہٰذا وہ ہستی جو اسلامی معاشرے میں امر و نہی کا حق رکھتی ہے اور احکام و فرامین کے نفاذ اور معاشرے کی راہ و روش کے تعین کی حقدار ہے، مختصر یہ کہ وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں حاکمیت کا حق رکھتی ہے، وہ خداوند عالَم کی ذات ہے۔ ﴿وَاللهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ﴾[1]

جن افراد کے ذہن میں شاید مفاہیم مخلوط ہو جائیں، ہم انہیں یہ یاددہانی کرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری گفتگو خداوندِ عالَم کی تکوینی حاکمیت کے بارے میں نہیں ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ثابت اور معلوم ہے کہ زمین اور آسمان کی گردش کو خداوندِ عالَم اپنے ارادۂ قاہر سے تنظیم کرتا ہے۔ ہماری گفتگو اس بارے میں ہے کہ انسانوں کی زندگی کے قوانین اور اسلامی معاشرے کے انفرادی اور اجتماعی روابط بھی خدا کے احکام و فرامین پر مبنی ہونے چاہئیں۔ یعنی نظامِ اسلامی اور حکومت و نظامِ علوی کے زیر سایہ الٰہی، اسلامی اور قرآنی معاشرے کا قانونی حاکم و فرمانروا صرف اور صرف خدا ہے۔

اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ «حاکم و فرمانروا خدا ہے» سے کیا مراد ہے؟

اپنے احکام پر عمل درآمد کرانے کے لیے خدائے متعال تو لوگوں کے سامنے آنے سے رہا؟ دوسری طرف انسانوں پر ایک انسان ہی حکومت کرسکتا ہے۔ ضروری ہے کہ انسانوں کے امور و معاملات کی باگ ڈور ایک انسان ہی کے ہاتھ میں ہو۔ وگرنہ اگر انسانی معاشرے میں صرف قانون موجود ہو، چاہے وہ الٰہی قانون ہی کیوں نہ ہو، لیکن امیر المومنین کی تعبیر کے مطابق کوئی امیر، کوئی فرمانروا یا کوئی کمیٹی نہ ہو، مختصر یہ کہ اگر انسانی معاشرے میں قانون کے اجرا و نفاذ کے لیے کوئی ناظر و نگہبان نہ ہو تو اس معاشرے کا نظم و نسق قائم نہیں رہ سکے گا۔

رہی بات یہ کہ وہ انسان کون ہو سکتا ہے؟

اس سوال کے مختلف مکاتب فکر کے افراد نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ تاریخی حقائق بھی اس سوال

---

۱. سورہ مبارکہ آل عمران: آیت ٦٨

کے مختلف جواب دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے: الملك لمن غلب۔ مراد یہ ہے کہ جو کوئی غالب آجائے، وہی مملکت کا مالک ہوگا۔ یعنی جنگل کا قانون ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جس کسی میں زیادہ تدبیر پائی جائے، وہی حکمرانی کے لائق ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جسے لوگوں کی تائید حاصل ہو، وہی حکومت کا حقدار ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جو کوئی فلاں اور فلاں قبیلے سے تعلق رکھتا ہو، وہی حکمران بننے کا اہل ہے۔ کچھ دوسرے لوگوں نے بھی مختلف قسم کی باتیں کی ہیں اور دوسری منطق اور افکار کا اظہار کیا ہے۔

دین اور مکتب نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے: ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ﴾[1]۔ پروردگارِ عالَم کی جانب سے عملاً جو ہستی معاشرے میں فرمان جاری کرنے اور امر و نہی کرنے کی ذمے دار قرار دی گئی ہے، وہ اس کا رسول ہے۔ لہٰذا معاشرے میں جس وقت ایک پیغمبر آجائے، تو پیغمبر کی موجودگی میں اس کے سوا کسی اور حاکم کی حکومت کی کوئی گنجائش نہیں۔ پیغمبر یعنی وہ ہستی جس کا معاشرے پر اقتدار ہونا چاہیے۔ معاشرے پر حکمرانی ہونی چاہیے۔

لیکن جب دوسرے انسانوں کی طرح پیغمبر کی بھی وفات واقع ہو جائے، تو پھر کون حاکم و فرمانروا بنے گا؟ آیت قرآنی جواب دیتی ہے: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ مومنین تمہارے ولی ہیں۔

کون سے مومنین؟ کیا دین و مکتب پر ایمان لانے والا ہر شخص اسلامی معاشرے کا ولی اور حاکم ہے؟ اس صورت میں جتنے مومن ہوں گے، اتنی ہی تعداد میں حاکم بھی ہو جائیں گے۔

آیت قرآن ایک معلوم اور متعین انسان کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ شارع اور اسلامی قانون گزار کی نظر میں معین ایک ہستی کو حکومت کا حقدار قرار دیتے ہوئے اس کے انتخاب یا انتصاب کی وجہ بھی بیان کرتی ہے، اور اس طرح ایک معیار فراہم کرتی ہے۔ لہٰذا کہتی ہے: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور واقعی ایمان لائے ہیں۔ کیونکہ لفظ آمنوا کے اطلاق کا لازمہ یہ ہے کہ ایمان واقعی مراد ہو نہ کہ ظاہری ایمان۔ ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ ان لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے جنھوں نے اپنے عمل سے اپنے ایمان کی تصدیق کی ہے۔ پس ﴿الَّذِينَ آمَنُوا﴾، پہلی شرط یہ ہے کہ واقعاً مومن ہو، دوسری شرائط بھی ہیں: ﴿الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾، ان مومنین میں سے ہو جو نماز قائم کرتے ہیں۔ یہ

---

۱. سورہ مبارکہ مائدہ: آیت ۵۵

نہیں فرمایا ہے کہ جو نماز پڑھتے ہوں۔ کیونکہ نماز پڑھنا ایک چیز ہے اور نماز کا قائم کرنا دوسری چیز۔ اگر نماز پڑھنا مقصود ہوتا تو «یصلّون» کہا جا سکتا تھا، جو ایک مختصر تعبیر ہے۔ ایک معاشرے میں «اقامۂ صلاۃ» کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے میں روحِ نماز زندہ ہو، معاشرے میں نماز پڑھنے کا رواج عام ہو اور آپ جانتے ہیں کہ نمازی معاشرے سے مراد ایک ایسا معاشرہ ہے جس کے تمام گوشوں میں ذکرِ خدا اور یادِ خدا مکمل طور پر موجزن ہو۔

﴿الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ ان لوگوں میں سے ہے جو نماز قائم کرتے ہیں۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، ﴿وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ﴾، دولت کی عادلانہ تقسیم کرتے ہوں، زکات دیتے ہوں، راہ خدا میں خرچ کرتے ہوں۔ اس کے فوراً بعد فرماتا ہے: ﴿وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾۔ یعنی رکوع کی حالت میں (زکات دیتے ہوں)۔ یہ ایک خاص موقع اور خاص واقعہ کی جانب اشارہ ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ:﴿وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ ہمیشہ رکوع کی حالت میں رہتے ہیں اور یہاں کسی خاص واقعے کی جانب اشارہ نہیں ہے۔ لیکن عربی زبان سے واقفیت اس احتمال کو مسترد کر دیتی ہے اور ﴿وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ایک انسان مساوات کو اس قدر پسند کرتا ہو، راہ خدا میں خرچ کا اس قدر مشتاق ہو، فقر اور فقیر کو دیکھنا اس کے لیے اتنا تکلیف دہ ہو کہ وہ اپنی نماز ختم ہونے کا انتظار نہ کرے۔

وہ شخص ایک ایسا منظر دیکھتا ہے جس منظر کو خدا پسند نہیں کرتا اور اسے بھی وہ پسند نہیں ہوتا اور اس وقت اس کے پاس ایک انگوٹھی کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہوتی، تو وہ اسی حالت نماز میں اپنی وہ انگوٹھی اتار کر سائل کو دے دیتا ہے۔ لہٰذا یہ تاریخ میں ایک جانا پہچانا اور خاص واقعہ ہے، جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا تھا۔ آنجنابؑ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک فقیر آیا، آپؑ نے راہِ خدا میں اسے اپنی انگوٹھی عطا کر دی، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

خدائے متعال ایسے ہی پیغمبر کا جانشین معین نہیں کر دیتا، لیکن چونکہ سر براہ حکومت کی خصوصیات، خدا پر ایمان کامل، معاشرے میں قیام نماز اور اپنے آپ کو فراموش کر دینے کی حد تک انفاق اور زکات کی ادائیگی سے لگاؤ حضرت علی بن ابی طالبؑ ہی میں پائی جاتی تھیں، لہٰذا خداوندِ متعال حضرت علی بن ابی طالبؑ کو خلیفہ کے طور پر معین اور نصب کرتے ہوئے ان کی خلافت کا پیمانہ، کسوٹی اور

حکمت بھی واضح کر رہا ہے۔

پس ولی کو خدا معین کرتا ہے۔ وہ خود ولی ہے، اس کا پیغمبر ولی ہے، پیغمبر کے بعد آنے والے امام بھی ولی ہیں۔ خاندانِ پیغمبر سے تعلق رکھنے والے امام متعین کیے گئے ہیں جن کی تعداد بارہ ہے اور بعد کے مدارج میں، وہ لوگ جو خاص معیارات اور کسوٹیوں پر پورے اترتے ہوں، انہیں حکومت اور خلافت کے لیے معین کیا گیا ہے۔ اسلام میں ولی کے تعیُّن کا مسئلہ اس طرح سے ہے۔

البتہ یہ ایک آیت تھی جسے ہم نے آپ کے لیے بیان کیا۔ قرآن کریم میں اور دوسری آیات بھی ہیں۔ اسلام سختی سے اس بات پر زور دیتا ہے کہ لوگوں کے امور کی باگ ڈور ایسے افراد کے ہاتھوں میں نہیں ہونی چاہیے جو انسانوں کو لے جا کر جہنم میں جھونک دیں۔

ظالم اور جابر حکمرانوں کی جانب سے اسلامی معاشرے میں کیے جانے والے زہریلے پروپیگنڈے نے لوگوں کی معلومات کی سطح اور ان کی طرزِ فکر کو اس قدر بدل ڈالا تھا اور ان کی حالت یہ کر دی تھی کہ وہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ سمجھنے لگے تھے۔ لہٰذا جب انسان دوسری اور تیسری صدی ہجری کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے اور حکومت اور خلافت کی جانب سے ڈھائے جانے والے مظالم سے لوگوں کی بےاعتنائی کو دیکھتا ہے تو حسرت و یاس کی تصویر بن جاتا ہے اور حیران ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کا پیمانۂ صبر حضرت عثمان کے زمانے میں لبریز ہو گیا تھا اور ان کا محاصرہ کر لیا تھا اور انہیں اس دردناک انداز سے خلافت سے معزول کر دیا تھا؟ کیا یہ وہی لوگ ہیں جو آج ایک عباسی خلیفہ کی شادی کی رات اس قدر خطیر رقم خرچ ہوتے دیکھ کر بے حس و حرکت بیٹھے رہتے ہیں جس کے ذریعے اسلامی معاشرے کے ایک بڑے حصے کے حالات سدھارے جا سکتے تھے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ دولت کس قسم کے کاموں اور کیسی کیسی عیاشیوں پر خرچ کی جا رہی ہے، لیکن کوئی حرکت نہیں کرتے۔

ہمارا مقصد ہارون سے گلہ شکوہ کرنا نہیں ہے۔ ہارون اگر یہ کام نہ کرے تو وہ ہارون ہی نہیں۔ ہارونی طبقہ کا تو تقاضا ہی یہ ہے۔ جب تک یہ طبقہ موجود ہے، ایسے کام انجام دیتا رہے گا۔ لہٰذا ہمیں اس سے شکایت نہیں ہے۔ ہماری شکایت اور گلہ ان لوگوں سے ہے جو اسلام کے ابتدائی دور کی طرح حساس نہیں رہے تھے۔ وہ ہوشیاری اور شعور جو اسلام کے ابتدائی دور میں ان کے اندر پایا جاتا تھا، وہ اس سے محروم ہو چکے تھے اور اس صورتحال کے مقابلے میں اپنی ذمہ داری کا احساس کھو چکے تھے، یہ حالات

دیکھ کر انہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا تھا۔

آخر یہ لوگ ایسے کیوں ہو گئے تھے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ انتہائی مضر، شرانگیز اور گھٹیا پروپیگنڈہ شدت کے ساتھ جاری تھا اور پروپیگنڈے کے ذرائع اور مراکز سے لوگوں کے اذہان پر کام کیا گیا تھا۔ اسلامی معاشرے کے مختلف طبقات پر اور مملکت اسلامیہ میں سالہاسال سے لوگوں کے اذہان پر، لوگوں کی روحوں پر، لوگوں کی نفسیات پر کام کیا گیا تھا، جس کے نتیجے میں نوبت یہاں تک جا پہنچی تھی۔ پس آپ دیکھیے کہ اسلامی معاشرے میں حاکم کس قدر اہمیت رکھتا ہے، یہ بات کس قدر اہم ہے کہ حاکم کسے ہونا چاہیے۔ اسلامی معاشرے کا حاکم ایسے شخص کو ہونا چاہیے جسے خدا نے معین کیا ہو۔

پس اس مسئلے میں تشیع کا نقطۂ نظر انتہائی ٹھوس اور گہرا ہے۔ تشیع، قرآن مجید کے ذریعے یہ ثابت کرنے کے ساتھ کہ اولی الامر کا تقرُّر خدا کی طرف سے ہوتا ہے، ایسے معیار اور پیمانے (standards) بھی لوگوں کے حوالے کرتی ہے جن کی موجودگی میں لوگ فریب نہ کھا سکیں۔ یہ پہلا مطلب ہے کہ ولایت کے بارے میں جسے سمجھنا ضروری ہے۔

دوسرا مطلب: خدا کی ولایت کیا ہے؟ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ آپ کس دلیل کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ امر ولایت خدا کے اختیار میں ہے اور خدا کے لیے ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے اس دعوے کی بنیاد ایک طبیعی حکمت ہے، جسے اسلامی تصورِ کائنات میں مشخص اور معین کیا گیا ہے۔ اسلامی تصورِ کائنات کی رو سے کائنات کی ہر چیز کا سرچشمہ قدرتِ الٰہی ہے: ﴿وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾۔[1] روز و شب میں جو کچھ ساکن ہے وہ خدا کی طرف سے ہے۔ جب تمام موجودات کا خالق و مالک وہ ہے اور تمام چیزوں پر تکوینی حکومت اس کے اختیار میں ہے تو پھر تشریعی اور قانونی حکومت بھی اسی کے اختیار میں ہونی چاہیے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یہ دوسرا نکتہ تھا۔

اب ہم بعد کے نکات کی جانب آتے ہیں۔ اب بعد کی آیات پر توجہ دیجئے، میں ان کا مطلب بیان کرتا ہوں۔

﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾[2] بے شک خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل

---

۱. سورہ مبارکہ انعام: آیت ۱۳

۲. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۵۸

کو پلٹا دو۔

﴿وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ، حکومت اور قضاوت کرو تو عدل و انصاف کے مطابق کرو۔

﴿إِنَّ اللهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ إِنَّ اللهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾ بے شک پروردگار تمہیں بہترین چیز کی نصیحت کرتا ہے کہ بے شک پروردگار سننے اور دیکھنے والا ہے

پس وہ تمہیں جس چیز کا حکم دیتا ہے اس کی بنیاد، اس کا کامل سننا، جاننا اور ہمہ گیر علم و دانش کا ہونا ہے۔ کیونکہ وہ تمہاری اندرونی حاجات و ضروریات سے بھی باخبر ہے اور تمہارے مستقبل پر بھی نظر رکھتا ہے، لہٰذا تمہیں جس چیز کی ضرورت ہے، وہ تمہیں فراہم اور عطا کرتا ہے۔

یہ پہلی آیت کہ جس میں امانت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل کے حوالے کرو اور یہ درحقیقت دوسری آیت کے لیے زمین ہموار کرنا ہے۔

ہمیں یہ بات ذہن نشیں رکھنی چاہیے کہ امانت فقط یہ نہیں ہے کہ میں آپ کو ایک روپیہ دوں اور آپ مجھے وہ ایک روپیہ واپس لوٹا دیں۔ امانت کے اہم‌ترین مظاہر اور مصادیق میں یہ بھی ہے کہ انسان اس شے کو جو لوگوں کے درمیان خدا کی ہے اس کے اصل مقام اور اس کے اہل کے حوالے کر دے۔ اطاعت الٰہی جو انسان کا خدا کے ساتھ میثاق اور معاہدہ ہے، اس پر صحیح صحیح عمل ہونا چاہیے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ خدا کی اطاعت کرے اور جس کی اطاعت کا خدا نے حکم دیا ہے اس کی اطاعت کرے۔ یہ امانت داری کا بہترین مصداق ہے۔

بعد والی آیت میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾[1] اے ایمان لانے والو! ﴿أَطِيعُوا اللهَ﴾ خدا کی اطاعت کرو، ﴿وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ اور خدا کے رسول کی اطاعت کرو، ﴿وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تمہارے درمیان صاحبِ امر ہیں۔

یہاں دوسرے نظریات اور تصورات پر اسلامی نظریے کے امتیاز کی وجہ اور ان سے اس کے محلِ اختلاف کا پتا چلتا ہے۔ اسلامی نظریہ یہ نہیں کہتا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب حکومت کی ضرورت نہیں رہے گی اور یہ کسی ایسے دن کی پیش گوئی نہیں کرتا جس دن معاشرے میں حکومت نہیں ہوگی۔

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۵۹

جبکہ بعض دوسرے مکاتب، ایک ایسے دن کی پیش گوئی کرتے ہیں جب معاشرہ ایک آئیڈیل معاشرہ بن جائے گا اور اس آئیڈیل معاشرے کی ایک خصوصیت یہ ہو گی کہ اس میں کوئی حکومت نہیں ہو گی۔ لیکن اسلام ایسی کوئی پیش گوئی نہیں کرتا۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اس کی اجتماعی حیات کے لیے قانون کا ایک منبع ہونا لازمی ہے۔ صرف قانون کا ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا فرد بھی ہونا چاہیے جو اس قانون کا اجرا کرے اور اس کے صحیح صحیح نفاذ پر نظر رکھے؛ ایسے فرد کو ہی ﴿أُولِي الْأَمْرِ﴾ کہتے ہیں۔

لیکن کیا اولی الامر سے مراد مطلق اولی الامر ہے اور وہ جو بھی فرمان صادر کرے، وہ درست ہے؟ بعض دفعہ ہوتا یہ ہے کہ ایک ہی جگہ دو افراد ایک دوسرے کے برعکس فرمان جاری کرتے ہیں، کیا اس صورت میں یہ دونوں اولی الامر ہوں گے؟ بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ایک انسان ایسا فرمان جاری کرتا ہے جو عقل کے برخلاف ہے اور عقل و خرد اس حکم کی نفی کرتی ہے۔ کیا پھر بھی ایسا فرمانروا اولی الامر ہو گا؟! یہ وہ مقام ہے جہاں ہمارے اور اہل سنت کے طرزِ فکر کے درمیان ایک بنیادی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اولی الامر اور فرمانروا ایسے شخص کو ہونا چاہیے جو خدا کے فراہم کردہ معیارات پر پورا اترتا ہو، جبکہ اہلِ سنت عملی طور پر اس قسم کی شرط کو شرط نہیں سمجھتے اور اس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ لوگوں کے درمیان مشہور یہ ہے کہ جو بھی حکمران بن جائے، وہ ان کے لیے محترم اور معتبر ہے۔

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾

پس اگر کسی چیز میں تنازع اور اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو، اگر تم خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی تمہارے حق میں بہتر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے۔

یہ آیت لائق حکمرانوں کی حکمرانی کے اچھے نتائج اور برے حکمرانوں کی حکمرانی کے برے نتائج کی جانب لوگوں کو متوجہ کرتی ہے۔ بعد والی آیت میں اس فرمان سے منہ موڑنے والے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾[1] کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت ٦٠

دیکھا جن کا خیال یہ ہے کہ وہ آپ پر اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہیں، جبکہ وہ ایسے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں جو خدا پر ایمان کے منافی ہیں۔ وہ کیا ہے؟

﴿يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ﴾ اور اس کے باوجود چاہتے ہیں کہ طاغوت سے فیصلہ کرائیں۔ یعنی اپنے معاملات کے حل اور ان کے بارے میں فیصلوں کے لیے طاغوت سے رجوع کریں، طاغوت سے رائے لیں، اس سے حکم حاصل کریں اور اس کی رائے کے مطابق زندگی بسر کریں۔ ان لوگوں کا یہ عمل ایمان کے منافی ہے۔

﴿وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ﴾ جبکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت کا انکار کریں۔

﴿وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ انہیں گمراہی میں دور تک کھینچ کر لے جائے۔

ہمارے خیال میں یہاں شیطان سے مراد کوئی اور چیز نہیں بلکہ خود طاغوت ہے۔

یہ لوگ طاغوت کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور اس بات سے غافل ہیں کہ یہ شیطان جسے قرآن کریم میں طاغوت قرار دیا گیا ہے، انہیں راہِ راست سے دور کرتا ہے اور انہیں گمراہی کی وادیوں میں دھکیل دیتا ہے۔ شیطان انہیں راہِ راست سے اس قدر دور کر دیتا ہے کہ پھر ان کا اس پر پلٹ کر آنا کوئی آسان کام نہیں رہتا بلکہ راہِ راست اور راہِ ہدایت پر واپس آنے کے لیے انہیں بہت زیادہ کوشش اور جدوجہد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ستائیسویں نشست

غیر خدا کی ولایت

۲۸ رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری	۱۹۷۴-۱۰-۱۵

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۞ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۞ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ﴾

(سورہ نحل/۹۸-۱۰۰)

آج جو نکتہ پیش نظر ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی خدا کی ولایت قبول نہ کرے اور غیر خدا کی فرمانروائی میں چلا جائے، تو پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسے آدمی کے بارے میں کیا حکم ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ اس عمل کو کیا کہیں گے؟ اور تیسری بات یہ ہے کہ اس عمل کا نتیجہ کیا ہوگا؟

قرآن کریم، خدا کی ولایت کے سوا ہر ولایت کو طاغوت کی ولایت قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جو کوئی بھی خدا کی ولایت کے تحت نہ ہو،وہ طاغوت کی ولایت کے تحت ہے۔

لفظ طاغوت کا مادہ طغیان ہے۔ یعنی سرکشی کرنا اور انسان کا قدرتی اور فطری زندگی کے دائرے سے باہر نکل جانا۔ مثلاً فرض کیجئے کہ انسان حصولِ کمال کے لیے پیدا ہوا ہے، اب جو کوئی انسان کو کامل ہونے سے باز رکھے، وہ طاغوت ہے۔

فرض کریں کہ انسانوں پر واجب ہے کہ وہ خدائی دستور کے مطابق زندگی بسر کرے۔یہ ایک فطری، طبیعی اور انسانوں کی سرشت کے مطابق بات ہے۔ اب اگر کوئی انسانوں کی نشوونما اس طرح کرے، ان کے ساتھ ایسا عمل کرے اور ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے کہ وہ خدائی دستور کی بجائے کسی اور آئین کے تابع زندگی بسر کریں تو وہ طاغوت ہے۔

انسان کو اپنا وجود مفید اور ثمر آور بنانے کے لیے ہمیشہ جدوجہد اور سعی و کوشش میں مصروف رہنا چاہیے، لٰہذا ہر وہ عمل جو انسان کو غیر سنجیدگی، سستی، کاہلی، عیاشی اور عافیت طلبی کی ترغیب دے، وہ طاغوت ہے۔

پس طاغوت اسمِ خاص نہیں ہے اور بعض لوگوں کا یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ طاغوت ایک بت کا نام ہے۔ ہاں، یہ ایک بت کا نام ضرور ہے، لیکن یہ بت کوئی معین بت نہیں ہے۔ کبھی یہ بت خود آپ ہوتے ہیں، کبھی آپ کا روپیہ پیسہ ہوتا ہے، کبھی یہ آپ کی راحت پسندی کی زندگی ہوتی ہے، کبھی یہ بت آپ کی خواہش ہوتی ہے، کبھی یہ بت وہ شخص ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں آپ اپنا ہاتھ دے کر اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں، اپنا سر جھکا دیتے ہیں تاکہ وہ جہاں چاہے آپ کو لے جائے۔ اس بنا پر جو کوئی خدا کی ولایت سے خارج ہو گیا وہ یقیناً طاغوتی و شیطانی ولایت کے تحت چلا گیا ہے۔

شیطان، طاغوت اور طاغوت، شیطان ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ﴾[1] اہلِ ایمان، راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ﴾ اور کفار، طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے:

﴿فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا﴾ لٰہذا تم شیطان کے ساتھیوں سے جہاد کرو، بے شک شیطان کا مکر و فریب بہت کمزور ہوتا ہے۔

اس آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ شیطان کی جگہ طاغوت اور طاغوت کی جگہ شیطان کا نام لیا گیا ہے۔ پس شیطان ہر وہ عنصر ہے جو آدمی کو اس کے وجود کے باہر سے شرارت آمیز اور فساد انگیز کاموں، انحطاط، تسلیم، ذلت، ظلم، بدی اور گمراہی پر ابھارتا ہے۔

شیاطین انسانوں میں بھی ہیں اور جنوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ایسے شیاطین بھی ہیں جو عزیز رشتے داروں، عورتوں اور آباؤ اجداد سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیطان کا ایک مصداق اور نمونہ ابلیس ہے، جس نے آدم صفوۃ اللہ کے خلاف پرچم بلند کیا اور وہ باتیں کیں جن کا ذکر ہم سنا کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر ولایت الٰہی کے سوا ہر ولایت شیطانی اور طاغوتی ولایت ہے۔

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۷۶

ایک ایسا شخص جو حقیقی ولی کی حاکمیت میں زندگی بسر نہیں کرتا، اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ طاغوت اور شیطان کی حاکمیت میں زندگی گزار رہا ہے۔

ممکن ہے آپ پوچھیں کہ شیطان اور طاغوت کی حاکمیت میں زندگی بسر کرنے اور اس کے احکام و فرامین پر سر جھکا دینے میں کیا خرابی ہے؟ قرآن مجید اس بارے میں ہمیں کئی ایک جواب دیتا ہے۔ پہلا جواب یہ ہے کہ اگر آپ نے شیطان کی ولایت قبول کی تو شیطان آپ کے وجود میں پائی جانے والی تمام تعمیری، تخلیقی اور مفید قوتوں پر مسلط ہو جائے گا۔ اگر آپ نے شوق و رغبت کے ساتھ شیطان اور طاغوت کی حاکمیت کا طوق اپنے گلے میں پہن لیا، تو پھر آپ اس سے نجات حاصل نہ کر سکیں گے، چاہے آپ کے وجود میں کتنی ہی تعمیری اور تخلیقی قوتیں اور صلاحیتیں پائی جاتی ہوں، آپ پر طاغوت اور شیطان قابض ہوجائے گا۔ جب ایسا ہوگا تو پھر وہ آپ کے فائدے میں نہیں سوچے گا، کیوں کہ طاغوت اور شیطان کے نزدیک آپ کے فائدے کی کوئی اہمیت نہیں ہے، شیطان کو اپنی ذات سے غرض ہے، اپنی مصلحتوں سے کام ہے، اپنے راستے سے غرض ہے۔ اگر آپ اس راستے اور ان مصلحتوں کی خاطر قربانی کا بکرا بنیں تو بنیں۔ آپ گمراہ ہوتے ہوں تو ہوں، وہ شیطان ہے، قدرت اس کے اختیار میں ہے، آپ نے اپنے آپ کو اس کے ہاتھ میں دے دیا ہے، وہ جہاں چاہے گا آپ کو کھینچ کر لے جائے گا۔

سورۂ نساء کی درج ذیل آیت انتہائی قابل توجہ اور غور و فکر کے لائق ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى﴾۔[1]

جو کوئی بھی راہ حق واضح ہونے کے بعد، رسولِ خدا کی مخالفت کرے گا،پیغمبر سے جدا ہوگا اور اپنی راہ کو راہِ نبوت (وہی راہ جس کے بارے میں ہم نے پہلے آپ کو بتایا ہے) سے جدا کر لے گا اور مومنین اور اسلامی معاشرے اور ایمانی معاشرے سے ہٹ کر کوئی اور راستہ اختیار کرے گا، وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے گروہ سے علیحدہ کر لے گا۔ پھر ہم اسی طوق کو جسے خود اس نے اپنی گردن میں ڈالا ہے، اس کی گردن میں اور مضبوط کردیں گے۔ وہی ولایت جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں قبول کیا ہے، ہم اسے وہیں پھنسا دیں گے۔ یہ ہمارا طریقہ کار ہے، یہ قانونِ خلقت ہے۔ یہ اِس دنیا کے لیے ہے، اُس

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت۱۱۵

دنیا کے لیے کیا ہے؟ کیونکہ آیۂ قرآن ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾[1] کے مطابق تم نے اپنی لگام شیطان کے ہاتھ میں دے دی ہے، پس یہ لگام شیطان ہی کے ہاتھ میں رہے گی، یہ خدا کی سنت ہے یا قانونِ خلقت ہے۔

اس آیت میں یہاں تک دنیا سے متعلق تھا، آگے چل کر آیت اُس دنیا (آخرت) کے بارے میں کہتی ہے: ﴿وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾[2] یہاں سے وہ سیدھا دوزخ میں جائے گا اور پروردگار کے قہر اور خدا کے دائمی عذاب کا مزا چکھے گا۔

جب انسان تاریخ پر نظر دوڑاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ بالکل ایسا ہی ہے۔ یہ بات بہت اہم اور انتہائی اہم ترین اجتماعی مسائل میں سے ہے۔

کوفہ کا شمار تاریخ اسلام کے انتہائی عجیب شہروں میں ہوتا ہے۔ آپ کے ذہن میں کوفہ سے متعلق کئی قسم کی باتیں ہوں گی۔ اہلِ کوفہ نے امیر المومنینؑ کا ساتھ دیتے ہوئے متعدد جنگوں میں آپؑ کے ہمراہ شرکت کی۔یہ جنگِ جمل میں شامل رہے، انہوں نے جنگِ نہروان میں حصہ لیا، جنگِ صفین میں بھی کوفہ کے اطراف کے قبائل،یہاں کے جنگجو افراد اور بعض دوسرے قبائل شامل تھے۔

پھر یہی کوفی تھے جن سے امیر المومنینؑ شکوہ کیا کرتے تھے۔ آپؑ ان سے گلہ کیا کرتے تھے کہ جب میں تم سے جنگ کے لیے نکلنے کو کہتا ہوں تو تم کیوں نہیں نکلتے ہو۔ پھر یہی شہر تھا جس کی ممتاز شخصیات نے حسین بن علی علیہ السلام کے نام خطوط لکھے کہ «إِنَّهُ لیس علینا امام» ہمارا کوئی امام اور پیشوا نہیں ہے، ہمارا کوئی حاکم و رہنما نہیں ہے، اور اب جبکہ خدا نے اس طاغوت کو نابود کر دیا ہے، آپ چلے آئیے۔ سلیمان بن صرد، حبیب بن مظاہر، مسلم بن عوسجہ وغیرہ جیسے یہ لوگ سچ کہہ رہے تھے۔

پھر یہی اہلِ کوفہ تھے جو ایک انتہائی غیر مساوی جنگ میں حسینؑ بن علیؑ کے مقابل صف آرا ہوئے اور کربلا کا المیہ وجود میں آیا۔

کچھ ہی عرصے بعد انہی لوگوں کے ہاتھوں ایک ایسا تاریخی واقعہ رونما ہوا کہ جس کا شمار تاریخ اسلام کے انتہائی نادر اور پُرشکوہ واقعات میں ہوتا ہے۔ اور وہ توابین کا واقعہ ہے۔ ایک جگہ عظیم انسانی مظاہر کا

---

۱. سورہ مبارکہ رعد: آیت ۱۱۔ اور خدا کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدل لے۔

۲. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۱۱۵۔ اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے جو بدترین ٹھکانہ ہے۔

اظہار کرنے کے اعتبار سے ہر طرح کے حیران کن جذبات ہیں اور ایک جگہ اہل کوفہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے سستی، کمزوری اور بزدلی کا مظاہرہ کیا۔

اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا ان افراد کی دو روحیں اور دو چہرے تھے؟ کیا اہلِ کوفہ منافق تھے؟!

کوفہ وہ شہر ہے جس کے افراد کی تربیت امیر المومنینؑ کے متین اور بلیغ کلمات کے سائے میں ہوئی ہے، آپؑ ہی نے ان کی شخصیتوں میں نکھار پیدا کیا ہے، لہٰذا تاریخ تشیع کے اکثر عظیم اور جری افراد اسی شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی تعداد مدینہ سے تعلق رکھنے والے افراد سے بھی زیادہ ہے۔ اس کی وجہ امیر المومنینؑ کی (مدت خلافت کے دوران) چند سالہ تعلیمات اور تلقینات ہیں۔ امیر المومنین حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ جیسی ہستی کا اس شہر پر حکومت کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ کوفہ کو شیعیت کے گہوارے اور شیعی خصوصیات اور فضیلتوں کی زادگاہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ البتہ ہر وہ مقام جو اعلیٰ صفات اور فضیلتوں کی جائے پیدائش ہو، ضروری نہیں کہ وہاں رہنے والے تمام افراد ان صفات کے مالک، با فضیلت اور آئیڈیل ہوں۔

ہمیشہ ہی جوش و خروش سے بھرپور نظر آنے والے معاشرے میں لوگوں کا صرف ایک طبقہ معاشرے کے اس جوش و خروش کا ترجمان ہوتا ہے۔

کوفہ میں بھی انتہائی اچھے لوگوں پر مشتمل صرف ایک گروہ تھا، وگرنہ وہاں کے عام افراد دوسری جگہوں کے لوگوں ہی کی طرح تھے، ایسا نہ تھا کہ ان سے بدتر ہوں، مشہد کے لوگوں کی طرح، تہران کے لوگوں کی طرح، اصفہان کے لوگوں کی طرح، مدینہ کے لوگوں کی طرح، دوسرے شہروں کے لوگوں کی طرح۔ لیکن مملکت اسلامی کے اس گوشے (یعنی کوفہ) میں یہ مختصر گروہ اس زمانے کی حکومتوں کے لیے خوف اور وحشت کا سبب تھا، اس لیے وہ حکومتیں ہمیشہ بدترین عاملوں، گھٹیاترین گورنروں، پست‌ترین آدمیوں اور اپنے نوکروں اور جلادوں کو اس شہر میں تعینات کیا کرتی تھیں اور وہ لوگوں کے خلاف ظالمانہ طرزِ عمل اختیار کر کے، زہریلا پروپیگنڈا کر کے اور ان کے درمیان فقر اور بیچارگی کو رواج دے کر اس شہر کے لوگوں سے ایسا سلوک کرتے تھے کہ وہ لوگ لاشعوری طور پر، بے سوچے سمجھے انتہائی شوق و ذوق کے ساتھ برائیوں اور پستیوں کی طرف قدم بڑھائیں۔

اہلِ کوفہ کے ساتھ یہ سلوک اس لیے کیا جاتا تھا کہ دوسرے شہروں کے برخلاف یہاں ایک مبارز اور

ممتاز گروہ پایا جاتا تھا اور ان حکومتوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ معاون و مساعد خصوصیات جن سے یہ پاک طینت، بزرگ منش اور مجاہد گروہ فائدہ اٹھا سکتا تھا، انہیں وہاں کے لوگوں میں سے مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا وہ زہریلا پروپیگنڈا کیا کرتے تھے، لوگوں کو دباؤ اور گھٹن کے ماحول میں رکھتے تھے، انہیں دنیاوی اعتبار سے کمزور کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ طرح طرح کے ذرائع اختیار کر کے شہر کوفہ کے لوگوں پر دباؤ ڈالتے تھے۔ دوسرے شہروں کے یہ حالات نہ تھے اور یہی وجہ تھی کہ ظالم و جابر اور فریب کار حکومتوں کی سرگرمیوں کے زیرِ اثر کوفہ سے تعلق رکھنے والے عوام الناس کے ہاتھوں ناشائستہ اعمال انجام پاتے تھے۔ البتہ ان برائیوں کی بنیاد یہ نہیں تھی کہ اس شہر کے لوگ ہی برے تھے۔ بہرحال یہ کوفہ کے بارے میں ایک مختصر وضاحت تھی۔

اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان جانتا تھا کہ کوفہ کے انقلابی اور جنگجو لوگوں سے حجاج بن یوسف کے سوا کوئی اور نہیں نمٹ سکتا۔ لہٰذا اس نے اپنے جلادترین اور پست‌ترین نوکر حجاج بن یوسف کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ حجاج بن یوسف آدھی رات کے وقت شمشیر زن افراد کے ایک گروہ کے ساتھ کوفہ میں داخل ہوا۔ کسی کو اس کی آمد کی خبر نہ ہو سکی۔ کوفہ کے لوگوں نے اپنے سابقہ حاکم کو بظاہر کوفہ سے باہر نکال دیا تھا یا اسے عضوِ معطل بنا دیا تھا۔ وہ ایک سو یا تیس چالیس افراد شمشیر زن اپنے ہمراہ لایا تھا۔ اس نے مسجد کہ جس سے عبادت گزاروں، نمازیوں، تہجد گزاروں اور مقدس افراد کے راز و نیاز کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، کے اطراف میں اپنے افراد کھڑے کیے۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے اس نے اپنے غلاموں اور نوکروں کو ضروری ہدایات دیں۔ ہر ایک کو ایک مخصوص مقام پر متعین کیا اور خود اس انداز سے مسجد میں داخل ہوا کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے، پھر بغیر کسی کو متوجہ کیے، اچانک لوگوں کے درمیان سے اٹھا اور منبر پر جا بیٹھا۔ [۱]

کیونکہ مسجد کوفہ بہت بڑی ہے، اس لیے پہلے تو لوگ متوجہ ہی نہ ہوئے۔ لیکن رفتہ رفتہ بعض لوگوں نے دیکھا کہ عجیب حالت بنایا ہوا ایک شخص خاموشی کے ساتھ منبر پر بیٹھا ہوا ہے۔

اس موقع پر حجاج نے سر پر سرخ رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی اور اس کا ایک سرا کھول کر اسے ڈھاٹے کی سی صورت میں ناک تک لپیٹ رکھا تھا۔ اس حالت میں اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی

---

۱. الکامل فی التاریخ، سنہ ۷۵، ذکر ولایۃ الحجاج بن یوسف العراق

تھیں اور وہ ایک عجیب سی چیز لگ رہا تھا۔
تصور کیجئے تلوار سے مسلح ایک شخص، سرخ رنگ کی عبا اور پگڑی پہنے ہوئے اس انداز سے مسجد کوفہ کے منبر پر خاموش بیٹھا ہے۔
ذرا غور کیجیے آیتِ قرآن کیا کہہ رہی ہے: ﴿نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى﴾۔ وہ شخص جو ایمان اور مومنین کی راہ سے ہٹے گا، ہم اس کی گردن میں پڑے طوق کو اور مضبوطی سے کَس دیں گے۔
تم جو مسلمان تھے اور تم نے دیکھا تھا کہ تمہاری مسجد کے منبر پر ایک ایسا آدمی بیٹھا ہوا ہے جسے تم نہیں جانتے۔ آخر تم کیوں یہ دیکھنے کے باوجود خاموش بیٹھے رہے؟ تمہیں چاہیے تھا کہ قریب جا کر اس سے پوچھتے کہ تم کون ہو؟ اپنا تعارف کراؤ۔ اسی طرح دوسرا آدمی، تیسرا آدمی کرتا اور سب کے سب افراد اس سے یہی سوال پوچھتے۔ اگر تمام لوگ اس سے یہ سوال کرتے تو صورتحال بدل جاتی۔ لیکن ان لوگوں نے سستی کا مظاہرہ کیا، بے حوصلہ ہونے اور بزدل ہونے کا مظاہرہ کیا اور اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ وہ خود کوئی گفتگو کرے۔
جب حجاج نے دیکھا کہ تمام افراد کا رخ اسی کی طرف ہے، تو بولا: میرا خیال ہے کہ اہل کوفہ مجھے پہچانتے نہیں ہیں۔
لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے نہیں پہچانتے تھے۔ حجاج نے کہا: چلو، میں خود تم سے اپنا تعارف کرائے دیتا ہوں۔ اس نے اپنے سر سے پگڑی اتاری۔ کیونکہ حجاج ایک مرتبہ پہلے بھی کوفہ آچکا تھا، لہٰذا ایک دو افراد نے کہا کہ ہمارے خیال میں یہ حجاج ہے۔ اور پھر حجاج، حجاج کی سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ جب ان پر واضح ہو گیا کہ ان کے سامنے منبر پر حجاج بیٹھا ہے، تو وہ خوف اور دہشت کا شکار ہو گئے۔ یہ دیکھ کر حجاج نے کہا: ہاں، تم لوگوں نے صحیح پہچانا، میں حجاج ہوں۔
لوگوں پر رعب طاری ہو گیا، ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہ سوچا کہ حجاج میری ہی طرح کا ایک انسان ہے، بس فرق یہ ہے کہ وہ اوپر جا بیٹھا ہے اور میں نیچے بیٹھا ہوں، جو کچھ اس کے پاس ہے وہ میرے پاس بھی ہے۔ لوگ بزدلی کا شکار ہو گئے۔
حجاج نے کہا: اے اہلِ کوفہ! میں تمہاری گردنوں پر ایسے سر دیکھ رہا ہوں جن کو پکے ہوئے پھلوں کی

طرح اتارے جانے کا وقت آگیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ان تنوں سے کچھ سر جدا ہونے چاہئیں۔
لوگ یہ کھوکھلی باتیں سن کر مزید مرعوب ہو گئے۔ آخر حجاج ایٹم بم تو لے کر کوفہ نہیں آیا تھا؟اگر اس کے پاس ایٹم بم ہوتا بھی تو وہ اسے چلا تو نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ اسے چلاتا تو کوئی باقی نہ بچتا جس پر وہ حکومت کرے۔ ضروری تھا کہ کچھ لوگ زندہ رہیں، سب کو تو نہیں مار ڈالنا تھا۔ اگر وہ سب کو مار ڈالتا، تو پھر حکومت کس پر کرتا؟ در و دیوار پر تو حکومت ہو نہیں سکتی۔ لیکن لوگوں نے یہ بات نہیں سوچی۔
حجاج یہ جملہ کہنے کے بعد کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ گردنوں پر موجود کچھ سروں کو اتار لینے اور انہیں تن سے جدا کر دینے کا وقت آپہنچا ہے، بولا:اب میں فیصلہ کروں گا کہ کس کا سر اتارنا چاہیے۔ اس نے اپنے غلام کو آواز دی۔ اس کا غلام کھڑا ہوا۔ حجاج نے کہا کہ ان لوگوں کو امیر المومنین کا خط پڑھ کر سناؤ۔ آپ جانتے ہیں کہ اس نے عبد الملک بن مروان کو امیر المومنین کہا تھا۔ غلام نے عبد الملک بن مروان کا خط کھولا اور اسے پڑھنا شروع کیا۔ اس خط کا آغاز اس جملے سے ہوا تھا:
بِسْم اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحیم، مِن اَمِیْرِالْمُؤمِنِیْن عَبْدِ الْمَلِكِ ابنِ مَروان الی اَھلِ الْكُوْفَةِ۔ یَا اَھْلَ الْكُوْفَة سَلامٌ عَلَیْكُمْ۔
بسم اللہ الرحمن الرحیم، امیر المومنین عبد الملک بن مروان کی جانب سے اہل کوفہ کے لیے۔ اے اہل کوفہ! تم پر سلام ہو۔
جب غلام یہاں تک پڑھ چکا، تو اچانک حجاج نے اس کی طرف رخ کیا اور کہا:خاموش ہو جاؤ، چپ ہو جاؤ۔ اس کے بعد اس نے اہل کوفہ کو مخاطب کیا اور کہا:تم بہت بدتہذیب ہو گئے ہو، امیر المومنین تمہیں سلام کرتے ہیں اور تم ان کے سلام کا جواب نہیں دیتے؟ اے غلام! دوبارہ پڑھو۔
غلام نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا: بِسْم اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحیم، مِن اَمِیْرِالْمُؤمِنِیْن عَبْدِ الْمَلِكِ ابنِ مَروان الی اَھلِ الْكُوْفَةِ۔ یَا اَھْلَ الْكُوْفَة سَلامٌ عَلَیْكُمْ
یہ سنتے ہی پوری مسجد سے صدا بلند ہوئی: وَ عَلیٰ اَمِیْرِالْمُؤمِنِین سَلَامٌ۔
سلام کا یہ جواب سن کر حجاج کے لبوں پر خوشی کے اظہار سے بھرپور ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے دل میں کہا کہ بس کام ہوگیا اور واقعاً اہل کوفہ کا کام تمام ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے حجاج کو قبول

کر کے در اصل اپنا کام تمام کر لیا تھا۔

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى﴾

اب جبکہ تم نے اس کا جواب دے دیا اور اس کی تائید کر دی ہے، تو حجاج تمہارا حکمران ہے، تم نے حجاج کے لیے دروازہ کھول دیا ہے۔ خدا تو معجزے کے ذریعے حجاج کو ختم کر کے اس کی جگہ امام زین العابدینؑ کو نہیں بٹھائے گا۔ اب حجاج تمہارا حکمران ہو گیا اور جب تک تم حجاج سے نفرت کا اظہار کر کے اسے حکمرانی سے بے دخل نہ کر دو، اس وقت تک تمہاری پوری زندگی، سوچ اور روح حجاج کے اختیار میں رہے گی۔ یہ کائنات کی سنت ہے، یہ سنتِ تاریخ ہے۔

آپ کے سامنے آیات کے معنی ذکر کرتا ہوں۔

﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾[1] جب قرآن کو پڑھ لیا تو شیطان مردود کے ضرر سے خدا کی پناہ طلب کیجیے۔

اب جب کہ تم نے قرآن کو پڑھ لیا ہے اور معارف اسلامی کو سیکھ لیا ہےتو اپنے آپ کو شیطان کے ضرر سے خدا کی امان میں لے جاؤ، شیطان تو چاہتا ہے کہ تم قرآن کو نہ جانو اور نہ اسے سمجھو۔ یعنی اس بات کی کوشش کرو کہ تمہیں حاصل ہونے والی قرآن کی معرفت، شیطان تم سے چھین نہ لے اور تم پر راہ عمل اور اس کو مزید سمجھنے کے راستے بند نہ کر دے۔ لہٰذا شیطان مردود کے شر سے بچنے کے لیے خدا کی پناہ میں چلے آؤ۔

﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾[2] بے شک فساد پیدا کرنے والا شیطان ہرگز ان لوگوں پر غلبہ نہیں پا سکتا جو صاحبانِ ایمان ہیں اور جن کا اللہ پر توکل اور اعتماد ہے۔

وہ لوگ جو اپنے آپ کو خدا کی ولایت کے زیر سایہ رکھتے ہیں اور ولایتِ خدا کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں، شیطان ان پر مسلط نہیں ہو سکتا۔

﴿إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ﴾[3] بے شک شیطان کا غلبہ صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اس کی ولایت قبول کرتے ہیں۔

---

۱. سورہ مبارکہ نحل: آیت ۹۸

۲. سورہ مبارکہ نحل: آیت ۹۹

۳. سورہ مبارکہ نحل: آیت ۱۰۰

جن لوگوں نے اپنے گلے کی رسی خود اپنے ہاتھوں سے اس کے حوالے کی ہے: ﴿إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ﴾ یعنی شیطان کا غلبہ اور تسلط صرف ان ہی لوگوں پر ہوتا ہے اور اس کا بس فقط ان ہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کی ولایت قبول کر لیتے ہیں: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ﴾ اور ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اللہ کے بارے میں شرک کرتے ہیں۔

اور جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ﴾ ایسا شخص جو پیغمبر کے ساتھ لڑائی کرے اور ان سے جدا ہو، ﴿مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى﴾ اپنے سامنے راہِ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد، ﴿وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ اور مومنین کی راہ کے علاوہ کسی اور راہ کی پیروی کرے، ﴿نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى﴾ تو اس نے جس چیز اور جس شخصیت کی ولایت کو قبول کیا ہے، ہم اسی کو اس کا ولی اور فرمانروا بنا دیتے ہیں، ﴿وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾ اور اسے دوزخ میں اٹھا پھینکتے ہیں اور یہ کیسا برا انجام ہے، ﴿إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ﴾[1] خدا اپنا شریک بنانے والے شخص کو معاف نہیں کرتا۔

یہاں توحید اور شرک کے معنی کی جانب واپس آتے ہیں، تاکہ دیکھیں کہ شرک کیا ہے؟ توحید کیا چیز ہے؟ اور جس گناہ سے خدا درگزر نہیں کرتا وہ کیا ہے؟

﴿إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ﴾ خدا کسی ایسے شخص کو معاف نہیں کرتا جس نے ولایت میں شرک کو قبول کیا ہوا ہو، ﴿وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ لیکن اگر وہ چاہے تو شرک سے کمتر اور اس سے نچلے درجے کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ البتہ خدا اس شخص کی مغفرت کر دے گا جو توبہ اور تلافی کرے اور خدا کی طرف واپس پلٹ آئے ﴿وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ اور جو کوئی خدا کا شریک قرار دے گا وہ راہِ ہدایت سے بہت دور اور گمراہ ہو گیا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی بیابان میں راستے سے بھٹک جاتے ہیں، لیکن صحیح راستے سے صرف ایک کلومیٹر دور ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ صحرا میں راستہ گم کر بیٹھتے ہیں اور مطلوبہ راستے سے دسیوں کلومیٹر دور چلے جاتے ہیں، اتنے دور کہ پلٹ کر آنا آسان کام نہیں رہتا، اور اس کے لیے بہت زیادہ کوشش اور ہوشیاری درکار ہوتی ہے، ایک مضبوط رہنما چاہیے ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے خدا

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۱۱۶

کے لیے شریک بنا لیا ہوتا ہے، وہ صراطِ مستقیم اور ہدایت کے سیدھے راستے سے بہت دور ہو جاتے ہیں، ﴿فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ بہت دور کی گمراہی سے دوچار ہو چکے ہوتے ہیں، ﴿إِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا﴾[۱] یہ لوگ خدا کے سوا جس کسی کو پکارتے ہیں، وہ بس چند عورتیں ہیں، ﴿وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَرِيدًا﴾ اور وہ سرکش اور نیکی و فضیلت سے عاری شیطان کے سوا کسی اور کو نہیں پکارتے۔

خدا کے دھتکارے ہوئے شیطان پر خدا کی لعنت ہے۔

﴿وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا﴾[۲] شیطان نے عہد کیا ہے اور کہا ہے کہ میں بندگانِ خدا میں سے ایک خاص حصے کو اپنا طرفدار بنا لوں گا۔ یعنی کچھ بندوں کو راہِ راست سے گمراہی کی طرف کھینچ لے جاؤں گا، ان کی عقل سلب کر لوں گا، ان کی بصیرت زائل کر دوں گا، انہیں تیری ولایت کی بجائے اپنی ولایت اور فرمانروائی میں لے آؤں گا، ﴿وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ﴾[۳] انہیں شدت کے ساتھ طولانی آرزوؤں اور تمناؤں کا اسیر کردوں گا۔

﴿وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ﴾ انہیں حکم دوں گا کہ وہ جانوروں کے کان کاٹ ڈالیں۔ یہ جاہلیت کی غلط رسوم میں سے ایک غلط رسم کی جانب اشارہ ہے۔ البتہ ممکن ہے اس جملے میں ایک بڑا راز اور رمز پوشیدہ ہو۔ یہ زمانۂ جاہلیت کی سنت تھی۔ قرآن مجید غیر الٰہی سنتوں، افکار، طریقوں اور رسموں کی علامت کے طور پر اس کا ذکر کرتا ہے۔

﴿وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللهِ﴾ قرآن کریم شیطان کی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگ جو میرے حکم کے تابع ہیں، میں انہیں حکم دوں گا کہ وہ الٰہی خلقت، فطرت اور سرشت میں رد و بدل کریں اور جن لوگوں کو میں تیری حکومت اور ولایت کے علاقے سے شکار کرکے اپنی ولایت کے ویرانے میں لے آؤں گا، انہیں حکم دوں گا اور انہیں اکساؤں گا کہ وہ خلقت اور فطرت الٰہی کو ترک کر دیں، اور جس راہِ عمل کو تو نے ان کے لیے مقرر کیا ہے اس سے دور ہو جائیں۔ میں ان کے لیے خلافِ فطرت قانون بناؤں گا اور ان کے سامنے خلافِ فطرت راستہ رکھوں گا، ایک ایسا راستہ جو انہیں انسان کی فطری منزل کے بجائے کسی اور منزل تک پہنچاتا ہے۔

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۱۱۷

۲. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۱۱۸

۳. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۱۱۹

یہ بات ذہن نشین رکھیے کہ اگر لوگ خداداد فطرت اور سرشت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیں تو شیطان انہیں اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا اس کے بعد خدا ہمیں اور آپ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّن دُونِ اللهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا﴾ جو کوئی خدا کی بجائے شیطان کی ولایت قبول کرے گا وہ کھلے نقصان میں رہے گا۔

﴿يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ﴾[1] شیطان ان سے وعدہ کرتا ہے اور انہیں طولانی آرزوؤں اور تمناؤں میں مبتلا کرتا ہے۔

﴿وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا﴾ اور شیطان جو بھی وعدے کرتا ہے وہ دھوکے، فریب اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۱۲۰

ولایت اور ہجرت

ولایت قبول کرنے کے بعد جن چیزوں کا سامنا ہو سکتا ہے، ان میں سے ایک چیز ہجرت ہے۔ کیونکہ اگر ہم نے خدا کی ولایت کو قبول کیا اور اس بات کو مان لیا کہ انسان کی تمام جسمانی، فکری اور روحانی قوتوں اور صلاحیتوں کو ولیِ الٰہی کی مرضی اور منشا کے مطابق استعمال ہونا چاہیے، مختصر یہ کہ انسان کو اپنے وجود کے تمام عناصر کے ساتھ بندۂ خدا ہونا چاہیے، نہ کہ بندۂ طاغوت تو ہمیں یہ بات بھی قبول کرنی پڑے گی کہ اگر کسی جگہ ہمارا وجود، ہماری ہستی اور ہماری تمام صلاحیتیں ولایت الٰہی کے تابع فرمان نہ ہوں، بلکہ طاغوت اور شیطان کی ولایت کے زیر فرمان ہوں تو خدا سے ہماری وابستگی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو طاغوت کی قید و بند سے آزاد کرائیں اور ولایت الٰہی کے پربرکت اور مبارک سائے تلے چلے جائیں۔ ظالم حاکم کی ولایت سے نکل کر عادل امام کی ولایت میں داخل ہو جانے کا نام ہجرت ہے۔

ایک انسان کو طاغوت اور شیطان کی ولایت کے تحت آنے سے کیوں بچنا چاہیے؟

اس سوال کا جواب ایک دوسرے سوال کے جواب سے وابستہ ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ فوراً اپنے ذہن میں اس سوال کا اس انداز سے تجزیہ و تحلیل کریں کہ آپ خود اپنے پاس موجود اسلامی اور مذہبی

تعلیمات اور معلومات کے مطابق اس کا جواب دے سکیں۔ اس کے بعد اگر آپ کا جواب اس جواب جیسا نہ ہوا جو ہمارے ذہن میں ہے اور ہمارے جواب سے مختلف ہوا، تب اس موضوع پر گفتگو کی گنجائش رہے گی۔

سوال یہ ہے کہ کیا طاغوت کی حکومت میں رہتے ہوئے مسلمان نہیں رہا جا سکتا؟

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک مسلمان، شیطان کی ولایت کے تحت زندگی بسر کرے، لیکن رحمان کا بندہ ہو؟

اس سوال کے دو اجزا ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم ان دونوں کا درست تجزیہ و تحلیل کریں اور دیکھیں کہ ان کے کیا معنی ہیں؟

پہلا جز یہ ہے کہ کوئی شخص شیطان کی ولایت کے تحت ہو۔ شیطان کی ولایت کے تحت ہونے کے کیا معنی ہیں؟

اگر ولایت کے ان معنی کو جو ہم نے آیاتِ قرآنی سے اخذ کیے ہیں ولایتِ شیطان کی عبارت کے مقابلے میں رکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ ولایتِ شیطان سے کیا مراد ہے؟

ولایتِ شیطان سے مراد یہ ہے کہ شیطان (انہی مجموعی معانی کے مطابق جو ہم نے بارہا بیان کیے ہیں) انسان کے وجود میں پائی جانے والی تمام توانائیوں، صلاحیتوں، تخلیقی قوتوں اور اعمال پر مسلط ہو اور انسان جو کچھ انجام دے وہ شیطان کے معین کردہ دستور کے مطابق ہو، انسان جو کچھ سوچے وہ اسی سمت میں ہو جس کا تعین شیطان نے کیا ہے۔

مجھے نہیں معلوم آپ نے سمندر سے شکار ہوتی مچھلیوں کو دیکھا ہے یا نہیں۔ کبھی کبھی ایک جال میں ہزاروں مچھلیاں پھنس جاتی ہیں، جنہیں بیچ سمندر سے کھینچ کر ساحل کی طرف لاتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی مچھلی یہ نہیں جانتی کہ اسے کہیں لے جایا جا رہا ہے، ہر ایک یہ تصور کرتی ہے کہ وہ خود اپنے اختیار سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ لیکن درحقیقت وہ بے اختیار ہوتی ہے، اس کی منزل وہی ہوتی ہے جس کی جانب جال کا مالک اور شکاری اسے لے جا رہا ہوتا ہے۔

جہالت پر مبنی غیر مرئی جال انسان کو اسی سمت کھینچتا ہے جس سمت اس جال کی رہنمائی کرنے والے چاہتے ہیں۔ اس نظام میں زندگی گزارنے والا انسان بالکل نہیں سمجھ پاتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنی دانست میں یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ سعادت اور کامیابی کی منزل کی طرف گامزن ہے،

جبکہ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جہنم کی طرف جا رہا ہے: ﴿جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾[۱] یہ ولایتِ طاغوت اور ولایتِ شیطان ہے۔

یہ ان دو عبارتوں میں سے پہلی عبارت تھی جن سے مل کر مذکورہ بالا سوال بنا تھا اور سوال یہ تھا کہ کیا طاغوت اور شیطان کی ولایت اور حکومت میں رہتے ہوئے مسلمان نہیں رہا جا سکتا؟

اجمالاً ہم نے طاغوت کی ولایت اور حکومت میں زندگی گزارنے کو سمجھ لیا ہے، یعنی یہ جان لیا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔

ان خصوصیات کے ساتھ کیا طاغوت کی حکومت کے تحت ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کی جا سکتی ہے؟ ذرا دیکھتے ہیں کہ دراصل مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے معنی کیا ہیں؟

مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے معنی ہیں انسان کے تمام وسائل، قوتوں اور صلاحیتوں کا مکمل طور پر خدا کے اختیار میں ہونا۔ اس کے مال و دولت اور اس کی تمام چیزوں کا خدا کے اختیار میں ہونا، اس کی جان کا خدا کے اختیار میں ہونا، اس کی فکر اور سوچ کا خدا کے اختیار میں ہونا، اس کی دن کی دوڑ دھوپ کا خدا کے اختیار میں ہونا، اس کا رات کو سونا خدا کے اختیار میں ہونا۔ کیا اس کی کوئی مثال موجود ہے؟ جی ہاں، اس حوالے سے ہمارے پاس معاشرے اور مدنیت کی صورت میں بھی مثال موجود ہے اور ایسے گروہوں کی مثال بھی موجود ہے جو طاغوتی نظاموں سے سرکشی اختیار کر کے نکلے اور خدا کی طرف ہجرت کی۔

پہلی مثال پیغمبر ﷺ کے زمانے میں مدینہ کے معاشرے کی ہے۔ مدینہ ایک خدائی معاشرہ تھا، وہاں جو قدم بھی اٹھتا راہِ خدا میں اٹھتا۔ وہاں اگر یہودی اور عیسائی بھی اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے تھے، تو ان کی زندگی بھی اسلامی زندگی تھی۔ اسلامی معاشرے میں عیسائی اور یہودی اہلِ ذمہ افراد بھی اسلام کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں اعمال کے لحاظ سے ایک شخص یہودی ہوتا ہے، لیکن معاشرے کا ایک رکن ہونے کے لحاظ سے اس مسلمان سے کہیں زیادہ مسلمان ہوتا ہے جو ایک جہالت پر مشتمل نظام کے تحت زندگی بسر کرتا ہے۔ زمانۂ پیغمبرؐ میں مال و دولت، نیزہ و تلوار، فکر اور سوچ، تمام انسانی اعمال، حتیٰ کہ جذبات و احساسات بھی راہِ خدا میں ہوتے تھے۔

---

۱. سورہ مبارکہ ابراہیم: آیت ۲۹

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے زمانے میں بھی کم و بیش یہی صورت حال تھی۔ اس لیے کہ امیر المومنینؑ حاکمِ الٰہی اور ولیِ خدا ہونے کے ناطے پیغمبرِ اسلامؐ سے مختلف نہ تھے۔ لیکن انہیں ایک بہت برا معاشرہ میراث میں ملا تھا، پیچیدگیاں اور مسائل میراث میں ملے تھے۔ اگر امیر المومنینؑ کی جگہ خود پیغمبرؐ اسلام بھی ہوتے اور پچیس سال بعد ایک مرتبہ پھر مسندِ حکومت پر جلوہ افروز ہوتے تو یقیناً انہی مشکلات کا سامنا کرتے جو امیر المومنینؑ کو درپیش تھیں۔

اور گروہی صورت کی مثال، طولِ تاریخ میں ائمہ اہل بیتؑ کے اردگرد موجود شیعوں کی ہے۔ شیعہ بظاہر طاغوتی نظام میں زندگی بسر کرتے تھے، لیکن باطن میں طاغوتی نظام کے یکسر برخلاف گامزن ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں بطور مثال اس گروہ کا نام لیا جا سکتا ہے جو حسین بن علیؑ کے ہمراہ تھا۔ ان لوگوں نے اس سیلاب کا مقابلہ کیا اور اس سیلابی ریلے کی مخالف سمت چلے جو انہیں اپنے ہمراہ بہا کر لے جانا چاہتا تھا۔ بنابریں تاریخ میں ہمارے پاس معاشروں اور گروہ؛ دونوں میں مثالیں موجود ہیں۔ لیکن عام افراد اور کلی طور پر ایک فرد کسی طاغوتی معاشرے میں زندگی بسر کرتے ہوئے مسلمان باقی نہیں رہ سکتا کہ کلی طور پر اس کا وجود، اس کے وسائل، اس کی قوتیں اور اس کی تمام تر صلاحیتیں احکام الٰہی کے تابع ہوں، ایسا ہونا ناممکن ہے۔

اگر ایک مسلمان طاغوتی ماحول اور طاغوتی نظام میں زندگی بسر کرے تو بہرحال اس کی اسلامیت کا ایک حصہ طاغوت کی راہ پر ہوگا، سو فیصد خدا کا بندہ نہیں ہو سکتا۔

اصول کافی جو شیعوں کی معتبرترین اور قدیم‌ترین کتابوں میں سے ہے، اس میں اس (درج ذیل) حدیث کو مختلف انداز سے نقل کیا گیا ہے بظاہر باب کا عنوان یہ ہے: «بَابٌ فِيمَنْ دَانَ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ بِغَيْرِ إِمَامٍ مِنَ الله»

امام علیہ السلام خدا کے قول (حدیث قدسی) کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خداوند متعال نے فرمایا: «لَأُعَذِّبَنَّ كُلَّ رَعِيَّةٍ فِي الْإِسْلَامِ دَانَتْ بِوَلَايَةِ كُلِّ إِمَامٍ جَائِرٍ لَيْسَ مِنَ اللهِ وَ إِنْ كَانَتِ الرَّعِيَّةُ فِي أَعْمَالِهَا بَرَّةً تَقِيَّةً وَ لَأَعْفُوَنَّ عَنْ كُلِّ رَعِيَّةٍ فِي الْإِسْلَامِ دَانَتْ بِوَلَايَةِ كُلِّ إِمَامٍ عَادِلٍ مِنَ اللهِ وَ إِنْ كَانَتِ الرَّعِيَّةُ فِي أَنْفُسِهَا ظَالِمَةً مُسِيئَةً»[1]

---

۱. کافی، کتاب الحجۃ، باب في من دان اللہ عز و جل بغیر إمام من اللہ، حدیث ۴

عجیب حدیث ہے، یہ حدیث کہتی ہے کہ وہ لوگ جو خدا کے ولی کی حکومت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں، اہلِ نجات ہیں، اگرچہ وہ اپنے انفرادی اور نجی افعال میں کبھی کبھار گناہوں میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو شیطان اور طاغوت کی حکومت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں وہ بدبخت اور عذاب کا شکار ہونے والے لوگ ہیں، اگرچہ وہ اپنے انفرادی اور شخصی کاموں میں نیکوکار اور عملِ صالح انجام دینے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ انتہائی عجیب بات ہے۔

ہم ہمیشہ اس حدیث کے مفہوم کی وضاحت میں ایک ایسی گاڑی کی مثال پیش کرتے ہیں جس میں آپ مثلاً نیشاپور جانے کے لیے سوار ہوں۔ اگر یہ گاڑی نیشاپور کی طرف چلے گی تو آپ لازماًاپنی منزل تک پہنچ جائیں گے اور اگر یہ طبس یا قوچان کی طرف جائے گی تو لازماً آپ اپنی منزل (نیشاپور) تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

اب اگر نیشاپور جانے والی گاڑی میں سوار مسافر ایک دوسرے کے ساتھ انسانی آداب کے ساتھ میل جول رکھیں گے تو کیا خوب اور اگر انسانی آداب اور نیکی و احسان کے ساتھ باہم میل جول نہیں رکھیں گے، تب بھی آخرکار نیشاپور پہنچ ہی جائیں گے۔ وہ اپنی منزل پر جا پہنچیں گے، چاہے انہوں نے راستے میں کچھ برے کام بھی کیے ہوں۔ ان برے کاموں کے بھی آثار و نتائج ظاہر ہوں گے، جنہیں برداشت کرنے پر وہ مجبور ہوں گے، لیکن منزل پر بہرحال پہنچ جائیں گے۔ اس کے برخلاف وہ گاڑی جسے آپ کو نیشاپور لے جانا چاہیے، وہ آپ کو اس کے بالکل برعکس سمت لے جائے، اگر اس گاڑی کے تمام افراد مؤدب ہوں، ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی احترام آمیز سلوک کریں، ایک دوسرے کے ساتھ خنداں پیشانی سے میل جول رکھیں اور یہ دیکھیں کہ گاڑی نیشاپور کی بجائے قوچان کی طرف جا رہی ہے، لیکن اس کے باوجود کسی ردِعمل کا اظہار نہ کریں، تو ٹھیک ہے کہ یہ لوگ بہت اچھے انسان ہیں، ایک دوسرے کے لیے انتہائی مہربان ہیں، لیکن کیا اپنے مقصد اور منزل پر پہنچ سکیں گے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔

پہلی مثال میں گاڑی کا ڈرائیور ایک امین انسان تھا، راستوں سے واقف تھا، «امامٌ من الله» تھا، جس نے انہیں منزلِ مقصود پر پہنچا دیا، اگرچہ وہ لوگ بداخلاق تھے: «وَ إِنْ کَانَتِ الرَّعِیَّةُ فِی أَنْفُسِهَا ظَالِمَةً مُسِیئَةً» جبکہ دوسری مثال میں گاڑی کا ڈرائیور راستے ہی سے واقف نہ تھا، امین نہیں تھا، خواہش نفس کا پجاری

تھا، مست تھا، راہ سے بھٹکا ہوا تھا، اسے قوچان میں کوئی کام تھا اور اس نے اپنے کام کو لوگوں کی خواہش پر مقدم رکھا۔ اس گاڑی میں سوار لوگ کسی صورت اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ اگرچہ یہ لوگ گاڑی کے اندر انتہائی مہربان اور خوش اخلاق ہوں: «وَإِنْ كَانَتِ الرَّعِيَّةُ فِي أَعْمَالِهَا بَرَّةً تَقِيَّةً» لیکن آخرکار عذابِ خدا کا سامنا کریں گے، اپنی منزل نہیں پا سکیں گے۔

لہٰذا، ایک ایسا معاشرہ جس کا انتظام و انصرام طاغوت کے ہاتھ میں ہو، وہ اس گاڑی کی مانند ہے جسے ایک غیر امین ڈرائیور چلا رہا ہو، اس معاشرے میں زندگی بسر کرنے والے انسان اپنے مقصد اور اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے اور مسلمان نہیں رہ سکیں گے۔

اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ ان حالات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اس سوال کا جواب قرآن کریم کی آیت دیتے ہوئے کہتی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾[1]

قرآن کریم فرماتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ پر، اپنے مستقبل پر اور اپنی ہر چیز پر ظلم کیا ہے، جب ان کی موت قریب آتی ہے، تو ان کی روح قبض کرنے پر مامور خدا کے فرشتے ان سے پوچھتے ہیں:! ﴿فِيمَ كُنتُمْ﴾۔ تم کس حال میں تھے؟ کہاں تھے؟

وہ جواب میں کہتے ہیں:

﴿قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ﴾ ہم زمین پر جن لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر رہے تھے، ان میں مستضعف تھے، ہم بے اختیار عوام میں سے تھے۔

مستضعفین معاشرے کا وہ گروہ ہوتے ہیں جن کے اختیار میں معاشرہ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ مجبور و لاچار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ معاشرے کی پالیسیوں، اس کی راہ و روش، اس کی سمت و جہت، اس کی حرکت، اس کے سکون اور اس کی سرگرمیوں کے سلسلے میں کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ زمین پر مستضعف لوگ وہ ہیں جنہیں ایک معاشرے میں رہنے کے باوجود اس معاشرے کے حالات کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۹۷۔ وہ لوگ جو اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہوتے ہیں، جب فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہیں، تو ان سے پوچھتے ہیں تم کس حال میں مبتلا تھے؟ وہ کہتے ہیں ہم زمین میں لاچار بنا دیے گئے تھے۔ فرشتے کہتے ہیں: کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ پس ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین منزل ہے۔

البتہ یہ بات ان معاشروں سے متعلق ہے جو صحیح نظام پر نہیں چلائے جاتے، اور انسان کے لیے کسی حیثیت اور قدر و قیمت کے قائل نہیں ہوتے، ان معاشروں سے متعلق نہیں جو انسان اور انسان کی رائے کی عزت اور احترام کے قائل ہیں، اس معاشرے سے تعلق نہیں رکھتی جس کے قائد پیغمبرؐ ہیں، جن سے قرآن کریم کہتا ہے: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾[1] اس کے باوجود کہ آپ خدا کے رسول ہیں، اس کے باوجود کہ آپ کو لوگوں سے مشورے کی ضرورت نہیں، پھر بھی آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ لوگوں سے مشورہ کریں اور انہیں عزت و احترام دیں، انہیں حیثیت دیں۔ ایسے معاشروں کے عوام لاعلم اور بے شعور نہیں ہوتے۔ تاہم وہ معاشرے جو آمرانہ، ظالمانہ یا جاہلانہ نظام پر چلائے جاتے ہیں، وہاں کے اکثر لوگ مستضعف ہوتے ہیں۔

ان کے جواب میں ملائکہ کہتے ہیں: ﴿أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا﴾

کیا پروردگار کی زمین یہیں تک محدود تھی؟ کیا پوری دنیا صرف اسی معاشرے تک محدود تھی جس میں تم مستضعف بن کر زندگی بسر کر رہے تھے؟

کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی، کہ تم اس قید خانے سے نکل کر ایک آزاد خطۂ ارضی میں چلے جاتے، جہاں تم خدا کی عبادت کر سکتے، ایک ایسی سرزمین پر جہاں تم اپنی صلاحیتوں کا استعمال صحیح راستے پر کر سکتے۔ ایسا خطہ کہ جس میں تم مستضعف نہ رہتے۔ کیا دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی؟

﴿قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا﴾ کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔

اب ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے، وہ بیچارے کیا کہیں، واضح ہے ان کے پاس اس کا کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ لہٰذا قرآن کریم ان بیچاروں کے انجام کے بارے میں کہتا ہے: ﴿فَأُولَـٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾ وہ مستضعفین جن کی قوتیں اور صلاحیتیں طاغوتوں کے ہاتھ میں تھیں، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ انسان کے لیے کیسا برا ٹھکانہ اور انجام ہے۔

البتہ یہاں بھی ایک استثنا پایا جاتا ہے کہ سب کے سب لوگ ہجرت نہیں کر سکتے، تمام لوگ اپنے آپ کو جاہلی نظام کی اس قید سے نجات نہیں دلا سکتے۔ کچھ لوگ ناتواں ہوتے ہیں، کچھ بوڑھے ہوتے ہیں،

---

۱. سورہ مبارکہ آل عمران: آیت ۱۵۹

کچھ بچے ہوتے ہیں، کچھ عورتیں ہوتی ہیں، جن کے لیے ہجرت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ لٰہذا یہ لوگ مستثنا کیے جاتے ہیں۔

﴿إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا﴾[۱] سوائے ان ضعیف و ناتواں مردوں، عورتوں اور بچوں کے جن کے پاس کوئی چارہ نہیں اور جن سے کچھ نہیں بن پڑتا۔ ان کے پاس خطۂ نور، خطۂ اسلام اور خدا کی عبودیت کی سرزمین کی جانب آنے کی کوئی راہ نہیں اور وہ کچھ نہیں کر سکتے۔

﴿فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ﴾[۲] پس وہ لوگ جو کچھ نہیں کر سکتے، امید ہے خداوندِ متعال انہیں معاف کر دے، ﴿وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا﴾ اور خدا درگزر اور مغفرت کرنے والا ہے۔

اس کے بعد وہ لوگ جنہیں ہجرت کا کہا گیا ہے، یہ نہ سمجھیں اور ان کے ذہن میں یہ خیال نہ آئے کہ ہجرت ان کے لیے بدبختی، ضرر اور نقصان کا باعث ہوگی اور وہ بار بار اپنے آپ سے یہ نہ پوچھیں کہ مثلاً ہمارا کیا بنے گا؟ کیا ہم کچھ کر بھی سکیں گے یا نہیں؟ کیا کچھ حاصل بھی ہوگا یا نہیں؟

ایسے لوگوں کے جواب میں قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً﴾[۳] اور جو بھی راہ خدا میں ہجرت اختیار کرتا ہے، وہ زمین میں بہت سے ٹھکانے اور وسعت پاتا ہے۔

اب اگر تم نے راہِ خدا میں دار الکفر سے دار الہجرہ کی جانب حرکت کی اور راستے کے دوران خدا نے تمہاری جان لے لی، تب کیا ہوگا؟

کہتے ہیں: اس وقت تمہارا اجر و پاداش خدا کے ذمے ہے۔ کیونکہ تم نے اپنا کام کر دیا، جو تم پر واجب تھا اسے انجام دے دیا اور تم نے حتی الامکان کوشش اور جدوجہد کی۔

اسلام یہی چاہتا ہے، اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان اپنی توانائی کے مطابق، جتنی وہ صلاحیت رکھتا ہے اور جتنی اس کی استطاعت ہے راہ خدا میں اتنی جدوجہد کرے۔

﴿وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۹۸

۲. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۹۹

۳. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۱۰۰

يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللهِ وَكَانَ اللهُ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾[۱]

اس نکتے کی طرف توجہ کریں کہ ہجرت دارُالکفر سے، غیرِ خدا کی ولایت سے، شیطان اور طاغوت کی ولایت سے؛ دارُالہجرہ، دارُالایمان، ولایتِ الٰہی کے زیرِ فرمان، ولایتِ امام کے زیرِ فرمان، ولایتِ پیغمبر اور ولایتِ ولیِ الٰہی کے زیرِ فرمان سرزمین کی جانب ہوتی ہے۔ لیکن دنیا میں اگر ایسا کوئی خطۂ ارضی موجود نہ ہو تو کیا کیا جانا چاہیے؟ کیا دارالکفر ہی میں پڑے رہنا چاہیے؟ یا ایک دارالہجرہ ایجاد کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے؟

خود پیغمبر اسلامؐ نے بھی ہجرت کی، لیکن پیغمبرؐ کے ہجرت کرنے سے پہلے تقریباً دارالہجرہ موجود نہیں تھا، آپ نے اپنی ہجرت کے ذریعے ایک دارالہجرہ ایجاد کیا۔

کبھی کبھی یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ لوگوں کا ایک گروہ اپنی ہجرت کے ذریعے دارالایمان کی بنیاد رکھے، ایک الٰہی اور اسلامی معاشرہ بنائے اور پھر مومنین وہاں ہجرت کریں۔ یہ ہے ہجرت کے موضوع پر ہماری گفتگو کا ماحصل۔

---

۱. سورہ مبارکہ نساء: آیت ۱۰۰۔ اور جو کوئی خدا اور رسول کی جانب ہجرت کے ارادے سے اپنے گھر سے نکلے اور راستے میں اسے موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

آیات کی فہرست

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

اکثر اوقات نوجوانوں اور جوانوں کو یہ شکوہ کرتے پایا کہ عقائد صرف ذہنی بحثیں ہیں: ان عقائد کا ہماری دنیا اور ہمارے عمل سے کیا تعلق ہے؟ اگر ایک آدمی باایمان ہو اور دوسرا ایمان نہ رکھتا ہو تو دونوں کے عمل میں کیا فرق ہوگا؟ کیا توحید یہی ہے کہ ہم ایک عقیدہ ذہن میں رکھ لیں کہ اللہ ایک ہے اور اسی نے اس دنیا کو خلق کیا ہے اور ہمیں اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرنی چاہیے؟ کیا نبوت یہی ہے کہ ہم مان لیں کہ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاؑ بھیجے، جن میں سے پہلے حضرت آدمؑ اور آخری حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ ہیں اور ان کا کام فقط اللہ کا پیغام پہنچانا تھا اور بس؟ کیا ولایت اسی کا نام ہے کہ ہم اہلبیتؑ سے محبت کا دَم بھرتے رہیں، زبان سے ان کی محبت کے دعوے کریں اور ان کے دشمنوں پر لعنت کریں اور پھر سب کچھ بھول بھال کر اپنی دنیا میں مگن ہو جائیں؟ کیا ان عقائد سے ہمارے اوپر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی؟